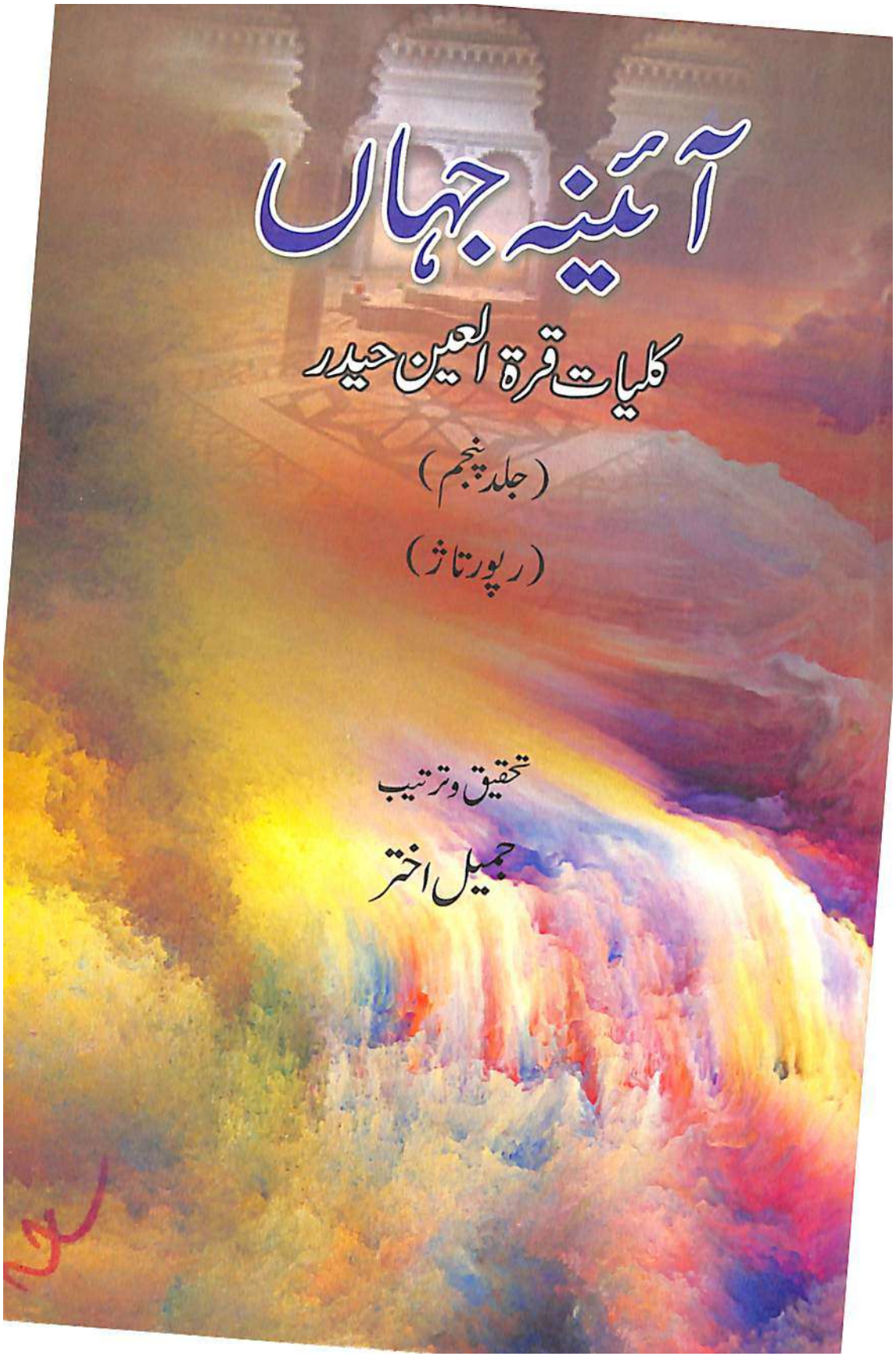
آئینہ جہاں
کلیات قرۃ العین حیدر
(جلد پنجم)
(رپورتاژ)
تحقیق و ترتیب
جمیل اختر

آئینہ جہاں

کلیات قرۃ العین حیدر

(جلد ہفتم)

(مضامین)

تحقیق و ترتیب

جمیل اختر

آئینۂ جہاں

کلیات قرۃ العین حیدر

(مضامین)

(جلد ہفتم)

تحقیق و ترتیب

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/165 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1891

Aaina-e-Jahan

Kulliyat-e- Quratulain Haidar Vol. 7

By: Jameel Akhtar

ISBN :978-93-5160-125-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 28108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔ 110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قوی کو نسل

برائے فروغ اردو زبان، کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

- مقدمہ ix

آئینہ خانے میں

آپ بیتی 1

قرۃ العین حیدر (ابن سعید) 17

فٹ نوٹ 25

آئینہ خانے میں 31

تحقیق

خانم جان کا سفر 39

خانم جان کی توبہ 47

تنقید

آزادی کی چھاؤں میں 81

مصنف کے مسائل 89

مایابازار 93

تاریخ و تشکیل

داستان عہد گل 125

تخلیق کی جمہوریت 177

فکشن

کیا موجودہ ادب رو بہ تنزل ہے (افسانہ) 191

اردو ناول کا مستقبل 219

تنازعہ چاندنی بیگم

چاندنی بیگم کی واپسی 229

طوطا کی کہانی 255

مصوری

آرٹ کی کہانی 271

شعریات

جمیل الدین عالی کے دو ہے 289
ن.م.راشد 293

ادب اور خواتین (لیڈیز کمپارٹمنٹ)

ادب اور خواتین 299
بیا تا گل برافشانیم (مرتبہ) 311
ہندستان کی مسلمان عورتیں 343

مذہبیات

اسلام دوسروں کی نظر میں 357

مقدمہ

قرۃ العین حیدر کی کلیات سازی کا کام میں نے ان کی اجازت سے ان کی حیات میں ہی شروع کر دیا تھا۔ افسانوں اور ناولٹ پر مشتمل تین جلدیں اور ایک نیا افسانوی مجموعہ 'قندیل چمن' ان کی حیات میں ہی شایع ہو چکا تھا لیکن یعنی آپا اس کی خوشی نہ دیکھ سکیں کتاب شایع ہونے کے فوراً بعد خرابی صحت کی وجہ سے داخل اسپتال ہوئیں اور پھر جاں بر نہ ہو سکیں اور اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد بھی میں اپنے کام سے کبھی غافل نہیں رہا۔ بلکہ اپنے محدود وسائل میں رہ کر کام کرتا رہا۔ اس لیے کہ کوئی ادارہ پروجیکٹ مکمل ہونے پر کتاب تو شایع کر دیتا ہے لیکن بنیادی مآخذ کی تلاش و جستجو کے لیے جو اصراف خطیر ہوتا ہے اس کا بار اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ اردو ادب کی افسوس ناک صورت حال ہے۔ ایسی صورت میں کسی فرد واحد کے محدود وسائل سے کوئی بڑی امید کرنا بعض وقت مایوسی کا سبب ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی فرد واحد انجمن اور ادارے سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے اور اس کا یہی نادر کارنامہ فرد کی انفرادیت کو ادب کے افق پر اجاگر کر کے اس کی الگ شناخت کا باعث ہوتا ہے اور ادبی تاریخ ایسے منفرد جیالوں سے جگمگا رہی ہے۔ ورنہ اردو ادب کی دگرگوں صورت حال میں اس کی ساری وراثت تہہ و بالا ہو جاتی اور سارا سرمایہ تہہ تیغ ہو جاتا۔ لیکن

ادبی ذوق وشوق رکھنے والے افراد نے بے سروسامانی کے عالم میں ایسے محیرالعقول کارنامے انجام دیے جس کی نظیر کسی اور زبان کے ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ بار بار مغرب کا حوالہ دینے اور مغرب کی نقالی سے اردو ادب کی اصناف کو مالا مال کرنے والوں نے مغرب کی طرز فکر اور ان کے طرز عمل کو تحقیق وتنقید کے لیے معیار کیوں نہیں بنایا جس سے اردو ادب کی پس ماندگی کو دور کیا جاسکتا اور اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تحقیق وتنقید کے لیے فضا سازگار ہوتی۔ گفت وشنید کی حد سے آگے، عملی طور پر یہ معاملہ کبھی جا بھی سکے گا؟ شاید کبھی ایسا ہوا تو وہ اردو ادب کی خوش حالی کا دن ہوگا۔

قرۃ العین حیدر کی وفات کے بعد ان کی کلیات کو مکمل کرنے کا کام چیلنج سے بھرا ہوا ہے۔ عمر بھر اپنی اور ہندستانی وراثت کے بکھرے ہوئے باب کو مجتمع کرنے والی خاتون کی اپنی وراثت کی محافظت خطرے میں ہے۔ اس بے بسی پر ادب کی رکھوالی کرنے والے ادارے وافراد کیا اپنی آنکھیں خشک کرلیں گے۔ چھوڑی ہوئی دولت پر دعویٰ کرنے والے تو پچاسوں رشتہ دار جس کے نہیں بھی ہوں تو بھی نکل آتے ہیں، لیکن ادبی وراثت کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی۔ میں نے یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ قرۃ العین حیدر جن کے رشتے دار دنیا کے کئی براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں اور قرۃ العین حیدر کا ادبی سرمایہ بھی دنیا کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے، ہندستان اور پاکستان کی حد تک تو میں جانتا ہوں کہ کسی رشتہ دار میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس عظیم کام کو منصوبہ بند طریقے سے کرسکے۔ ہاں دنیاوی دولت پر قبضہ ان کی زندگی میں ہی ان کی خدمت کرنے والوں نے کرنا شروع کردیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد وہ تاریخی مکان جس میں مصنفہ نے آخری سانس لی تھی اور جسے انھوں نے اپنے پیسوں سے خریدا تھا، اسے فوراً ہی بیچ ڈالا۔ اس حادثے پر جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ انگلستان میں ادیبوں کے محفوظ مکان کا معائنہ کرنے والی خاتون کی اپنی ذاتی وراثت اتنی جلد بے نام ونمود ہو جائے گی، ایسا انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ آج ان کی روح اس واقعہ پر سخت تکلیف محسوس کر رہی ہوگی کہ جس بات کے لیے میں زندگی بھر لڑتی رہی، احتجاج کرتی رہی، آج وہی بات، وہی حادثہ، تاریخ کی وہی المناکی میرے ہی ساتھ پیش آئی۔ عبرت ناک... عبرت ناک... سردم دکھم دکھم...

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

قرۃ العین حیدر اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''بانو کے مکان کی تاریخی اہمیت کا مجھ کو بے حد احساس تھا۔ گزشتہ ادوار میں اسی مکان کے آس پاس ان زمانوں کے نامور شعراء کے مکانات بھی موجود تھے۔ وہ کیسا پرفسوں زمانہ رہا ہوگا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس کے اہل نظر نے اپنے عہد رفتہ کے مشاہیر کے مکانات کو اسی طرح سجا بنا کے رکھا ہے اور میں یہ رونا ہمیشہ روتی رہتی ہوں کہ مرزا غالب کے مکان میں کوئلے کی دکان کھل گئی۔''

اسی مضمون میں آگے چل کر اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''راجستھان کے دور اندیش چھوٹے بڑے راجاؤں نے اپنے محلات اور حویلیاں ٹورسٹ انڈسٹری میں شامل کر دی ہیں لیکن لکھنؤ کا قدیم تعمیراتی سرمایہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں پہلے بھی یہ نوحہ گری کر چکی ہوں کہ علی گڑھ کے وہ پھوس والے بنگلے جو جان کمپنی نے بنوائے تھے اور انگریزی سرکار نے کالج کے لیے سرسید کی نذر کر دیے تھے، ان کے موجودہ وارثوں کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ان کو نذر آتش کر دیا۔

لندن کے ایک میوزیم میں ایک بہت بڑا کمرہ سترہویں صدی کے ساز و سامان سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مکین ابھی ابھی اٹھ کر باہر گئے ہیں۔ یہ کمرا نشیب میں ہے اور اس پر چھت سے ذرا نیچے چاروں طرف گیلری ہے۔ تماشائی اس گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے اس کمرے کی ایک ایک چیز کو بغور دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح میں نے امریکہ کے ایک عجائب خانے میں گزشتہ کسی صدی کا کمرہ ایسا پایا جس میں ایک متوسط الحال خاندان کا Living Room کے طور پر سجایا گیا تھا جس میں آتش دان کے پاس دادی اماں کی آرام کرسی اور اس کے برابر میز پر ان کی عینک اور سینے پر دنے کی ٹوکری بھی موجود تھی۔ انگلستان اور یورپ میں گزشتہ صدیوں کے شاعروں اور ادیبوں کے مکان ان ہی کے ذاتی سامان یا اس کی ہو بہو نقل سے آراستہ

کیے گئے ہیں۔ میں یہ بھی لکھ چکی ہوں کہ روس میں پسکن کے گھوڑے کی ایال کو جس چوبی کنگھے سے سنوارا جاتا تھا وہ کنگھا بھی محفوظ ہے۔ جس زمانے میں ہمارے ترقی پسندوں نے ہر پرانی چیز کو منسوب کیا، اس وقت تک شاید ان میں سے کوئی بندہ روس نہیں گیا تھا۔

چنانچہ عزیز بانو کا مکان بھی لکھنؤ کے چند اور مکانات کی طرح National Heritage میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ میں تو ان کو ضرور یہ رائے دیتی مگر وہ خود ہی غائب ہو گئیں۔"

قرۃ العین حیدر کا مکان بھی نیشنل ہیریٹج میں شامل ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ تاریخ کی یہ دردناکی شاید انسان کا مقدر ہے۔ تاریخ کے بہاؤ اور وقت کی جبریت کا قہر جب سونامی کی صورت میں نازل ہوتا ہے تو سب کچھ تاخت و تاراج کر دیتا ہے اور انسان محض ایک بے بس تماشائی کی طرح حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی تو اس عبرت ناک منظر پر چند آنسو نکل بھی آتے ہیں اور کبھی استعجابی شدت سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کی اس بے بسی اور دردناکی کی گہرائیوں میں بار بار ڈوب کر حقیقت کا ادراک کرانے والی خاتون کو کیا پتہ تھا کہ صدیوں سے دہرائی جانے والی اس کہانی کا انجام اتنا دردناک ہوگا۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

آج قرۃ العین حیدر کی برسی پر چراغاں کرنے والے بھی نہیں رہے۔ عقیدت کے دو پھول چڑھانا تو دور کی بات ہے۔

مونس ہے بعد مرگ کسی کا جہاں میں کون
دو پھول بھی لحد پہ کوئی دھر نہ جائے گا

کیا قبرستان کا یہ سناٹا کبھی ادبی سرگوشیوں میں تبدیل ہو کر انھیں خراج عقیدت پیش کر سکے گا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل میر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

اردو ادب کی جلیل القدر اور عظیم المرتبت مصنفہ لحد میں ضرور خوابیدہ ہے لیکن ان کے چاہنے والے انھیں اتنی جلد فراموش کر دیں گے، اس کا گمان بھی نہ تھا۔ لیکن حقیقت اور سچائی بڑی جابر چیز ہے۔ جب سامنے آتی ہے تو بھرم تار تار کر دیتی ہے۔ آج وہ بھرم تار تار ہو گیا جو داستان طراز تھی۔ وہ خود داستانِ عہد گل ہو گئی۔ تاریخی بصیرت کا رفیع الشان احساس دلانے والی تخلیقی ہستی کا اس طرح ناپید ہونا دوسروں کے لیے زبردست عبرت کا مقام ہے۔ کیا وقت اس حیرت و استعجاب کو کم کر سکے گا؟ ہمیں اس لمحے کا انتظار رہے گا۔

آج قرۃ العین حیدر دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس تاریخی قبرستان میں جہاں انھوں نے علم و ادب کی عظیم المرتبت ہستیوں، دانشوران ملت اور بانیان جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درسیان پناہ لی ہے، سے باہم مشاورت ضرور کر رہی ہوں گی کہ آخر یہ ستم ظریفی ہماری قوم میں ہی کیوں ہے۔ تاریخی حافل کی عظیم المرتبت ہستیوں کے درمیان رہ کر بھی اس قدر بے بسی کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ یہ قوم اپنے لعل و گہر کی عظمت کو کب پہچانے گی؟ کب انھیں عزت و توقیر ملے گی؟ میں تو یہاں اس لیے آئی تھی کہ ان لوگوں کے درمیان میں کبھی فراموش نہیں کی جاؤں گی۔ میں نے اپنا سارا ادبی سرمایہ اس دانش گاہ کو اس لیے بخش دیا تھا کہ کم از کم ہر برس یہ لوگ میری لحد پر عقیدت کے دو پھول ہی ڈال کر میری عزت افزائی کریں گے۔ لیکن یہ تو میرا میوزیم (آرکائیو) بنا کر بیٹھ گئے۔ میرے نام کا گیٹ بھی وہاں بنایا جہاں علم و ادب کی ہستیوں کا گزر ہی نہ ہو۔ بھلا اسٹیڈیم سے متصل گیٹ سے میرے نام کی کیا نسبت؟ دانش گاہ کا مین گیٹ جہاں غالب غزل سرا ہیں اگر میرے نام کا ہوتا تو شاید کچھ مناسبت بھی معلومات ہوتی کہ میں وہاں سے شعبۂ اردو پر بھی نظر رکھ سکتی اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں پر بھی، پھر تو میری روح بھی خوش ہوتی اور میری ہستی کا وجود اس طرح ریزہ ریزہ نہیں ہوتا۔

تاریخی بصیرت کی حامل ہستیوں کا یہ حشر عبرت ناک ہے۔ غالب کی حویلی کی باریابی کے لیے صدیوں تک تحریک چلی پھر حکومت نے موقع پرستی کی سیاست سے فائدہ اٹھانے کے لیے واگذاری کی بھی، وہاں تو معاملہ غاصبانہ قبضے کا تھا اس لیے واگذاری ہو گئی۔ یہاں تو مکان

فروخت کر دیا گیا ہے جس کی واگذاری ممکن ہی نہیں۔ تاریخ کی بوالعجبیاں بھی عجیب وغریب ہیں۔ عظمت رفتہ پر تاسف کرنے اور آنسو بہانے والی ادبیہ ڈھائی ہزار سالہ ہندستانی تاریخ کے وقوع کو کھنگالنے کے بعد کف افسوس ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تو میرا ماضی، میرا عظیم الشان ماضی، میری عظیم الشان روایات کی یاد کر کے اس پر آنسو بہا کر دل کو مطمئن کر لیا۔ یہاں تو ماضی کی عظیم الشان روایات سے حال کا عظیم الشان رشتہ باقی رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن زر پرستی کی حوس میں، ہندستانی تہذیب وثقافت کی بقاو تحفظ کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کے صلے میں انھیں انعام بھی کیا دیا کسی دوسرے نے نہیں خود ان کے اپنوں نے جو ان کے جذبات اور ان کی عظیم الشان تخلیقی وراثت کی قدر و قیمت کو پہچان نہ سکے جو کل تک ہماری عظمتوں کی پہچان تھے اور جس پر انعام واکرام کی بارش ہو رہی تھی اور آج خود ان کے اپنوں نے ان کی وراثت کی پامالی کر کے ان کی عظمتوں کو داغ دار کر دیا ہے۔ اب تو لعنتوں کی بارش ہوگی، مگر کس پر۔ یہ وہ مقام عبرت ہے جس سے ہر کسی کو سبق لینا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر پر میں جب بھی قلم اٹھاتا ہوں تو زندگی کے ان کے مشن کے تحت میں بے حد جذباتی ہو جاتا ہوں۔ اور میں قطعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کی عظمت کو خواہ اس کا اپنا ہی کیوں نہ ہو داغ دار کرے۔ دنیا ان کو عزت کے منڈولے میں بٹھانا چاہتی ہے اور اپنے ہیں کہ قدر کرنا ہی نہیں جانتے۔ ہاں تو بات کلیات سازی کی چل رہی تھی اور موضوع بہک کر کہاں سے کہاں چلا گیا۔ سوال وراثت کی حفاظت کا تھا۔ میں نے اپنے ناتواں کندھوں پر اس بار گراں کو اٹھا تو لیا ہے لیکن کیا وسائل کے بغیر کئی ملکوں میں بکھری ان کی تحریری وراثت کو مکمل طور پر سمیٹنا ممکن بھی ہو سکے گا۔ میرے خیال میں اس کا سیدھا سچا جواب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ زندگی میں کسی پر اتنا اعتماد آپا نے نہیں کیا جتنا مجھ پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کلیات کی تدوین جیسے مشکل کام کے لیے خود سے میرا انتخاب کیا اور میں نے ان کی زندگی میں اس اعتماد کو وقار بھی عطا کیا۔ اور کلیات کی تین جلدیں سجا سنوار کے انھیں پیش بھی کر دیں۔ اب سوال آگے کا ہے۔ مجھے اکثر ایسا لگتا ہے کہ وہ مختلف صورتوں میں اپنی تحریروں میں جلوہ گر ہو کر مجھ سے

سوال کرتی ہیں کہ باقی بچا کام کب ہوگا؟ بس یہی بات مجھے کچوکے لگاتی ہے۔ میں نے آپا سے وعدہ کرلیا ہے کہ مجھ سے جہاں تک بن پڑے گا میں اس کام کو ضرور انجام دوں گا۔

ان کے انتقال کو آٹھ سال بیت گئے۔ اس بیچ میں تنکا تنکا جمع کرتا رہا۔ اب جا کر اتنا کچھ جمع ہو سکا کہ آپا کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ شاید میری یہ کاوش علم وادب کے قدر دانوں میں ان کا اعتماد مضبوط کر سکے گی۔ یہ کوشش فرد واحد کی ضرور ہے لیکن یہ کام انسان کو ایک انجمن، ایک ادارہ بنا دیتا ہے۔ خدا کرے میری یہ سعی جمیلہ انھیں شہرت دوام عطا کر سکے اور علم وادب کے سرمایۂ افتخار میں بیش قیمت اضافہ ثابت ہو۔

کلیات کی پہلی چار جلدیں افسانے، ناولٹ اور ایک نیا افسانوی مجموعہ قندیل چین پر محیط ہیں۔ اب کلیات کی پانچویں جلد سے تقسیم کچھ اس طرح ہے۔

Vol. - 5 : رپورتاژ	Vol. - 9 : خاکے
Vol. - 6 : رپورتاژ	Vol. - 10 : انٹرویوز
Vol. - 7 : مضامین	Vol. - 11 : انٹرویوز
Vol. - 8 : مضامین	

اس کے علاوہ ان کے تراجم، بچوں کی کہانیاں، صحافتی مضامین، فلم ریویو، کتابوں پر تبصرے، خطوط اور دیگر دوسری چیزیں۔ یہ سب قصہ اگلے پڑاؤ کا ہے۔ سلسلہ تلاش وجستجو جاری ہے۔ تحقیق اپنی منزل طے کر رہی ہے۔ فی الوقت درج بالا سات جلدیں پیش خدمت ہیں۔

جلد 7 اور 8 مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان مضامین میں اول مضمون سے لے کر اب تک کے تقریباً تمام مضامین شامل ہیں جو میری تحقیق میں دستیاب ہو سکے ہیں۔ اور جس کو پہلی بار اس ترتیب کے ساتھ یکجا کیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل بھی اس سرمایے کو یکجا کرنے کی کوشش دو بار کی گئی لیکن مکمل سرمایے کی یکجائی ممکن نہیں ہو سکی۔ وجہ فرد واحد کے محدود وسائل، دوسرے تحقیقی مہم جوئی کی کمی۔ کسی کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ افسانوی نثر کی ملکہ کے غیر افسانوی نثر کا دفتر اس قدر پھیلا ہوا اور وسیع ہوگا اور اس میں تراجم کے علاوہ شخصی خاکے، تعارفی تحریریں، مذاکرے، مباحثے، تبصرے،

تقریریں، تعزیتی مضامین، تنقیدی مضامین اور دیگر بہت سی تحریریں جو پہلے سے موجود کسی زمرے میں آسانی سے نہیں رکھی جاسکتیں۔ اور نہ ہی ان تحریروں کو آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ فکشن کی ملکہ کا یہ سرمایہ اپنی جگہ اتنا ہی اہم ہے۔ یہ ادبی وراثت اپنی ادبی اہمیت رکھتی ہے اور قرۃ العین حیدر کے ادبی سفر کی داستان میں یہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے مصنفہ کا تخلیقی وژن اور ان کے فکری میلانات کے نشیب و فراز کی منزلوں کا اندازہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے فنی رویے کو بھی سمجھنے میں مدد ملے گی۔

یہ تمام مضامین مختلف حالات و کیفیات میں وقتی مطالبے و تقاضے کے تحت لکھے گئے ہیں جو مختلف النوع موضوعات پر ہیں۔ غیر افسانوی نثر کا یہ سرمایہ بھی کافی وقیع ہے۔ جو اس تخلیقی فن کارہ کے وسعت ذہنی کا پتہ دیتے ہیں۔ اپنے پورے ادبی سفر کے دوران ان کی نظر کن کن موضوعات پر رہی، فکشن کے علاوہ ان کی دلچسپی کے میدان اور کیا کیا تھے۔ تخلیقی بصیرت کے افق کو اونچائیوں سے ہم کنار کرنے والی ادیبہ نے اپنے تنقیدی شعور کا احساس اپنے قاری کو کس طرح کرایا۔ سوچ کر حیرانی ہوتی ہے۔ باضابطہ ناقد نہیں ہونے کا بار بار اعلان کرنے والی مصنفہ نے نقادوں کی زبان گنگ کردی۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا، حق ادا کردیا۔ تخلیقی عمل میں کارفرما تنقیدی شعور نے یہ ثابت کردیا کہ ایک فن کار ایک بہتر ناقد بھی ہوتا ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون 'اسلام دوسروں کی نظر میں' ہے۔ یہ مضمون 1942 میں لکھا گیا۔ اس وقت قرۃ العین حیدر تقریباً پندرہ برس کی تھیں۔ اور یہ مضمون بنات میں شائع ہوا تھا۔ عنوان مضمون ہی 'در فکر سے گوندھ لڑیاں گئی' کے مصداق ہے۔ یہ عمر اور یہ فکر گہر آب دار کیا کہنا۔ بہت سے لوگ معترض بھی ہوں گے کہ یہ تجزیاتی عنوان اور یہ بالغ فکر اور یہ عمر۔ تعجب خیز نہیں۔ آپ شاید بھول گئے کہ 'برس تیرہ یا کہ ہو چودہ کا سن' Syndrome تو ہمارے یہاں ہمیشہ سے رائج ہے۔ پھر یہ قصہ تو خاندانی روایات سے جڑا ہوا ہے۔ خود ان کی والدہ نذر سجاد حیدر نے اختر النسا 'ناول' یہ عمر چودہ سال لکھا تھا۔ ان کی دوست حجاب امتیاز علی نے اپنا افسانہ 'میری ناتمام محبت' گیارہ برس کی عمر میں تصنیف کیا تھا۔ 'معشوق چہاردہ سالہ' ہماری ادبی روایت کی ایک ادا ہے۔ اور

پھر یہ کہ رحم اللہ کے ایسے تیز و طرار اور Precocious بچے بھی مجموعہ روزگار نہیں۔ بالخصوص ایسے طبقے میں جہاں ان کی تربیت ہی ایسے ماحول میں ہو رہی ہو جہاں علم و ادب کے فیضان ہر چہار سو جاری و ساری ہوں۔ تخلیق کے سوتے روایات کے بطن سے جب پھوٹیں گے تو پھر بصیرت و بصارت سے مملو تخلیقی وژن کا بھرپور احساس ہونا فطری ہے۔

قرۃ العین حیدر کے یہ تمام مضامین تنقیدی شعور سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ سماجی تجزیوں اور ادبی تبصروں میں جو گہرائی ہے وہ ان کے مختلف علوم کے وسیع تر مطالعے کے غماز ہیں۔ کوئی بھی مضمون کسی بندھے ٹکے نظریے یا ضابطے یا فکری رویے سے اثر پذیری کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتے بلکہ ایک نئے تناظر میں دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش کا پیش خیمہ لگتے ہیں۔ ان کے نقطہ نظر یا اپروچ میں تنگ نظری کے بجائے تنوع ہے۔ یہ مضامین رواروی میں نہیں پڑھے جا سکتے بلکہ سنجیدہ مطالعہ کے متقاضی ہیں۔

قرۃ العین حیدر لاکھ بریت کا اعلان کریں کہ صاحبان اردو تنقید میرا میدان نہیں۔ لیکن وہ ان تمام مضامین میں معصومانہ طور پر تنقیدی منصب کو ادا کرتی نظر آتی ہیں۔ چونکہ یہ تمام مضامین ایک طویل مدت کے دوران لکھے گئے ہیں لہٰذا ذہنی ارتقا اور تبدیلی فکر یا فن کار کے بدلتے زاویۂ نگاہ کے مختلف موڑ اور پڑاؤ کے نشیب و فراز کے فطری عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اردو تنقید کے اسٹیریوٹائپ کو چیلنج کیا ہے۔ جس پر روایتی، مکتبی نقاد لاکھ ناک بھوں چڑھائیں لیکن ان مضامین کو جو منفرد تنقیدی بصیرت کے حامل ہیں، ادبی تنقید کے خانہ سے خارج کر پائیں گے؟ میرا خیال ہے شاید کبھی نہیں بلکہ تنقیدی سرمایے کا بیش بہا اثاثہ ضرور تصور کیا جائے گا۔

غیر افسانوی نثر کا یہ خزانہ اپنی مقدار و کیت و حجم کے لحاظ سے بہت زیادہ بھلے ہی نہ معلوم ہو لیکن اپنے اسلوب، انداز بیان، ندرت فکر، وسعت خیال اور موضوع سے اچھوتے برتاؤ کی وجہ سے تنقیدی توریت کا درجہ رکھتے ہیں۔

قرۃ العین کی ان بکھری ہوئی تحریروں کو مجتمع کرنے میں بہت سے افراد اور اداروں نے میری معاونت کی ہے جن کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر

نجیب اختر، برادر عزیز کفیل اختر، ڈاکٹر ارشد رضا بھاگلپور، عزیزی جاوید اختر، بزرگ محترم مہر الٰہی ندیم صاحب، برادر مکرم ڈاکٹر عطا خورشید، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر تحسین فراقی (لاہور)، ڈاکٹر آصف فرخی (کراچی)، صبا اکرام (کراچی)، علی حیدر ملک (کراچی)، پروفیسر مرزا حامد بیگ (لاہور)، پروفیسر غلام حسین ساجد (لاہور)، پروفیسر علی احمد فاطمی، چودھری ابن النصیر (ایڈیٹر 'پہچان')، شمع افروز زیدی (ایڈیٹر 'بیسویں صدی')، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں (رام پور) کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ تحقیق کے مشکل مرحلے میں ان تمام لوگوں کا پرخلوص تعاون مجھے ملتا رہے ہے تبھی تنکا تنکا جمع ہو سکا، اور جو رہ گیا ہے وہ بھی انشاءاللہ حاصل ہو جائے گا۔

اداروں میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، انصاری لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرۃ العین حیدر آرکائیو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افراد کا بھی شکریہ لازم ہے جن کی پرخلوص معاونت نے تحقیق کے مرحلے کو آسان بنا دیا فرداً فرداً سب کا نام گنوانا ممکن نہیں۔ لیکن ان کے کرم خاص کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

قومی اردو کونسل کا شکریہ بھی ضروری ہے اس لیے کہ ان کے تعاون کے بغیر کلیات کی طباعت کا خواب ادھورا رہتا۔ لہٰذا میں قومی کونسل کے تمام افراد کا جنھوں نے کلیات کی طباعت و اشاعت کے کسی بھی مرحلے میں مدد کی میں فرداً فرداً سبھوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب آخری شکریہ نوجوان دوست تنویر احمد کا جن کی محنت شاقہ سے کلیات کمپوزنگ کے دشوار گزار مرحلے سے گزر کر مکمل ہوئی اور طباعت تک پہنچی۔

بیوی اور بچوں کا شکریہ کیا ادا کروں، ان کی حق تلفی کا مجھے شدید احساس ہے لیکن ملول خاطر نہیں ہوتے۔

جنوری 2015
نئی دہلی

جمیل اختر
موبائل: 9818318512
ای میل: jameelakhtar786@yahoo.com

آپ بیتی

''.....رشک مجھے صرف دو طرح کی خواتین وحضرات پر آتا ہے، ایک بھرت نائیم ڈانسرز۔ دوسرے وہ لوگ جو آکسفورڈ یا کیمبرج میں رہ کر علمی کام کرتے ہیں۔ اگر میں ایک مسلم گھرانے پیدا نہ ہوتی اور ایسا مسلم گھرانہ جو موڈرن ہونے کے ساتھ ساتھ قدامت پرست بھی تھا تو میں نے یقیناً بھرت نائیم میں مہارت حاصل کی ہوتی.....اور اگر مجھ میں DRIFT کرنے کی عادت اور سستی نہ ہوتی تو میں یقیناً اوکس برج میں مستقل قیام کرتی.....''۔

اہنکر لائن کا ایس این سائیکیا، انگلستان سے واپس آرہا تھا۔ ایک شام مغرب کے وقت میں عرشے پر ریلنگ سے ٹکی بحیرہ روم کی لہروں کو ملاحظہ کر رہی تھی۔ جب اماں نماز پڑھ کر اپنے اسٹیٹ روم سے برآمد ہوئیں اور قریب آکر بیٹھ گئیں۔ اور چند منٹ خاموش رہنے کے بعد کہا ''اللہ سے دعا مانگو کہ وہ تم کو عقل دے''۔ سارے بہی خواہ میرے لیے ہمیشہ سے یہی دعا مانگتے آئے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے آج تک نہ سنا۔ اس نے سب کچھ دیا بلا دنیاوی اور مالی معاملات کی سوجھ بوجھ، ہوشیاری اور کومن سنس کے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو دنیاداری کی عقل سے مالا مال ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ جیرالڈ، مینلے، ہوکلنز، یا دبیریا میتس سے ناواقف ہیں۔

مثال کے طور پر آپ بیتی لکھنے کا معاملہ۔ آتم کتھا ظاہر ہے اپنی پیدائش سے شروع کی جاتی ہے اور چند سطور یا پیراگراف یا صفحات خاندان کے متعلق۔ میں نے اس کے لیے تیرہ سو سال کھنگالے اور اس سے بھی قبل ابراہیمؑ اور باب اجتہاد تک۔ کیونکہ مجھے تاریخ سے از حد دلچسپی ہے۔ اور میں اپنے عرب عبرانی ایرانی تورانی اور ہندستانی ورثے کو آپ بیتی میں شامل اور اس کا ایک لازم حصہ سمجھتی ہوں۔ نیگرو مصنف کی کتاب ROOTS نے ان دنوں مغرب میں دھوم مچا رکھی ہے ناچیز نے ''کارِ جہاں دراز ہے'' (جلد اوّل) اس سے بہت پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی قبل جب والد کا انتقال ہوا۔ اس کے تیسرے چوتھے دن سے بیٹھ کر میں نے بچپن کی کہانی لکھنی شروع کی کیونکہ اس وقت مجھے شدت سے یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ اسے ریکارڈ کر لینا ضروری ہے (وہ کہانی تلف ہو چکی ہے) والدہ کو بھی آپ بیتی لکھنے کا عارضہ لاحق تھا۔ انھوں نے 1908 سے روزنامچہ لکھا جو برسوں تہذیبِ نسواں اور عصمت میں چھپا۔ پھوپھی زاد بہن فاطمہ خاتون مستقل کنبے کی اور اپنی زندگی کے متعلق عصمت میں لکھا کرتی ہیں۔ چچی وحیدہ (بیگم نصیر الدین حیدر) اپنی شادی سے قبل 1911 کے نہٹور میں اپنا روزنامچہ لکھتی تھیں جو عصمت میں چھپتا تھا۔ ثابت یہ ہوا کہ انسان بہت سی باتیں ہیں جن کے متعلق سوچتا ہے کہ ان کو قلم بند کرنا ضروری ہے۔ شعر کی صورت میں بہ طور جگ بیتی یا آپ بیتی۔ یا بہ طور ذاتی فلسفہ۔ شاید 1955 میں اسد اللہ شاہ بخاری نے نیویارک سے لکھا کہ میں ادیبوں کے اپنے فلسفہ حیات پر ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں۔ ''زندگی نے مجھے کیا سکھایا'' وغیرہ) تم بھی اپنا فلسفۂ زندگی بھیجو۔ میں نے جواب دیا بخاری صاحب ''آنسوؤں کی وادی'' میں ابھی اتنا وقت نہیں گزرا کہ کوئی باضابطہ فلسفہ حیات مرتب کر سکوں یا فیصلے صادر کروں۔ ممکن ہے آج پندرہ بیس سال بعد کچھ بات بنے۔ تو آج 1978 میں بھی معلوم ہوا کہ کوئی ذاتی فلسفہ مرتب ہو ہی نہیں سکتا۔ سب گھپلا ہے۔

نقوش نے شاید 1957 میں شخصیات نمبر شایع کیا تھا۔ اس کے لیے محمد طفیل نے کمانڈر حسن عسکری (ابن سعید) سے ناچیز پر مضمون لکھوایا اس مضمون پر میں نے فٹ نوٹ کا اضافہ کیا۔

چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''ہم بہت ذوق و شوق سے رسالہ شمع بھی پڑھتے ہیں جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہو کر ایک چنڈوخانہ بن جاتا ہے۔ ایک کمرے میں ایک بھانجی صاحبہ پیانو سے شغل فرما رہی ہیں۔ گیلری میں چوہے دوڑ بلی آئی کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھانجی صاحبہ ڈاکٹر ہیں اور ایئر فورس میں فلائٹ لفٹننٹ۔ مگر ان کا یہ عالم ہے دنیا بھر کی فضولیات خرافات سے انھیں سخت دلچسپی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا کیونکہ میں ان سب سے علاحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں۔ (انفرادیت وغیرہ ابن سعید نے جو عالمانہ الفاظ استعمال کیے ہیں وہ سب گپ ماری ہے) ایک روز ہم لوگ گھاس پر بیٹھے نہایت اطمینان سے شکرا کو کیدار میں منتقل کرنے میں مصروف تھے جب ایک بھائی نے اچانک یہ انکشاف کیا کہ ایک چیز اور ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہے ہیں شدید ذہانت اور شدید مزاحی حس۔ فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی ''خصوصیات'' بھی زیادہ لوگوں کے پلّے نہیں پڑتیں۔ اور اسی لیے وہ دوسرے لمحے گھاس پر سے اٹھ کر کینیڈا چلا گیا۔''

''اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس فٹ نوٹ کا اضافہ کرنے سے قبل یہ بھی عرض کر دوں کہ ہم لوگ برخود غلط نہیں ہیں۔ ہمارا جو معاشرہ ہے جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساس برتری کا شکار ہیں یا احساس کمتری میں مبتلا۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے COMPLEX میں گھرا ہوا ہے۔ میں ان لوگوں کو بہت قابل قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔ رہی ہماری شخصیت تو بھئی یہ تو ایک بڑا جید قسم

کا خوف ناک لفظ ہے۔ شخصیت مولینا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت
علی خان کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری شخصیت ——— یہ کیا مسخرہ پن ہے۔"

یہ آخری جملہ بہت مشہور ہو گیا تھا۔ اُس وقت ن۔م۔ راشد نے زندگی کے متعلق میرے رویّے کو "اسکول گرلش" (School Girlish) کہا تھا، تو سنس آف ہیومر کے ساتھ چیزوں کو ان کے صحیح مناظر میں دیکھنے کی بدولت SCHOOL MARMISH اپروچ تو میری آج تک نہ بن سکی۔ ایک انکشاف یہ بھی ہوا (ڈاکٹر جانسن کے ساری عمر نثر بولتے رہنے کی طرح) کہ لکھنے میں اتنی BLAA, BLAA اور عملی زندگی میں اکثر نہایت بے وقوف۔ دراصل میری ساری اپروچ ہر معاملے میں ذہنی اور جذباتی یعنی SENTIMENTAL EMOTIONAL ہرگز نہیں) پریکٹیکل بہت کم اور ہر چیز اور انسان حیرت انگیز ہیں اور دنیا کی ساری کہانی اور اس کا پھیلاؤ اور اس کا اختصار یعنی فنا۔ اور اس کی بقا۔ تو کیا آپ بیتی شروع کرنے کے لیے میں کوہ ارارات نہ جاؤں؟

لہٰذا میں اچھی چیزوں سے بے حد محظوظ ہوتی ہوں۔ ذرا سی خوشی بے انتہا ELATION اور ذرا سی فکر اور پریشانی بے حد ڈپریس کرتی ہے اور میں HUM BUG اور منافقت کو کبھی برداشت نہیں کر پائی۔ اور میں نے ملکوں ملکوں گھوم کر بہترین کتابیں جمع کیں اور ملکوں ملکوں انواع واقسام کے کام کیے جن کا تعلق MEDIA اور لکھنے سے تھا۔ کراچی اور لندن میں سرکاری افسر اور جرنلسٹ اور دستاویزی فلم بھی بنائے۔ یہ سب احوال "کارِ جہاں دراز ہے" جلد دوم میں تفصیل سے رقم کیا یہاں مختصراً دہرانا بوریت ہے۔

انگریزی اخباروں میں لکھنا کالج چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد سے شروع کیا۔ بہ فرمائش فیض صاحب سب سے پہلے "پاکستان" ٹائمز میں جارج برنارڈ شا کے انتقال پر اس استاد بزرگ کے متعلق مضمون لکھا۔ پروفیسر وقار عظیم نے اسے فوراً اردو میں ترجمہ کر کے شاید نقوش میں شائع کیا۔ اس کے بعد مزید مضامین اور نظمیں پاکستان ٹائمز میں، ڈیلی ٹیلی گراف لندن، ایسٹرن ورلڈ لندن، پاکستان کوارٹرلی کی ایک سال ادارت، پھر یہاں بمبئی میں تین سال امپرنٹ کی مینجنگ ایڈیٹر پھر ایک سال یکے از مدیران امپرنٹ (دوسرے دو مدیر نسیم ازیکل اور کورل چٹرجی مرحومہ)

1968 میں اس رسالے کو گوا کے ایک تیز طرار کاروباری نے خرید لیا جن کا نام آر ایس پنڈت تھا۔ انھوں نے کہا اس کا اداریہ میں لکھا کروں گا۔ میں نے کہا آپ سرمایہ دار ہیں۔ آپ نے ہی رسالہ خریدا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جرنلسٹ بھی ہیں۔ آپ اداریہ میں کیا لکھیں گے؟ تو پھر رسالہ بھی آپ ہی اڈیٹ کیجیے۔ اور اسی وقت استعفیٰ دے کر گھر آئی۔ پھر السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا آٹھ سال جس میں لکھتے ہوئے ناچیز کے مضامین اور فلم ریویو مقبول خواص وعوام ہوئے۔ پھر وہ مشہور واقعہ سنٹرل بورڈ آف فلم سنسرز کا تفصیل جلد سوم میں ملاحظہ کیجیے گا کہ اب اس کے تذکرے سے کوفت اور شدید بوریت ہوتی ہے۔ مگر اس کے سلسلے میں اور اس سے ذرا پہلے ان لوگوں نے زک دی جن کو میں نے بہ وجہ بے وقوفی اپنا دوست سمجھا تھا۔ خصوصاً جنرل صاحب کی سنسر بورڈ میں بحالی کے لیے دوران ایمرجنسی مارے شرافت کے میں نے دوڑ بھاگ اور کوشش کی تھی خود فی الفور انھوں نے ہی مجھے شدید نقصان پہنچایا۔ تب مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ MALE DOMINATED سوسائٹی میں ایک خاتون کو خواہ اس کی کتنی ہی کوالی فیکیشنز اور ٹیلنٹ ہو اس طرح کی صورت حال پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ یہ تو خیر پس ماندہ مشرق ہے۔ مغرب میں ویمنز لب کی تحریک بلاوجہ وجود میں نہیں آ گئی (جہاں تک عورتوں کی ذہنی اور اقتصادی آزادی اور حقوق اور ہمسری اور خودداری کا تعلق ہے میں ویمنز لب کے ساتھ ہوں مگر اس تحریک کی اخلاقی بے راہ روی کی مخالف اور اس سلسلے میں ہمیشہ کی مولوی) یا آپ ذہن پرست حلقوں میں سوڈ گیری (Pseud) کرتی پھریے بہت مقبولیت حاصل ہوگی اور کامیابی۔ پوچھیے یہ کون چیز ہے۔ عرض کرتی ہوں۔ السٹریٹیڈ ویکلی میں میری بے حد دلچسپ رفیق کار بچی کرکریا نے یہ اصطلاح ایجاد کی تھی۔ بروزن دادا گیری یعنی PSEUDO-INTELLECTUAL خواتین وحضرات کی سوڈ گیری۔ ہم دونوں نے اس لائف اسٹائل اور مدرسہ فکر پر کافی ریسرچ کی اور یہ بھی طے کیا تھا کہ ایک نہایت سوڈ گیری سے لبریز مضمون لکھیں گے یا ایک دوسرے کا انٹرویو اور اسے ویکلی میں چھاپیں گے اور ہمیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے بے حد سنجیدگی سے پڑھیں گے کیونکہ یہ عام طور پر سوڈ گیری ہی کا دور ہے۔ یا آپ زندگی کے ہر شعبے میں ''سکنڈ فڈل'' بنی رہیے۔ ورنہ

آپ کو شعوری اور غیر شعوری طور پر RESENT کیا جا سکتا ہے۔ ایسا اکثر ادب میں بھی ہوتا ہے۔

تو بہ سلسلۂ آپ بیتی تاریخ وار یہ بتانا کہ ساسن میں ہی کیا اس سن میں یوں کدو میں تیر مارا تو یہ سب 'کار جہاں دراز' کی Trilogy میں قلمبند کر لیا تا کہ سند رہے۔

مسئلہ سن اور تاریخ کا نہیں۔ مسئلہ سارے اسرار کا ہے۔ پارٹ آف دی ہسٹری کہاں۔ اور کیا اور کون۔ سرکٹ ہاؤس کے سامنے تیز چاندنی میں کنار دریا میں ایک سرخ گلاب کا پھول تیز زرد اور سرد بالو میں بونے کی ناکام کوشش کی اور اماں مالی سے باتیں کرتی قریب سے گزر گئیں۔ ریت پر سے گزرتا ایک طویل سایہ اور دوپہر کے وقت تیز دھوپ میں برآمدے کے سامنے سفید دھوتی اور پوپلے منہ والی ایک بوڑھی عورت آ کر اکڑوں بیٹھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خالی برتن تھا۔ اس نے کہا ہم نیا ماں آت رہن۔ نیا ڈوب گئی۔ اماں نے اس کو پیسے دیے چند روز بعد وہ پھر آئی۔ ہم نیا ماں آت رہن نیا ڈوب گئی۔ تم ہر دفعہ نیا ماں آت ہو نیا ڈوب جات ہے؟ میں نے تعجب سے پوچھا ہاں تو پھر کا کری۔ اس نے جواب دیا۔ دنیا کا یہی سارا ڈرامہ ہے جو بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ تو پھر کا کری۔ تو پھر کا کری۔

دریا کے کنارے اونچے سہ منزلہ مکان کے صحن میں اُو شا ناچ رہی تھی۔ چھن چھن چھن۔ اس کے جوان والدین کی تصویر ہمارے ڈائینگ روم کے آتش دان پر رکھی تھی۔ ہانکے والد کی نوکیلی مونچھیں ''دیسی سوٹ۔ والدہ بالکل سرت چندر کی ہیروئن۔ وہ کون لوگ تھے؟ کہاں گئے؟ اب ان کے متعلق بتانے والا بھی کوئی باقی نہیں۔ تاریخ کا بھی یہی مسئلہ ہے۔

اور تالاب میں سرخ کنول اور اس کے گرد اگرد ڈھنالی اور ہانسی کودتی پھر رہی ہیں۔ اور رات کے وقت ان کے گھر کی چھت پر ایک کمرے میں لالٹین جل رہی تھی اور ان کا ایک نوکر لکڑی کے ٹکڑے کو (شاید وہ ''جگن ناتھ جی'' تھے۔ لالٹین کے سامنے رکھ کر اسے بار بار پرنام کر رہا تھا۔ میں دروازے میں متحیر کھڑی ہوں وہ مجھے دیکھ کر سنجیدگی سے کہتا ہے ''یہ ہمارے کھدا میاں ہیں۔''

جب سے اب تک لوگوں نے مجھ سے اپنے اپنے کھدا میاؤں کے متعلق اسی وثوق سے بات کی ہے۔ اور ڈھنالی نے بڑی ہو کر اخبار میں پڑھا کہ ایک اطالوی فلم ڈائرکٹر کے ساتھ اٹلی چلی

گئی۔ اور روم میں ایک بوتیک چلاتی ہے۔ تعجب خیز اور شکارگاہ میں رات۔ ہم سب بچے، بھائی میں صہیب، سلویا، مظفر، تھوڑی دیر کے لیے مچان پر لے جائے جاتے ہیں۔ مجھے بڑی سخت نیند آرہی ہے۔ دور سے ایک ٹرین گزرتی ہے۔ میں چلا کر کہتی ہوں۔ وہ دیکھیے جیسے جگنوؤں کی قطار۔ اُن مما اماں سے کہتے ہیں لو باجی تمھاری لونڈیا بھی بڑی ہو کر افسانہ نگار بنے گی۔ بہ عمر چھ سال پہلی کہانی لکھی۔ ''کاٹھ گودام کا اسٹیشن تھا۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ فُلی لالٹین لیے ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے'' کہانی لکھ کر اسے خود ہی مصور بھی کرتی۔ بشیر خاں ڈرائیور قریب آ کر کھڑے ہو جاتے۔ نہایت متانت سے تصویر کشی دیکھتے اور کہتے ''بی بی چیہا کھانچ رہی ہیں'' اور اس سے بھی پہلے ایک مرتبہ بھائی نے مجھ سے کہا آپ کے سر میں بھوسہ بھرا ہے۔ میں نے یقین کر لیا۔ چند روز بعد میری ایک ولایتی گڑیا ٹوٹ گئی۔ اس کے سر میں سے بھوسہ نکلا۔ تب بھائی کی بات پر یقین پختہ ہو گیا کہ لوگوں کے سروں میں بھوسہ ہی بھرا ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب بھی بھائی پوچھتے بی بی آپ کے سر میں کیا ہے میں فرماں برداری اور وثوق کامل سے جواب دیتی ''بھوسہ''۔

کزن پارے میاں کو ایک مرتبہ میں نے اپنی ہوائی بندوق عطا کی جس کے بدلے میں انھوں نے مجھے اپنا میکنوسیٹ اور چڑیوں کے رنگین پر پیش کیے۔ کزن اچھو نے اپنا گڑیا کا ناشتہ دان عنایت کیا۔ میں ان کو اپنی سرخ پھولوں والی ہیٹ۔ کزن شاہجہاں بیگم بنت نواب محمود پور دہر دون آئیں۔ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر انھوں نے بٹوے میں سے ریزگاری نکالی اسے احتیاط سے گنا اور نہایت متانت کے ساتھ کہا۔ یہ بارہ آنے ہیں میں اس کی ایک اچھی سی موٹر خریدنا چاہتی ہوں۔

ساری عمر اس گم شدہ معصومیت کی تلاش۔ کوشک، قرول باغ، دہلی، جمیلہ، نسیمہ اور چنی اور میں باغ کے گول چبوترے پر ''ثریا کی گڑیا'' ڈرامہ کر رہے ہیں۔ (یہ ڈرامہ شاید غلام عباس نے لکھا تھا اور بچوں کے اس نفیس ادب میں شامل تھا جو دارالاشاعت لاہور اور پھول اخبار نے تخلیق کیا) چنی میری گڑیا لیڈی ہیملٹ اسنبھالے ہیروئن۔ پھر تینوں بہن کہتی ہیں تم نے یہ ''ڈانس دیکھا ہے؟ دیکھو وہ دونوں تالیاں بجا بجا کر گول گول چکر کاٹتی ہیں اور ایک سانس میں گاتی جاتی

ہیں۔ ماجھی رے ہوڑی ہنکال مانڈ ہری مانڈ والے۔ پھر وہ مطلع کرتی ہیں یہ گربا ہے ہم نے اسکول میں سیکھا۔ میں بہت مرعوب ہوتی ہوں۔ ماجھی رے ہوڑی ہنکال مانڈ ہری مانڈ چہ ی مانڈ والے۔ (اس کے اصل الفاظ اب جا کر چار پانچ روز قبل انکشاف معلوم ہوئے۔ ماچھیرا ہوڑی ہنکار۔ مارے جاؤ بیٹھے جمنا پار۔ چنانچہ اس طرح ہم ساری عمر غلط الفاظ یاد رکھتے ہیں۔۔ کوشک کے فوراً بعد نور منزل علی گڑھ۔ وہاں کزن زلیخا الاپتی پھر رہی ہیں "میرے بھران چلی تیر نظر" یہ خورشید آپا نے ہم لوگوں کو ڈانس سکھایا ہے۔ میں اور زیادہ متحیر اور مرعوب ہوتی ہوں۔ (خورشید آپا انھی دنوں نئی نئی رینو کا دیوی بنی تھیں) یہ "میرے بھران" کیا ہوتا تھا؟ یہ بچوں کی اپنی زبان تھی اور میں بھی بہت دنوں تک میرے بھران' الاپتی پھری۔ اور سینٹو چوکلیٹ میں سے نکلنے والی فلم اسٹارز کی تصاویر۔ فلشن ایڈی۔ پولٹ گوڈارڈ۔ جینٹ مک ڈانلڈ اور ان کے سینٹو البم جو دہرہ دون میں توفیق رفعت اور میں بے حد انہماک سے تیار کرتے تھے اور ہمیشہ پرامید اور متوقع کہ جانے اس چاکلیٹ میں سے کس کی تصویر نکلے گی۔ کس چیز کے اندر سے کیا چیز برآمد ہوگی۔ نہاں خانۂ اسرار۔ اودلر با کہاں تک ظلم و ستم کریں گے (یہ شاید پہاڑی سانیال کا گانا تھا)۔ پارٹ آف دی ہسٹری۔

اور حسنین ماموں اپنی بھاری آواز میں نہایت سنجیدگی سے اور ان ماموں لڈن ماموں اپنی سریلی آواز میں گا رہے ہیں۔ وہ تینوں بھی معدوم ہو چکے ہیں۔ سُر نکلا اور غائب۔ محرم نہیں ہے کوئی نوائے راز کا۔

اور پھولوں میں کیا ہے؟ سفید فرنگی پانی جو دہرہ دون میں مارچ اپریل میں کھلتا تھا۔ اور جاوا کی رانی اور گل جعفری۔ گل ہزارہ۔ گل مہتاب۔ گل محل۔ نام۔ گیندا کی کائنات الگ ہے۔ اسی کو گل جعفری کہیے اس سے منسوب کائنات مختلف ہو جائے گی۔

کالج کے فرسٹ ایئر میں پہنچنے تک گڑیاں الماری میں بند تھیں۔ سب سے نیچے اصطبل، پھر شاگرد پیشہ، پھر باورچی خانہ، پھر ڈرائینگ اور ڈائننگ روم۔ سب سے اوپر بیڈ روم۔ ان کا اسکول الگ قائم کیا تھا۔ لندن کی چھپی ننھی منی کتابیں پریوں کی۔ کہانیاں وہ گویا ان کی تعلیم کا کورس تھا۔ کسی نوع کی پرستانی کہانیوں میں یقین رکھتے ہیں اور کھلونوں سے جی بہلاتے ہیں۔ یہ

کتابیں گڑیوں کے کورس میں میں نے شامل کی تھیں۔ گڑیاں، کھلونا ٹرک میں بیٹھ کر اسکول جاتی تھیں۔ ایک کپڑے کی ہندستانی گڑیا جو مجھے مراد آباد میں کسی نے بنا کے دی تھی۔ میں نے ان جرمن گڑیوں کی آیا مقرر کی تھی۔ یعنی ذہن میں لاشعوری طور پر یہ خیال جاگزیں تھا کہ یہ بے چاری کپڑے کی گڑیا شکر پارے کی آنکھوں والی ان یورپین گڑیوں کی نوکرانی ہی ہو سکتی ہے۔ جرمنی میں چھپی پرستانی کہانیوں کی کتابیں بے حد خوبصورت تھی۔ ہم سب ساری عمر کسی نہ کسی نوع کی پریوں میں یقین رکھتے ہیں اور کھلونوں سے بھی جی بہلاتے ہیں۔

اٹاوے میں جب فقیرا خانساماں رات کو سلام کرنے آتا تو پابندی سے کہتا ''سلام بیگم صاحب۔ سلام بابا۔ سلام بی بی۔ سب گڑیوں کو سلام'' کیونکہ میں نے اسے بتا رکھا تھا کہ گڑیوں کو گڈ نائٹ کہنا بھی ضروری ہے۔ وہ سب باتیں سمجھتی ہیں۔

پھول اور اس کے بعد بنات میں لکھنا شروع کیا۔ اگر وہ کہانیاں حاصل کر لی جاتیں مثلاً ''چوکلیٹ کا قلعہ'' جو بنات میں چھپی تھی تو اس کے ذرا ہی بعد جو افسانے ساقی اور ادب لطیف، سویرا وغیرہ میں شایع ہوئے تو اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی ''چوکلیٹ کے قلعے'' کی توسیع تھے۔

اماں اور چچی وحیدہ تخت پر لیٹی باتوں میں مصروف تھیں۔ جیسے چائیلڈ آرٹ ہوتا ہے۔ میں نے کاغذ پر دو دائرے بنا کر ان کے اندر دو نقطے لگائے گویا آنکھیں۔ ایک نقطہ پھسل لکیر کی صورت میں ایک دائرے سے باہر آ گیا۔ میں نے کاغذ ان دونوں کو پیش کیا اور کہا یہ لیجیے آپ دونوں کی تصویر۔ چچی جان نے مسکرا کر لکیر کے لیے پوچھا ''اور یہ کیا ہے؟'' میں نے فوراً جواب دیا ''یہ آپ کا بندہ''۔ اس وقت میری عمر چار سال کی تھی۔ وہ منظر اچھی طرح یاد ہے۔ تو واضح ہو کہ نقطہ اگر پھسل کر لکیر بن جائے تو اس کی کچھ بھی عالمانہ تاویل کی جا سکتی ہے اور کی جاتی ہے جیسے لکیر کو کہہ دیا بندہ۔

اور اس نقطہ سے میں ''تلازمہ خیال'' اور ''شعور کی رو'' پر آتی ہوں۔ جن مغربی اصطلاحات کا میری تحریروں کے سلسلے میں مستقل ذکر کیا جاتا ہے بات صرف یہ ہے کہ میری یادداشت فوٹو گرافک ہے (ہر افسانہ نگار کی ہوتی ہے ورنہ وہ کہانیاں نہ لکھے) اور اپنے تلازمہ

خیال کی ایک توجیہہ میں اس طرح کرسکتی ہوں کہ ایک دوہرے کلچرز پیٹرن میں پرورش پائی۔ میرے گھر پر بیرہ سفید چکن پر سرخ نواڑی پٹی کس کر اور صافے کی آڑی نواڑی پٹی کچھ ایس ایچ کانفرئی مونوگرام لگائے سفید دستانے پہن کر لنچ اور ڈنر سرو کرتا تھا ''یہ براؤن صاحبیت'' نہیں تھی بلکہ ایک سو سال سے کلکتہ، بمبئی اور لکھنؤ وغیرہ میں وہ برٹش کولونیل طرز معاشرت اختیار کر رکھی تھی۔ جس طرح اس سے قبل اس ملک کے چند طبقات نے مغل تہذیب اپنائی تھی۔ ایک حد تک گجرات اور مہاراشٹر سمیت علاوہ جنوبی ہند کے اور اپنے گھر اور اپنے چچاؤں اور ماموؤں کے گھروں کے ''کوئی ہائے'' والے ماحول سے نکل کر انھیں لوگوں کے اصل تمدنی اور جذباتی HINTER LAND نہٹور، محلہ سادات لانکڑی مراد آباد اور قلعہ محمود پور (ضلع مراد آباد) چند ہفتوں یا چند مہینوں کے لیے جاتی تھی جہاں وہ پہلے والی مغل تہذیب کی بنیاد اور سانچہ ابھی موجود تھا تو وہ دوسرا خالص ہندستانی انڈو مغل ایرانی میلو بھی میرا اپنا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے سوشل ہسٹری بے حد فیسی نیٹ کرتی ہے اور اس کے تمام تہہ لوازمات، ادب میں میں بنیادی طور پر ایک رومینٹک ہوں اسی وجہ سے مجھے تاریخ اور ماضی اور وقت کے مسئلے سے ازحد دلچسپی ہے اور اسی لیے جب کبھی لکھوں تاثراتی تنقید لکھتی ہوں۔

تو 'تلازمہ خیال' اور 'شعور کی رو' کے لیے کچھ کم چیزیں تھیں؟ چنانچہ یہی تلازمہ خیال وغیرہ ساقی اور دوسرے ادبی رسالوں میں چھپنے والے میرے اولین افسانوں ''یوں ہی'' آہ! اے دوست'' ''رقص شرر'' ''یہ باتیں'' وغیرہ میں نمودار ہوا۔ اس وقت ورجینا وولف کا میں نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ نہ ہنری جیمز اور برگساں کا۔ یہ افسانے میں نے ابھی چند ماہ قبل ''ستاروں سے آگے'' میں پڑھے۔ مدتوں سے یہ کتاب نایاب تھی۔ ایک خاتون نے سنبھل ضلع مراد آباد کی پبلک لائبریری سے حاصل کر کے بھیجی۔ اسے صادق الخیری نے 1947 میں خاتون کتاب گھر سے شایع کیا تھا۔ (اسی سال دلی کے فسادات میں اس کا سارا اسٹاک مع پبلشنگ ہاؤس غتر بود ہوا) شاید منٹو نے کہیں لکھا ہے کہ جب لوگوں نے انھیں بتایا کہ وہ گورکی اور موپاساں سے متاثر ہیں تو انھوں نے ان مصنفوں کو پڑھا۔ خاکسار کے لیے کہا جاتا ہے کہ ہنری جیمز سے متاثر ہوں۔ تو ہنری جیمز

کی ایک کتاب جو مجھے مکتبہ فرینکلن (لاہور، نیویارک) نے 1954 میں ترجمے کے لیے بھیجی وہ پہلا اور آخری ناول اس ناولسٹ کا تھا جو میں نے پڑھا اور میں اس سے بہت پہلے سے لکھ رہی تھی۔ برگساں کو میں نے باقاعدہ پڑھا ہی نہیں البتہ شینگلر اور ٹوئنبی کو پڑھا ہے۔ لیکن کیا انسان از خود کچھ بھی نہیں سوچ سکتا؟ نہ بہ قلم خود کچھ لکھ سکتا ہے؟ واضح ہو کہ نہ میں متفکر ہونے کا دعویٰ کرتی ہوں نہ فلسفہ دانی کا۔ محض جستجو۔

از ابلا تھوبرن کالج میں امریکن طریقہ تعلیم کے مطابق انٹرمیڈیٹ کلاس میں ہر ہفتے ہم لوگوں کو لائبریری سے دو کتابیں لے کر ان کی ''ریڈنگ رپورٹ'' دینی ہوتی تھی۔ EARLY TEENS کی دلچسپی کے مطابق میں بھی ڈکنز، کیسنگ، اسیٹونسن، لوئیز اے، الکاٹ، ڈیوماز وغیرہ پڑھا کرتی تھی۔ بچپن کی ساتھی کملا جسپال ایک بے حد ذہین خاتون تھیں اور میری گرو بنی ہوتی تھیں۔ میں ان کی چیلی۔ مجھ سے سینئر تھیں۔ ایک روز انھوں نے بے نیازی سے مطلع کیا کہ اسٹریم آف کونشس نس ان انگلش ناول پر مقالہ لکھ رہی ہیں۔ مجھ پر بڑا رعب پڑا کہ یہ کوئی بہت ہی زبردست چیز ہوگی۔

ایم اے میں ہم کو جدید انگریزی ناول نہیں پڑھایا گیا۔ اسی زمانے میں بنگلور کی ایک خاتون ممتاز شیریں نے بحیثیت ناقد بہت شہرت حاصل کی ''تکنیک کا تنوع'' ان کا ایک نہایت عالمانہ مضمون سویرا (لاہور) میں چھپا۔ انھوں نے مجھ سے خط و کتابت شروع کی اور لکھا آپ ورجینا وولف سے بہت متاثر ہیں۔ میں نے جواب دیا جی ہاں ہوں۔ عزیز احمد کا خط حیدرآباد دکن سے آیا۔ آپ نے غالباً فلاں فلاں کو بہت پڑھا (بہت سے جدید مغربی ادیبوں کے نام لکھے تھے) ان میں سے ولیم سیرویاں کا نام مجھے اب تک یاد ہے جسے میں نے بعد میں پڑھا اور بہت پسند کیا۔ احمد ندیم قاسمی نے اندر پرستھ کالج کے رسالے میں جسے میں ایڈٹ کرتی تھی میرا ایک انگریزی ''ڈرامہ پڑھ کر پشاور سے لکھا'' معلوم ہوتا ہے آپ نے فلاں فلاں مغربی مصنفین کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے جواب دیا جی ہاں۔ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ پھر میں نے کملا جسپال اپنی گرو کی تقلید میں اعلان کیا کہ میں اسٹریم آف کونشس نس ان انگلش ناول پر مقالہ لکھ رہی ہوں۔ خود کو

ایک صاحب نظر ادیبہ کہلانے کے شوق میں اور اپنی کم عمری چھپانے کے لیے خود کو نہایت بھاری بھرکم ظاہر کیا کہ کچھ عرصے بعد کراچی پہنچ کر پہلی بار ایک عزیزہ نے ورجینا وولف کی TO THE LIGHT HOUSE کو 1950 میں پڑھنے کو دی اور وہ مجھے بے انتہا پسند آئی (میرے بھی صنم خانے اپریل 1949 میں چھپا تھا) اسی زمانے میں جدید انگریزی ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسے مع ورجینا وولف بہت پڑھا۔ خصوصاً جدید انگریزی شاعری۔ تو عرض یہ ہے کہ ورجینا وولف کا مطالعہ کر کے میں نے ''شعور کی رو'' شروع نہیں کی جیسا کہ مستقل کہا جاتا ہے بلکہ کچھ ٹوں ٹاں اس خاکسار نے بہت پہلے سے شروع کر دی تھی۔ مجھے ایلزبتھ بوون بھی بہت پسند ہیں۔ میرے سلسلے میں ان کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ لیکن ورجینا وولف نے ''سفینۂ غم'' لکھنے سے پہلے یقیناً متاثر کیا۔ ان لوگوں کو جو خود تخلیقی ادیب نہ ہوں یہ سمجھانا بہت مشکل ہے کہ شاعر کس طرح شعر کہتا ہے۔ موسیقار کیسے موسیقی کمپوز کرتا ہے۔ افسانہ نگار کیوں کر افسانے لکھتا ہے۔ یہ ایک اندرونی بے ساختہ عمل ہے۔ تکنیک کے نسخے سامنے رکھ کر نہیں لکھا جاتا۔ نہ پینٹ کیا جاتا ہے جب میں نے ''میرے بھی صنم خانے'' لکھا اس وقت تک میں نے کوئی جدید انگریزی ناول پڑھا ہی نہیں تھا۔ نہ ''آگ کا دریا'' کے لیے میں نے کوئی نسخہ سامنے رکھا۔ ایک صاحب نے کہا یہ اور لینڈ و کا چربہ ہے۔ ایک نے کہا ''سدھارتھ'' کا۔ ہمارے یہاں کوئی چیز اور یجنل سمجھی ہی نہیں جاتی۔ (اور لینڈ و میرے خیال میں ورجینا وولف کا بے حد کمزور ناول ہے) مجھے فرانسیسی امپریشنسٹ بہت پسند ہیں اور کانسٹیبل کی رومینٹک ریلزم بھی اور جرمنی ایکسپریسٹ بھی اور ''طیفل طوچ ماسٹرز'' بھی بڑی سیدھی سی بات ہے جس طرح کی آپ کی افتادِ طبع ہوگی اس نوع کا ادب اور آرٹ آپ کو اپیل کرے گا اور متاثر کرے گا۔

اقبال اور ایلیٹ میرے اولیا ہیں۔ دونوں نوعمری میں میرے ساتھ رہے ہیں۔ اس وقت بھی جب ایلیٹ پوری طرح سمجھ میں بھی نہ آتا تھا لیکن مسحور کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں نے اپنی دانست میں اقبال کی جو لفظی تصور کر رکھی وہ والد مرحوم کو بتائی تھی کہ سمرقند یا بخارا ہے اور شہسوار اڑے چلے آ رہے ہیں اور گلیوں میں قالین بچھے ہیں اور نہ جانے کیا کیا۔ گویا چغتائی کی تصاویر اور اقبال کے EVOCATIVE الفاظ پر مبنی تصورات معجون مرکب۔

میں اپنی مرحومہ والدہ کی طرح ایک نہایت GREAGARIOUS اور قبائلی خاتون ہوں اور ان ہی کے مانند رشتے داروں اور دوستوں کے سلسلے میں بے حد خوش نصیب۔ مجھے ہر ملک اور ہر قوم اور فرقے میں بے انتہا پُر خلوص اور اچھے دوست ملے ہیں۔ ہندستانی، پاکستانی، بنگالی، پنجابی، پٹھان، گجراتی، انگریز، امریکن، یورپین، روسی، پارسی، یہودی اور یہ دوستیاں پرانی اور پائیدار اور پُر خلوص ہیں۔ کہا جاتا ہے جس کے بہت دوست ہوں دراصل اس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں مفروضہ قطعی غلط ہے۔ اور میرے احباب میں متعدد اہل قلم بھی شامل ہیں ''معاصرانہ چشمک'' والی بات بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ رشک مجھے صرف دو طرح کی خواتین وحضرات پر آتا ہے۔ ایک بھرت ناٹیم ڈانسرز۔ دوسرے وہ لوگ جو اوکسفرڈ یا کیمبرج میں رہ کر علمی کام کرتے ہیں۔ اگر میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا نہ ہوتی اور ایسا مسلم گھرانہ جو موڈرن ہونے کے ساتھ قدامت پرست بھی تھا، تو میں یقیناً بھرت ناٹیم میں مہارت حاصل کی ہوتی۔ زمانہ بدل گیا۔ مجھ سے اگلی پیڑھی میں میری چچازاد بہنوں کی لڑکیوں نے اپنے والدین کی اجازت اور ہمت افزائی سے باقاعدہ کلاسیکل رقص سیکھا۔ اور اگر مجھ میں DRIFT کرنے کی عادت اور سستی نہ ہوتی تو میں یقیناً اوکس برج پر مستقل قیام کرتی۔

کہاں کی ''معاصرانہ چشمک'' اپنے دوستوں کی اچھی تخلیقات کے علاوہ اگر مجھے کسی بھی ادیب کی کوئی چیز پسند آتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں۔ میں نے السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں انتظار حسین، خالدہ، اصغر، ابوالفضل صدیقی اور آغا بابر کے افسانے جو مجھے بہت اچھے لگے فوراً ترجمہ کر کے شایع کیے۔ اس سے قبل میں ہاجرہ، خدیجہ اور کئی ادیبوں کی چیزیں انگریزی میں ترجمہ کر چکی ہوں۔

معاصرین سے پرخاش اور اپنے سے سینئر ادیبوں کا مذاق اُڑانا یا ان کے ساتھ بدتمیزی کے موجودہ رویے میرے لیے تعجب خیز ہیں۔ کسی PERSONALITY PROBLEM کے فقدان کی وجہ سے میں لوگوں سے فوراً دوستی کر لیتی ہوں اور زیادہ تر لوگوں کو جو مغرور نہ ہوں بہت اچھا اور موئیٹ سمجھتی ہوں۔ میرے بہی خواہوں کو ہی شکایت ہے کہ میں ہر کس و ناکس کو بہت اچھا

سمجھتی ہوں اور ان کی اصلیت نہیں پہچان پاتی۔ اس بات کا تجربہ مجھے اب تک نہیں ہوا۔ الا چند موقعوں کے اور یہ تلخ تجربے ابھی فقط پچھلے دو تین سال ہی میں بسلسلۂ ملازمت اور بسلسلہ ادب ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر چند ماہ قبل ایک مشہور شاعرہ کراچی سے چار دن کے لیے تشریف لائیں مجھ سے ملنے آئیں۔ میں حسب عادت ان سے نہایت خاص اور اپنائیت سے ملی۔ دو تین مرتبہ کی سرسری ملاقات کے بعد کراچی واپس جا کر انھوں نے میرے متعلق ایک نہایت بھیانک اور لغو اور لچر اور SICK نظم لکھ کر چھپوا دی۔ جس میں میری شخصیت کو بری طرح انتہائی VICIOUS طور پر مسخ کر کے پیش کیا اور میں متحیر ہوں کہ انھوں نے ایسا کسی وجہ سے کیا۔ افسوس یہ ہے کہ اس طرح انھوں نے اپنے TWISTED MIND اور بیمار ذہن کا مظاہرہ کیا۔ COMPLEXES کی بھی گوناں گوں اقسام ہیں۔ ایک قسم تہلکہ خیزی کی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ چاہے کسی قسم ہی کی سہی، شہرت حاصل ہو۔ ایک صاحب نے میری ایک MAJOR تصنیف کار جہاں دراز ہے (جلد اوّل) پر نہایت طویل تبصرہ شایع کیا جو تبصرہ کم اور پھکو پن اور بالکل UNPROVOKED ذاتی حملے زیادہ تھا۔ اسی طرح کچھ عرصہ قبل ایک بے ہودہ افسانہ لکھا جا چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ لوگ بالخصوص آج کل آخر ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اس افسوسناک رویے کا تعلق ایسے لوگوں کی انفرادی ابنارمل نفسیات سے ہے یا اس کی کوئی سماجیاتی وجہ بھی ہے؟ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ہمارے ادب میں MALE CHAUVINISM یقیناً موجود ہے۔

میں نے آج تک کسی معاصر کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتی۔ پھر لوگ ایسے UNPROVOKED ذاتی حملے اور اتنی بے ہودگی کیوں کرتے ہیں؟ ان سے انھیں کس طرح کی خوشی حاصل ہوتی ہے؟ اس قسم کے VICIOUS لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر میں بدنفسی اور شرارت پر اتروں تو قلم میرے ہاتھ میں بھی ہے جس کے خلاف جو دل میں آئے میں بھی لکھ سکتی ہوں۔

اپنی تحریروں کا مجھے کوئی OBSSESSION نہیں ہے۔ عموماً ان کے خلاف ہی لکھا جاتا ہے سو وہ بالکل جائز ہے۔ یہ ناقد کا حق ہے وہ جو چاہے لکھے۔ جب آپ کوئی چیز لکھ کر چھپواتے

ہیں تو پھر آپ کو شکایت نہیں کرنی چاہیے کہ اس پر کیسی تنقید ہوئی۔ لیکن خود مصنفہ پر ذاتی حملے کسی مہذب تمدنی سوسائٹی کا شیوہ نہیں ہے اور یہ ہمارے ہاں برابر ہوتا رہتا ہے اور اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ عمرانی۔ انگلستان اور فرانس میں خواتین نصف سترھویں صدی سے ناول لکھ رہی تھیں وہاں کے سماج کو عورت کے متعلق وہ HANG-UPS اور فرسٹریشن نہیں ہے جو ہمارے یہاں موجود ہے۔ 1979 آ گیا لیکن ہمارے معاشرے میں خصوصاً اردو داں سوسائٹی میں ایک خود مختار کریئر وومن کو ایک عجوبہ روزگار ہستی سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے جو بھی قیاس آرائیاں نہ کی جائیں کم ہیں۔ ذاتی طور پر میرے سلسلے میں ایک اور مسئلہ ہے۔ میں نے جس مخصوص سوشل سیٹ اپ ماحول اور فضاؤں میں پرورش پائی اور زندگی گزاری وہ زیادہ تر لوگوں کے لیے ایک اجنبی دنیا ہے لہٰذا میرا جو مخصوص PURITANICAL, SEMI-FEUDAL, ANGLICISED'LIDELRAL-TULIEU' رہا ہے۔ وہ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آ سکتا اور اس کی عکاسی جو میں لڑکپن سے اپنے افسانوں اور ناولوں میں کر رہی ہوں وہ بھی اسی وجہ سے ہدف ملامت بنی رہی۔ میرے اندر وہ 'انا' اس حد تک یقیناً موجود ہے جو ہر معقول انسان میں ہونی چاہیے لیکن خود پرست، ایغوزدہ برخود غلط لوگوں کو میں قابل رحم سمجھتی ہوں۔ علم و دانش کے لحاظ سے خود کو عقل کل گردانا زبردست حماقت ہے اور اس حماقت میں لوگ آسانی سے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آپ اگر کسی وجہ سے بھی مدفع ہیں۔ دانشوری یا دولت و ثروت، کارنامے، سماجی مرتبہ، اقتدار، کامیابی، شہرت — ان چیزوں میں سے کسی کی وجہ سے آپ میں غرور آ جائے تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی ذہانت میں کچھ کمی ہے۔ ہمیشہ اپنے پاؤں زمین پر رہنے چاہئیں۔ ہم اور آپ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ نہ جاننا شروع کر سکتے ہیں۔ وہ وکٹورین پادری جس کا نام ریورنڈ چارلس ڈوڈج سن تھا وہ لوئس کیرل کے قلمی نام سے ایک کتاب لکھ گیا ''ایلس اِن ونڈر لینڈ''۔ وہ آپ نے اب تک نہ پڑھی ہو تو ایک بار پڑھ لیجیے۔ وعلیکم السلام۔

(فن اور شخصیت، بمبئی [آپ بیتی نمبر، جلد اول]، جلد:4، شمارہ:7، ستمبر 1978)

قرۃ العین حیدر (ابن سعید)

''اینی ایک ادبی فراڈ ہے۔''

''اینی کانوینٹ کی پڑھی ہوئی بد دماغ قسم کی لڑکی ہے؟''

''اینی ایک پردہ نشین لڑکی ہے جس نے کانوینٹ تو کیا کسی انگریزی اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی!''

''اینی رومان پسند ہے!''

''اس کی طبیعت میں مغربیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے!''

''وہ ایک قدامت پرست مشرقی لڑکی ہے جس کو کلبوں اور کاک ٹیل پارٹیوں سے کوفت ہوتی ہے!''

''اینی ترقی پسند ہے!''

''اینی رجعت پسند ہے!''

.....یہ اور اسی قسم کی ہزاروں باتیں آپ اینی کے بارے میں سنیں گے۔ ان لوگوں سے بھی جو اس کو ذاتی طور پر جانتے ہیں اور ان سے بھی جو اس کو بالکل نہیں جانتے۔ ہر کوئی وثوق کے ساتھ

اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بس یہ اپنی پر ''آخری حرف'' ہے۔ اس سے زیادہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں بھی اپنی کو ایک طویل عرصے سے جانتا ہوں لیکن میں وثوق کے ساتھ اب بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اپنی کے بارے میں ''آخری حرف'' کیا ہے؟

بظاہر اپنی کے بارے میں جو باتیں سننے میں آتی ہیں ان میں ایک طرح کا تضاد نظر آتا ہے لیکن اپنی سے مل چکنے کے بعد یہ باتیں متضاد نہیں معلوم ہوتیں، غیر معمولی بھی نہیں معلوم ہوتیں، اور اس تضاد میں ایک ہم آہنگی، ایک قسم کی یک رنگی معلوم ہونے لگتی ہے.... ''تضاد اور ہم آہنگی'' ہی غالباً اپنی کی اصل شخصیت ہے۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ دلی کے ''ساقی'' میں اپنی کی ایک کہانی چھپی۔ ہلکے پھلکے انگریزی وضع کے نام، انگریزی گیتوں کے پورے پورے stanzas، بائبل کی دعائیں، اور ان سب پر حاوی رومن کیتھولک کانوینٹ کی مخصوص فضا.... ان چیزوں نے پڑھنے والوں کو چونکا دیا اور شاید چوکنا بھی کر دیا۔ اس کے بعد پے در پے اپنی کی کئی کہانیاں چھپیں۔ ان سب کا کچھ ایسا ہی انداز تھا۔ یہی ان ہونا سا، خواب ناک سا ماحول تھا۔ ایسا ماحول جو اس مادی حقیقی دنیا سے منسلک ہوتے ہوئے بھی کچھ ماورا تھا اور جب کبھی اپنی کی کوئی کہانی چھپتی تو ''ساقی'' کے صفحے کے صفحے انگریزی رسم الخط سے پر نظر آتے، ان کہانیوں کے عنوان بھی کچھ نئے سے تھے جیسے نظموں سے اخذ کیے گئے ہوں، اور پڑھنے والے سوچتے کہ نہ جانے یہ لکھنے والی کون ہے جس کی کہانیوں کے ماحول کا ایک سرا غالب اور فیض کی شاعری سے جا ملا ہے اور دوسرا سرا بادلوں میں گم ہو کے رہ گیا ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد اپنی نے اپنے پڑھنے والوں کے لیے اس معمے کو ذرا سہل بنا دیا۔ اس نے اپنی کہانیوں سے انگریزی رسم الخط نکال پھینکا اور اس کے بجائے اردو رسم الخط میں یا پھر اردو کے جامے میں اپنے تاثرات اور احساسات کو ڈھال کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہ بھی اردو افسانہ نگاری میں ایک نیا تجربہ تھا۔ اس نے ایک عرصے تک اردو پڑھنے والوں کو تحیر میں رکھا، اور میرا خیال ہے کہ موجودہ دور کے لاتعداد نو عمر افسانہ نگاروں کو، جن کے نام آج کل رسالوں کی فہرستوں میں نظر آتے ہیں، اس تجربے نے ایک بہت بڑی حد تک متاثر کیا ہے!

بنیادی طور پر اپنی افسانہ نگار ہے لیکن اس نے دو کامیاب ناول بھی لکھے ہیں۔ وہ کلاسیکی اور نیم کلاسیکی موسیقی سے بھی واقف ہے اور اس کو پینٹنگ سے بھی گہرا شغف ہے۔ یوں وہ اپنے تخیل کو فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں پر وارد کرنے کی اہل ہے! لیکن ان سب مختلف النوع تجربوں میں اس کی ذاتی شخصیت کو بھی واضح اور داخلی حیثیت حاصل ہے۔

اپنی چیزوں کی ظاہری ہیئت کو دیکھنے کے علاوہ ان کی ماہیت کو داخلی طور پر محسوس کرنے کی عادی ہے۔ شاید اس کی قوت باصرہ اور قوت سامعہ دونوں بہت غیر معمولی طور پر حساس واقع ہوئی ہیں۔ ایک طرف تو اس کی قوت باصرہ رنگوں اور شکلوں اور خطوں کی کیفیت اور ہم آہنگی کو اپنے میں جذب کرنے پر تلی رہتی ہے اور دوسری طرف اس کی قوت سامعہ آوازوں کی کیفیت اور زیر و بم اور داخلی موسیقی پر مرکوز رہتی ہے اور اس کے اپنے محسوسات نہ جانے ان رنگوں اور آوازوں کے سہارے کہاں نکل جاتے ہیں اور ایک طرح کی چکاچوند کیفیت اس کی ادبی اور فنی کاوشوں میں جھلک آتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے اپنی ہمارے موجودہ دور کی پیداوار ہے۔ اس نے دہرہ دون اور لکھنؤ کے اسکولوں میں اولین تربیت پائی۔ پھر لکھنؤ کے مشہور ازابیلا تھوبرن کالج سے بی اے پاس کیا اور پھر اپنی تعلیم کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوگئی۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد اودھ کے اس مخصوص ماحول کو دیکھا جو اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ جس دور میں اپنی نے نشو ونما پائی اس میں ایک طرف تو دہلی کی تہذیب تھی جو دم توڑ رہی تھی، جہاں اب شریف مسلمانوں کے زیادہ تر خاندان چند پرانے، تاریک، تنگ محلوں میں محبوس ہو کر رہ گئے تھے اور ان کے اردگرد ایک نئی دہلی پیدا ہو رہی تھی جس میں نو دولتیے ٹھیکیدار تھے یا مختلف صوبوں اور علاقوں سے برآمد کیے ہوئے سرکاری ملازم تھے جو برسوں دلی میں زندگی بسر کرنے کے بعد بھی اپنی اپنی علاقائی بندشوں میں جکڑے رہتے تھے اور اس پرانی دلی کے جغرافیے اور معاشرت سے بے خبر اپنی تمام زندگی گزار دیتے تھے یا پھر دوسری طرف اسی دور میں بمبئی اور کلکتہ جیسے کاروباری شہر تھے جن میں زندگی ایک بے پناہ، دم گھونٹ دینے والی رفتار سے بہتی تھی اور جہاں لوگ دن رات ایک ختم نہ ہونے والی دوڑ

میں شریک رہتے تھے۔ لیکن اسی دور کا لکھنؤ، تعلقہ داروں کا لکھنؤ، ایک خاص حیثیت کا مالک تھا۔ اس ماحول میں وہ کاروباری یا نو دولتی ذہنیت نہ تھی بلکہ ایک قسم کا ٹھہراؤ تھا، ایک بھاری بھرکم پن تھا جو بہت سے شعبوں کو، بہت سی Traditions کو اپنی جگہ مستحکم رکھتا تھا۔ شاید اس استحکام اور ٹھہراؤ کی پشت پر تعلقہ داروں کی مالی آسودگی تھی۔ یہ تعلقہ دار مسلمان حکمرانوں کی تہذیب، تمدن اور زبان سے بے حد متاثر تھے اور اپنی نے ہوش سنبھالتے ہے اپنے کو اس ماحول میں پایا اور اس لیے اس کو اپنے اردگرد زندگی میں وہ جمود اور گھٹن محسوس نہ ہوئی جو اور علاقوں کے نوجوان لکھنے والوں کو محسوس ہوتی تھی۔

بہت سے لوگ اپنی کو رجعت پسند کہتے ہیں۔ عصمت چغتائی نے بھی ایک مرتبہ اپنی کی شخصیت پر یہی الزام لگایا تھا۔ لیکن اگر آپ اپنی سے ملیں تو وہ اس قسم کے الزام کو شد و مد کے ساتھ رد کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ کہتی ہے کہ وہ تو محض اس تمدن، اس ماحول کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرتی ہے جو اس بیسویں صدی کے لکھنؤ کے تمدن کو سنبھالے ہوئے تھا، جس نے آئی ٹی کالج کی لڑکیوں میں ایسی سنجیدہ مزاجی پیدا کر دی تھی جو دوسرے کالجوں کی لڑکیوں میں مفقود تھی اور جس نے لکھنؤ یونیورسٹی کی بہت سی لڑکیوں کو ترقی پسند اور انقلابی بنا دیا تھا۔ اس لیے وہ رجعت پسند نہیں ہے۔ اب پتا نہیں کہ کون سی بات ٹھیک ہے، کون سی غلط، عصمت ٹھیک کہتی ہے یا اپنی....!

جب اپنی کا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' چھپا تو اس کو سب سے زیادہ مسرت اس بات کی تھی کہ اس نے لکھنؤ کے اس مخصوص ماحول کو ایک کینوس پر پیش کر دیا ہے۔ جو لوگ اپنی کو جانتے تھے انھوں نے اس کے ناول کے کرداروں کے روپ میں فوراً ان ہستیوں کو پہچان لیا جو حقیقی تھیں، اور اس بڑے پیمانے پر اس قسم کے ادبی تجربے میں اپنی کو ایک عجیب مسرت محسوس ہوئی۔ ''میرے بھی صنم خانے'' کے بعد کوئی تین سال ہوئے اپنی نے ایک اور ناول لکھا: ''سفینۂ غم دل'' مجھے وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے جب اپنی یہ ناول لکھنے میں مصروف تھی۔ اس کے لکھنے کی رفتار ہمیشہ بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ ایک وقت میں چیپٹر کے چیپٹر لکھ ڈالتی ہے۔ ایک روز اس نے مجھ کو اپنے ناول کے مسودہ میں سے وہ حصہ دکھایا جس میں اس نے اپنے ان تاثرات کو بیان کیا ہے جو اس

کے دل میں اپنے باپ کی موت سے پیدا ہوئے ہیں اور مجھ کو بے ساختہ غیر شعوری طور پر 1943 عیسوی کی وہ صبح یاد آ گئی جب میں نے لکھنؤ میں سجاد حیدر یلدرم صاحب کے انتقال کی خبر سنی تھی اور میں ایک دوست کے ہمراہ ان کے گھر گیا تھا۔ مجھے اس صبح کی بہت سی باتیں تفصیل کے ساتھ یاد نہیں لیکن ایک مجموعی تاثر، جو اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے، اس تصویر سے بہت قرین ہے جو اینی نے اپنے ناول میں کھینچی ہے۔ اس صبح کو لکھنؤ کی فیض آباد روڈ کے اس بنگلے میں لوگوں کا کافی ہجوم تھا لیکن پھر بھی فضا میں ایک سناٹے کی سی کیفیت تھی جس کو انسان اس گھر میں قدم رکھتے ہی محسوس کر سکتا تھا۔ اس وقت میں اینی سے بہت ہی سرسری طور پر واقف تھا بلکہ تقریباً ناواقف تھا، لیکن جب میں نے ''سفینۂ غم دل'' میں یہ حصہ پڑھا تو مجھ کو اب سے برسوں پہلے کے لکھنؤ کی وہ صبح بے ساختہ یاد آ گئی۔

یہاں پر ایک ایسا سوال پیدا ہوتا ہے جو مجھ سے اکثر ان لوگوں نے پوچھا ہے جو اینی سے ذاتی طور پر واقف نہیں۔ ''اینی کی شخصیت کو اس کی اپنی کہانی میں کیا حیثیت حاصل ہے؟'' عام طور پر لوگ جب کسی نوجوان خاتون کے افسانوں کو پڑھتے ہیں تو ان کو فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کہانیوں کے ''واحد متکلم'' میں یا کسی اور بنیادی کردار میں لکھنے والی کی اپنی شخصیت پوشیدہ ہے۔ نہ جانے کیوں مرد افسانہ نگاروں کی کہانیاں پڑھ کر کبھی بھی اس قسم کا کوئی رومانوی اندیشہ نہیں پیدا ہوتا۔ اس کو آپ ہماری برخود غلط گمانی کہہ لیجیے یا نفسیاتی کمزوری، لیکن واقعہ یہی ہے کہ جہاں کوئی دلچسپ قسم کا نسوانی کردار کسی خاتون افسانہ نگار کی کہانیوں میں نظر آیا اور فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ دراصل یہ مصنفہ کا اپنا اصلی روپ ہے۔ گویا لکھنے والی کی شخصیت بھی ایک ایسا راز ہے جو داستانوں کے جامے میں تو اجاگر ہو جاتا ہے لیکن لیکن ویسے مخفی ہی رہتا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ اینی کے کرداروں کا تجزیہ کریں تو آپ کو ان میں بہت سی اصلیتیں نظر آئیں گی۔ وہ ماحول نظر آئے گا جس میں وہ خود پلی بڑھی ہے۔ کالجوں کا ماحول اور جغرافیہ بالکل آئی ٹی کالج سے مماثل نظر آئے گا۔ سڑکوں اور عمارتوں اور جگہوں کے نام ہم صورت سے نظر آئیں گے۔ لیکن بس، یہاں تک پہنچ کر اینی کی اپنی شخصیت اس تمام ماحول اور فضا کا ایک

جزو بن کر رہ جاتی ہے، وہ کہیں بھی شخصی طور پر خود کو اپنے کرداروں میں مخل نہیں ہونے دیتی۔ وہ ان کو اپنی ذات سے ضرور متاثر ہونے دیتی ہے لیکن اس حد سے آگے وہ ان کو اپنے طور پر مختلف ارتقائی منزلوں سے گزرنے کا موقعہ دیتی ہے اور پھر وہ کردار محض فنی تقاضوں کے مطابق نشو ونما پاتے ہیں۔ جو لوگ اپنی سے اچھی طرح واقف ہیں ان کو اپنی کے افسانوں میں کبھی کبھار، کسی فقرے میں، کسی منظر کشی میں، کسی دلچسپ سے واقعے میں، اپنی کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آجاتی ہے لیکن محض ایک خفیف لمحے کے لیے اور پھر یہ جھلک بھی اس بڑے ماحول، وسیع فضا کا ایک حصہ بن کر رہ جاتی ہے۔

ایک عنصر ایسا بھی ہے جو اپنی کے ادب میں اور اس کی اپنی ذات میں یکساں طور پر نظر آتا ہے، یہ ہے اس کا فنی خلوص! وہ ہر چیز کو اس خلوص کی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ اگر وہ اس کے معیار پر پورا اترتی ہے تو وہ اس کو قبول کر لیتی ہے، ورنہ اس کی طرف سے منہ موڑ لیتی ہے اور پھر کسی بھی قیمت پر اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں لوگوں سے مل چکنے کے باوجود اور پارٹیوں اور ہنگاموں سے پر زندگی کی قربت کے باوجود اس کا اپنا حلقۂ احباب بہت مخصوص ہے۔ ایسے لوگوں کو جو فنی خلوص کے معیار پر پورے نہیں اترتے، وہ قطعی نا قابل برداشت اور ''بور'' سمجھتی ہے اور بور لوگوں سے محض سوشل قسم کی ملاقاتوں کے بجائے ایک قسم کی ''ست الوجودی'' کی زندگی کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ اس کے گھر میں، جہاں اس کی کتابوں کے انبار ہیں، اس کا پیانو ہے، مکمل اور غیر مکمل Paintings میں، اپنے گروہ میں ایسے وہ گھنٹوں باتیں کرنے سے بھی نہیں تھکتی! میں نے اس کو ایک وقت میں مختلف النوع موضوعات پر کئی کئی لوگوں سے بحث کرتے دیکھا ہے۔

ادیبوں اور ادبی معیاروں کے سلسلے میں بھی وہ اپنی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ مثلاً اگر اس کو معلوم ہے کہ ایک شہرت یافتہ ادیب اپنی بیوی سے اچھا سلوک نہیں کرتا تو وہ اس کے ادبی کارناموں کو کبھی بھی سراہنے کے لیے تیار نہ ہوگی۔ اسی بنا پر اس کے حلقہ احباب میں ادیب بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ اپنی ادبی شخصیت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی

شخصیت کی بنا پر اس سے رابطہ بڑھا سکے ہیں۔ زبردستی کی ''ادبی'' گفتگو سے بھی اپنی بہت گھبراتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی اس سے رسمی طور پر پوچھ لے کہ وہ ''آج کل کیا لکھ رہی ہے؟'' تو سخت کوفت محسوس کرتی ہے اور کہتی ہے کہ بقول شخصے یہ سوال ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دو باورچی ایک دوسرے سے ملنے پر پوچھیں: ''آج تم کیا پکا رہے ہو؟''

خونیں جنگوں اور ایٹم بم سے پیدا کیے ہوئے اس تمدن کو وہ بہت دوبھر سمجھتی ہے۔ موجودہ نسل کی ''مغربیت زدگی'' سے بڑی گھبراتی ہے، کاک ٹیل پارٹیوں میں بیٹھ کر وہ سوچتی ہے کہ یہ سب لوگ جو ناچ رہے ہیں دراصل اپنی حقیقت سے، اپنے مرکز سے، اپنے محور سے کتنے دور ہٹ گئے ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن یہ ماحول، یہ فضا ان باتوں کے لیے موزوں نہیں اور وہ یہ سوچتی ہے کہ شاید یہ لوگ اب اپنے مرکز سے اتنے دور نکل آئے ہیں کہ ان کی زندگی ایک قسم کے کلچرل خلا میں بسر ہونے لگی ہیں اور اس خلا کو پر کرنے کی کوشش میں انھوں نے ''جاز میوزک'' رمبھا اور سامبھا میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے، نئی نئی پیدا کی ہوئی دولت کی نمائش کرنی سیکھ لی ہے لیکن ان کی یہ کوششیں رائیگاں جاتی ہیں اور وہ سب اور بھی زیادہ بے بس اور قابل رحم نظر آنے لگتے ہیں اور اپنی زندگیوں کے Tempo میں کچھ اور اضافہ کر دیتے ہیں!.... اور نہ جانے اب یہ Tempo کہاں جا کر ٹوٹے گا؟.... شاید یہی وجہ ہے کہ پریوں کی کہانیوں کی سنڈریلا کی طرح اپنی کو بھی یہ احساس ہونے لگا ہے کہ وہ اپنا شیشے کا سلیپر کہیں کھو بیٹھی ہے.... اور نہ جانے اس کی طرح موجودہ دور کے اور کتنے نوجوانوں، ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور آرٹسٹوں کو ایک شیشے کے سلیپر کی تلاش ہے!

(''نقوش'' لاہور، شخصیات نمبر، جنوری 1955)

فٹ نوٹ

آج صبح صبح ہماری پیاری بہن نفیس کا فون آیا کہ بھئی تمھارے متعلق وہ مشہور و معروف مضمون تیار ہو گیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے دل ڈوب سا گیا۔ پھر دفعتاً یاد آیا کہ مضمون بہت اہم ہستیوں پر لکھے جاتے ہیں لہٰذا فی الفور کچھ عجیب آسمانی خوشی سی محسوس ہوئی۔ قصہ یوں ہوا کہ نفیس کے میاں جو ہیں، لیفٹیننٹ کمانڈر عسکری ان کا نام ہے اور آپ کچھ ادب وغیرہ سے شغل کرتے ہیں اور دوسرے سارے نہایت قابل اور مہا پرش لوگوں کی طرح یہ بھی Incognito رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تو آپ نے گویا ایک مضمون اس خاکسار کے بارے میں رقم فرمایا۔ (یہ ایک اور عسکری ہیں، جو دوسرے والے عسکری صاحب ہیں تو وہ بھلا ہم جیسے چھٹ بھیوں پر کیا مضمون لکھیں گے حالانکہ ڈرتے ڈرتے ایک روز خیال تو آیا تھا کہ ان سے کہا جائے کہ اللہ عسکری صاحب ایک مضمون آپ ہی لکھ دیجیے۔ مگر پھر سوچا کہ کہاں ملارے اور ریں بو اور کہاں ہم خاکسار لوگ!) تو قصہ مختصر یہ کہ اب عسکری (ابن سعید) نے شخصیت نگاری گویا شروع کی۔ کئی دفعہ ان سے کہا تھا کہ بھئی مضمون لکھو۔ خدا کے لیے ہم پر مضمون لکھو۔ یہ تک وعدہ کیا کہ آئندہ ''ابن سعید میری نظر میں'' کی قسم کا ایک مضمون میں بھی لکھ دوں گی۔

بہر حال، تو اب محترمہ نفیس عسکری نے مطلع فرمایا کہ مضمون تیار ہو چکا ہے۔ بس ایک آنچ کی کسر ہے۔

دراصل ہمارے بارے میں اس قدر بھانت بھانت اور انواع واقسام کے مضامین لکھے گئے ہیں کہ ہم اب بالکل ڈی مورلائزڈ ہو چکے ہیں۔ چناں چہ اب عسکری (یعنی ابن سعید) نے اور ہم نے طے کیا کہ یہ اور بھی بہترین چیز ہے کہ گیارہویں Commandment پر عمل کرتے ہوئے (اپنی مدد آپ کرو) اپنے اوپر مضمون خود لکھو اور کبھی دوسرے کو اس کا موقعہ ہی نہ دو۔ یعنی جو ایکٹوٹی وہ تم پر کرنا چاہتا ہے، اس سے پہلے کہ وہ ہو جائے، وہ ایکٹوٹی اپنے اوپر خود کر لو۔

اور پھر سوال یہ بھی ہے کہ اس قدر پریشانی کاہے کی ہے۔ بقول شاعر ع

جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر

یا شاید یہ کہ: دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر

بلکہ ایک اور ضرب المثل ہے کہ.... بہر حال، دراصل شخصیت نگاری یوں کی جاتی ہے کہ:

''موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں۔ پھولوں اور قوس قزح سے سخت دلچسپی ہے۔ موسیقی سے الفت۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کے کمروں کا رنگ ہلکا ہے، پردے چمپئی۔ دریچوں میں بنفشہ کے شگوفے پڑے مہکتے ہیں۔

ادیبوں کے بارے میں اس طرح کے مضمون پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ زور سے چیخوں، خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کی ''شخصیت نگاریاں'' اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔

خیر۔ تو عسکری صاحب (یعنی ابن سعید) نے تو بہت شرافت سے کام کیا ہے ورنہ حقیقت حال جو ہے وہ تو ہم ہی پر خوب روشن ہے۔ مثال کے طور پر عسکری نے یہی نہیں لکھا، بلکہ صاف چشم پوشی بھی کی، کہ ہم نہایت شوق وذوق سے رسالہ ''شمع'' پڑھتے ہیں اور یہ بھی کہ جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہو کر مسلسل ایک چڈو خانہ بن جاتا ہے تو گھر میں کیا کیا ہنگامہ رہتا ہے، ماشاء اللہ سے۔ ایک کمرے میں ریڈیو دھاڑ رہا ہے۔ دوسرے میں ایک چھوٹی بھانجی صاحبہ پیانو سے شغل فرما رہی ہیں۔ گیلری میں ''چوہے دوڑ بلی آئی'' کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ

کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھانجی صاحبہ اللہ کے فضل و کرم سے ڈاکٹر ہیں اور ایئر فورس میں فلائیٹ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہیں مگر ان کا یہ عالم ہے کہ ان کو ڈاکٹری کے علاوہ دنیا بھر کی فضولیات اور خرافات سے دلچسپی ہے۔ جدید انگریزی ادب، یونانی آرٹ، ہندو فنون لطیفہ سے شدید انس ہے اور کوکس کی تو آپ عاشق ہیں۔ ٹیل للو اور ٹام ایٹ جیری اور ڈونلڈ ڈک آپ کے پسندیدہ کردار ہیں۔ جب کبھی کوئی ان سے ڈاکٹری کی باتیں کرتا ہے تو دفعتاً یاد آتا ہے کہ ارے یہ تو ڈاکٹر بھی ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا کیونکہ میں ان سب سے علاحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں۔ (انفرادیت وغیرہ ابن سعید نے جو سخت عالمانہ الفاظ استعمال کیے ہیں وہ سب گپ ماری ہے۔) ایک روز ہم حسب معمول گھاس پر بیٹھے (رات کے بارہ کا عمل رہا ہوگا) نہایت اطمینان سے شنکرا کو کیدارا میں منتقل کرنے میں مشغول تھے کہ ایک چھوٹے بھائی نے، جو اب مستقلاً کینیڈا میں رہتا ہے، اچانک یہ انکشاف کیا (جس طرح ایک انگریز مصنف نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا) کہ ساری عمر ہم لوگوں کی اسی Pitch پر گذری ہے۔ (کرکٹ کا Pitch نہیں۔) باوجود یہ کہ ہماری زندگیوں میں تقسیم ہند کے کارن واقعتاً بڑا زبردست انقلاب آچکا ہے اور بہرصورت اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہوگئی ہے۔ ایک چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں: شدید ذہانت اور شدید مزاحی حس۔ فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی خصوصیات، بھی زیادہ لوگوں کے پلے نہیں پڑتیں۔ (یہ انکشاف بھی اسی کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا اور اسی لیے وہ دوسرے لمحے گھاس پر سے اٹھ کر کینیڈا چلا گیا۔)

میری تین عزیز ترین (1) سہیلیاں، جو مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز ہیں اور جن کے ساتھ میں نے بہت بچپنے سے لے کر 1947 عیسوی تک عمر کا ایک لمحہ اکٹھے بتایا تھا، ہندستان میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری سہیلیوں کی ایک بہت بڑی فوج بھی تقریباً ساری کی ساری وطن مرحوم ہی میں رہ گئی۔

سہیلیوں سے قطع نظر ہم سب ماشاء اللہ ہے اٹھارہ انیس فرسٹ کزن ہیں، سیکنڈ تھرڈ فورتھ ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح آٹھویں کزن تک پہنچتا ہے) ان کے علاوہ، خدا نظر بد سے بچائے، ان سب میں جو ہمارا اپنا ایج گروپ ہے وہ اللہ کے فضل سے ایک ہی مدرسہ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ الموڑے میں ہمارے منجھلے چچا جان کا مکان ''بیکٹ ہاؤس'' تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں اس میں مستقل اودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا آیا رہتا۔ شاہجہان پور میں چھوٹے چچا جان کی کوٹھی کے باغ کے پیچھے سے ٹرین گزرتی تھی۔ ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹری پر جا کر پتھر رکھ آتے اور پھر درختوں میں چھپ کر انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹری سے اترے گی۔ بالکل دہشت پسندوں کا گروہ تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر واقعی کبھی ایسا ہو گیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ غالباً سب کو جیل خانے بھیجا جاتا۔

یہ سب بڑے ہوئے تو اے لیجیے، ایک سے ایک عالم فاضل چلا آ رہا ہے۔ دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ کھٹا کھٹ توڑ ڈالے۔ ننھیال میں جو بہن بھائی ہیں ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی میں ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بہت بڑے سیاستدان بن گئے۔

بہت کم کنبوں میں اتنا زیادہ ''قبیلے کا احساس'' ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً وہی تربیت اور وہ مخصوص تہذیبی پس نظر ہے جس کا ذکر میں نے یلدرم کے متعلق مضمون میں کیا ہے۔ ہمارا کنبہ اب بہت دور دور تتر بتر ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں ہیں۔ کچھ لندن میں۔ بہت سے اپنے آبائی وطن ہندستان ہی میں رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے: بھانت بھانت کی جگہوں پر رہے، بھانت بھانت کے انسانوں سے ملے، بھانت بھانت کی مصروفیتیں رہیں، رنگا رنگ مناظر سے پر رہا، اتر پردیس کے ہرے بھرے ضلعے، ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں۔ سب سے پہلی یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے کہ بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں: بمبئی، کلکتہ، جنوبی ہند کی بندرگاہیں، ایران کے ساحل، کربلائے معلی، قاہرہ، ترکی مستقل ادھر گھوم رہے ہیں۔

پہلی کہانی بہ عمر چھ سال لکھی۔ (ہاں صاحب! کیا بات ہے، ہونہار بروا...) کہانی کچھ یوں تھی کہ ''کانٹھ گودام کا اسٹیشن تھا۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لالٹین لیے ادھر ادھر دوڑے پھرتے تھے۔ جگنوؤں کی قطاروں کی طرح ٹرین آتی دکھلائی پڑی۔'' وغیرہ وغیرہ۔ ماشاءاللہ کس قدر شاعرانہ تخیل تھا۔ یعنی غور کیجیے کہ جگنوؤں کی قطاریں۔

پھر مدتوں تک گڑیوں کا بہت سخت سلسلہ رہا۔ گڑیاں ہی گڑیاں۔ ان کے لیے باقاعدہ اسکول کھولا گیا تھا۔ ایک جرمن آیلی نے بہت سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ ''لیڈی ہیلنڈا'' سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آئیڈیا کچھ جچا نہیں مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے۔ عین برات کے وقت جرمن لڑکی جو تھی اس نے کسی بات پر بگڑ کر کہہ دیا کہ بہرحال میرا گڈا خالص جرمن ہے، سیدھا برلن سے آرہا ہے، تمھاری ''لیڈی ہیلنڈا'' گو بلونڈ ہے مگر تمھاری گڑیا ہے، لہٰذا ہندستانی ہے، اس قدر غصہ آیا کہ فوراً برات واپس لوٹا دی گئی۔ عرصے تک شدید اینٹی جرمن جذبات دل میں موجزن رہے۔

اسپورٹس اور ریاضی سے جان نکلتی تھی۔ اسکول اور کالج میں کبھی جو باسکٹ بال کھیل کر دیا ہو۔ فساد کرانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ بیک وقت دونوں پارٹیوں میں شامل ہیں اور فساد کرا رہے ہیں۔ بعد میں خود ہی صلح کرا دی۔ اس وجہ سے کالج کی سیاسیات میں ہم کو بہت ہی اہم مقام حاصل تھا۔

اب یہاں پر یہ عرض کرنا ہے کہ سب سے بڑی ٹریجڈی جو ہوئی وہ یہ تھی کہ اسی مستقل ہنگامے کے چکر میں بغیر سوچے سمجھے جو کہانیاں وغیرہ کالج کے رسالوں کے لیے لکھتے تھے وہ ادبی رسالوں میں چھپوا دیں۔ یہ ایسی ایکٹوٹی ہوئی جسے آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کوئی عقل مند آدمی انگریزی میں کہہ گیا ہے .Literary sins have very long shadows یہ بہت ہی حسب حال مقولہ ہے۔ یعنی یہ کہ اب بیٹھے اس قسم کا روح افزا تبصرہ کن رہے ہیں۔

ایک خاتون ہماری ایک کتاب کی ورق گردانی کر کے نہایت اطمینان سے بولیں۔ 'آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں!' اور اس روز تو مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن

چندر صاحب کی (جن کے میرے دل میں بڑی عزت ہے) یہ رائے پڑھی کہ "میرے بھی صنم خانے" میں سوائے پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اے لیجیے۔ یہاں ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلم بند کی تھی۔ کرشن چندر صاحب نے لے کے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ کیا کیا جائے!

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس "فٹ نوٹ" کا اضافہ کرنے کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ برخود غلط نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر و بیش تر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے۔ جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں۔ ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساس برتری کا شکار ہیں اور یا احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے Complex میں گھرا ہوا ہے۔ Normal کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا اور میں ان لوگوں کو بہت قابل قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقعے پر نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری 'شخصیت' تو بھئی یہ تو ایک بڑا جید قسم کا خوفناک لفظ ہے۔ شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری 'شخصیت'..... یہ کیا مسخرہ پن ہے!

("نقوش" لاہور، شخصیات نمبر، جنوری 1955)

آئینہ خانے میں

جب بھی مجھ سے اپنے بارے میں لکھنے کے لیے کہا جاتا ہے تو مجھے بڑی سخت الجھن اور اس سے زیادہ ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ میں اپنے متعلق کیا کہوں۔ ہر شخص کو اپنے بارے میں بہت خوش فہمیاں ہوتی ہیں۔ اپنی ساری کمزوریوں اور خامیوں کو جانتے ہوئے بھی وہ خود کو دھوکا دینا چاہتا ہو کہ وہ بہت اچھا ہے دوسرے ہی اسے غلط سمجھتے ہیں اور اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ میں نے اپنی صلاحیتوں کے مطابق بہت کوشش کی کہ زندگی کے بھیدوں کو مکمل تخلیق اور تجربوں دوروں اور یگوں اور صدیوں کی حدوں میں باندھ لوں۔ میں نے دلوں، دماغوں اور روحوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ میں نے ان لوگوں کے بارے میں سوچا جنھوں نے زمانہ اور دل کی کسک اور روحانی خلا اور تنہائی اور خوف اور شک وشبہ اور دہشت کے اندرونی مرکز پر خود کو اکیلا پایا۔ لیکن چاروں طرف اندھیرا تھا اور سناٹا اور اس سناٹے میں لاکھوں کروڑوں انسان جیتے اور مرتے رہے۔ میرے ساتھ اور مجھ سے علاحدہ میں نے زمین کا کاروبار نپٹائے بغیر آسمان کی طرف دیکھا اور زندگی کی لامحدودیت نے مجھے ششدر کر دیا۔

یہ ہزاروں بار دہرائی ہوئی بات ہے کہ انسان کے خیالات اور کردار کی تشکیل میں اس کی

پرورش۔ اس کے ذہنی اور شعوری پس منظر اور اس کے گھرانے کا بہت دخل ہوتا ہے۔ میرے والد سید سجاد حیدر یلدرم اردو کے بہت بڑے صاحب طرز ادیب اور اردو افسانہ نگاری کے پیش روؤں میں تھے۔ انھوں نے اردو زبان کو نہ صرف فکری۔ فلسفیانہ اور لطیف ادب ہی دیا بلکہ اس میں حسن کاری کے نئے رنگ ڈھنگ بھی پیدا کیے۔

ترکی سے ان کو محبت تھی۔ بہت سے ترکی ڈرامے اور ناولیں اردو میں ترجمہ کر کے آج سے نصف صدی پہلے انھوں نے اردو کو ترکی اور یورپی خیالات اور طرز اظہار سے روشناس کرایا۔ وہ ادیب کے علاوہ ایک بڑے باکردار اور نیک خصلت شخص تھے۔ اور بہت ہی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ میری والدہ بھی کم وبیش پچاس پچپن برس سے لکھ پڑھ رہی ہیں۔ وہ اپنے زمانہ میں سماجی اور اصلاحی ناول نگار کی حیثیت سے بہت ہی مقبول رہی ہیں۔ وہ گنتی کی ان مسلمان عورتوں میں ہیں جنھوں نے آج سے چالیس سال قبل سب سے پہلے شمالی ہندستان میں پردہ چھوڑ کر قومی اور تعلیمی کاموں میں بڑی لگن سے حصہ لیا۔

والد صاحب کے عزیز اسکول ساتھیوں اور قریبی دوستوں میں وہ لوگ شامل تھے جنھوں نے ملک کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ کو اپنی شخصیتوں سے روشن کیا ان سب کا ذکر میں بچپن سے اپنے گھر میں سنتی آئی تھی۔ ملک کے بہت سے عظیم عالموں، ماہران تعلیم، شاعروں اور ادیبوں کی دھندلی یادیں اب بھی میری یادداشت میں محفوظ ہیں نامور لوگ اور گمنام سیدھے سادھے انسان جگمگاتی ہوئی عظیم شخصیتیں اور خاموش منکسر مزاج مرد اور عورتیں... ان سب کا ہجوم میرے چاروں طرف رہا۔ بچپن میں ذہنی اور عقلی سچائی اور انسان دوستی کی اہمیت میرے والد نے مجھے اچھی طرح ذہن نشین کر دی تھی اس لیے آگے چل کر جب زندگی کے چند بھیانک موڑ میرے سامنے آئے تو میں اپنے آپ سے کسی طرح کا سمجھوتہ نہ کر سکی۔

نوکری کے سلسلے میں ہر تیسرے سال والد صاحب کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ ہوتا رہتا تھا اور ان میں سے بعض مقامات بے حد انوکھے تھے۔ میں علی گڑھ میں پیدا ہوئی اور انڈمان کے ٹاپوؤں میں ہوش سنبھالا۔ چاروں طرف سمندر تھا اور ناریل کے جھنڈ اور عظیم

اور گھبرا سناٹا۔ انڈمان کے ٹاپوؤں کے بعد اتر پردیش کے دور افتادہ مشرقی اضلاع اور خاموش پہاڑی مقامات .....دس بارہ سال کی عمر تک میں نے بہت سے شہر دیکھے۔ کئی سمندری سفر کرے۔ ممالک غیر بھی گئی۔ بچپن کی یادوں کا ایک فانوس ہے جو میری یادداشت میں جھلملاتا رہتا ہے۔

میں اکثر بیمار رہتی تھی یا والدہ صاحبہ کا خیال تھا کہ بیمار رہتی ہوں۔ اس وجہ سے باقاعدہ طور سے اسکول کبھی نہیں گئی۔ بچپن زیادہ تر اکیلے گزارا۔ کیوں کہ میرے اکلوتے بڑے بھائی مجھ سے عمر میں سات سال بڑے ہیں۔ میں دن رات باغ میں آم کے پیڑوں کے نیچے کھیلا کرتی اور کہانیاں بنتی رہتی۔ میری دل پسند کہانی یا دن کا خواب یہ تھا کہ میں ایک بے حد غریب کسان کی لڑکی ہوں۔ (ہمارے مالی کی دس سالہ بیوی رام دئی اس بارے میں میری آدرش تھی۔) اور میں اپنا چھوٹا سا بقچہ سنبھال کر اس کوٹھی میں آئی ہوں اور یہاں نوکر ہو گئی ہوں۔ سب کی نظر بچا کر میں اکثر فرش پر اکڑوں بیٹھ جاتی اور رام دئی کی نقل میں، ایک ہاتھ پر روٹی رکھ کر کھانا کھانے کی کوشش کرتی اور اس کے بعد نیلا ٹیونک پہن کر اپنے کا نونٹ جاتی اور آرش ٹیچر سے پیانو بجانا سیکھتی۔

تبھی سے میں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ پہلی کہانی شاید سات سال کی عمر میں لکھی تھی جو مجھے اب تک یاد ہے کہ اس طرح شروع ہوتی تھی۔ ''رات کے بارہ بجے تھے۔ کاٹھ گودام کے اسٹیشن پر قلی لالٹین لیے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔'' ہیروئن شاید میری گڑیا تھی جو خود ہی ٹکٹ خرید کر پاؤں پاؤں چل کر غلط ٹرین میں بیٹھ گئی تھی۔

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ مجھے سچائی اور ایمان داری کا سبق بہت شدت سے پڑھایا گیا تھا۔ ہمارا خاندان اپنی جاگیردارانہ روایات کے باوجود خاصا دقیانوسی اور مولویت کا رنگ لیے ہوئے تھے۔ یہ لوگ ماڈرن بھی تھے اور پرانی قدروں سے محبت کرنے والے بھی۔ ایمان داری کے سلسلے میں مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا، دہرہ دون میں ہمارے باغ میں بے حد نفیس لیچیاں تھیں۔ والدہ صاحبہ نے منع کر دیا تھا کہ لیچیاں چھونا بھی نہیں کھانسی ہو جائے گی لہذا میں گرمیوں کی سنسان دوپہریا میں سرخ سرخ لیچیوں سے لدے ہوئے پیڑوں کے نیچے اکیلی کھیلا

کرتی اور کبھی یہ خیال بھی نہ آتا کہ ایک لیچی توڑ کر چکھ لوں۔ اس شدید ایمان داری کی وجہ سے بڑی ہو کر مجھے بڑی سخت مصیبتیں اٹھانی پڑیں یہ سیاسی نقطۂ نظر، تصورات، ذاتی تعلقات کے سلسلے میں جہاں کہیں ابن الوقتی، تھوڑی چالاکی، مفاد پرستی اور دھوکہ دھڑی اور کامن سنس (Common Sense) کی ضرورت پڑی وہاں میں ہمیشہ سچ بولنے پر تلی رہی اور نتیجہ میں خوب جوتے کھائے۔

میری دوسری عادت جو شعور آنے پر پکی ہو گئی وہ میرے ذہنی تجزیہ کی تھی۔ جذبات، واقعات، مسائل۔ یعنی ہر چیز کا ذہنی تجزیہ اور اس کا اعلان.... میری اس عادت کو میرے والد خوب سمجھتے تھے اور میرے لیے پریشان رہتے تھے کہ آگے چل کر اس بے حد الجھی ہوئی دنیا میں میرا کیا حشر ہوگا۔ وہ میرے دوست اور سچے مددگار تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھ کر بڑی اونچی اونچی باتوں پر ان سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتی۔ خدا کا تصور سچائی اور حقوق کا اصول نیت واد۔ ملکی سیاست۔ موت اور زندگی... میں ہر چیز پر سوال کر کر کے ان کو پریشان کر دیا کرتی۔ یہ کیوں ہے۔ یہ کیا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے.... وہ رسان سے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے۔

ابھی مجھے زندگی سے مقابلہ کرنے کی عقل بھی نہیں آئی تھی کہ اچانک موت میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اپریل 1943 عیسوی میں میرے والد کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔

1947 میں ہندستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ والد کے انتقال کے بعد یہ میرے لیے دوسرا زبردست ذہنی اور جذباتی حادثہ تھا۔ میں نے افسانے 1944 سے لکھنا شروع کر دیے تھے۔ تقسیم ہند کے صدمہ نے 1947 کے آخیر میں ساڑھے انیس سال کی عمر میں مجھ سے ''میرے بھی صنم خانے'' لکھوائی جو میرا پہلا ناول تھا اور جسے آج بھی اردو کی چند اچھی ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھا اس صدمہ کے زیر اثر لکھا۔ ذہنی جلاوطنی نے مجھے بہت پریشان کیا۔ انیسویں صدی کے ادیبوں کے لیے مسئلہ صرف جمالیاتی تصور کا تھا۔ آج کے ادیبوں کے لیے یہ مسئلہ سیاسی بن چکا ہے۔ سارتر نے ایک جگہ کہا ہے کہ ادیب اس لیے لکھتا ہے کہ تخلیق میں ایک چیز کا رشتہ دوسری چیز سے قائم کر سکے۔ لیکن آج کے دور میں ادیب اور دنیا کے درمیان بہت سی چیزیں دیوار بنا دی گئی ہیں۔ کارل مارکس کا یہ زاویۂ نگاہ ہے کہ انسان سماج کی ایک اکائی

ہے اور وہ اس سے علاحدہ نہیں رہ سکتا اور کافکا کا یہ کہنا ہے کہ انسان بنیادی طور پر اکیلا ہے۔ ان دونوں متضاد نقطۂ ہائے نظر نے سارے جدید ادب کو متاثر کیا ہے۔

لیکن میرے سامنے مسئلہ (Communication) کا تھا۔ میں نے محبت، نفرت، مذہبی کٹر پن اور بے رحمی کے بارے میں بہت غور کیا۔ انسان کی انسان کی جانب بے رحمی۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر.... اجتماعی بے رحمی کے ساتھ تقسیم کا مسئلہ پھر سامنے آ گیا۔ ملک تقسیم کیوں ہوا۔ کیا یہ تقسیم تاریخی حیثیت سے ناگزیر تھی۔ اس سوال نے مجھے فلسفہ تاریخ کی طرف کھینچا۔ اس کا جواب دینے کی کوشش میں ایک ناول ''آگ کا دریا'' لکھا۔ دریا کو زمانہ کا Symbol بنا کر میں نے تین ہزار سال کی پھیلی ہوئی اور الجھی ہوئی ہندستانی تاریخ میں سے ہندستانی شخصیت کی عظمت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی (وقت کے علاوہ الفاظ میرے لیے دوسرا مسئلہ ہیں) انسان عقلی حیثیت سے برابر سفر میں ہے۔ پہلے مجھ میں ایک طرح کا دانشورانہ گھمنڈ تھا۔ اب مجھ میں ایک طرح کی Intellectual Modesty آ گئی ہے۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ میری داخلی اور خارجی شخصیت میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ میری خارجی شخصیت شاید غلط ہے۔ داخلی شخصیت اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے ہمیشہ بے تاب رہتی ہے۔ مگر کچھ نہیں سمجھا پاتی، ہم سب الگ الگ جزیروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف ایک نامعلوم اسرار کا جسے زندگی کہتے ہیں، ایک تاریک، خوف ناک، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ شاید سارتر نے ہی کہا ہے کہ ہر لفظ ہماری اس ہار کا اقرار ہے کہ ہم Communicate نہیں کر سکتے۔

شاید مجھے Romantic سمجھا جائے گا۔ یہ صحیح بھی ہے۔ کیونکہ مجھ میں Classical آدرشوں کی افسوس ناک حد تک کمی ہے۔

لکھنے میں ماحول میرا خاص کردار ہے۔ ان کہے الفاظ ایسے احساسات جن کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ کمرے کی ٹون۔ آسمان کے رنگوں کی کوئی جھلک، کھڑکی کے باہر جھکے ہوئے پیڑ کا ایک پتا، ماحول، حالات، وقت، گھنے جنگل، پہاڑ، ندیاں یہ سب میرے لیے ناٹک میں حصہ لیتے ہیں، خاص طور پر اسی وجہ سے۔ جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقی بنگال نے مجھ پر سحر کر رکھا ہے۔ وہاں کے

گھنے جنگلوں، وہاں کی ندیوں، وہاں کے پہاڑوں میں چھپے ہوئے کسی گھر کی ایک جھلک نے مجھے طرح طرح کی کہانیاں سنائی ہیں۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے میں انھیں بہت زیادہ نہیں سمجھ پائی۔ انسان آسانی سے سمجھ میں آنے والی چیز بھی نہیں۔ اس کا ذہنی تجزیہ میرے لیے ناقابل حصول ثابت ہوا ہے۔ شاید اسی لیے میری کہانیوں میں اچھی کردار نگاری نہیں ہوتی ہر انسان کی شخصیت کے اندر کتنی تہہ در تہہ شخصیتیں ہیں۔ کتنے پہلو، کتنے ان دیکھے اور اجنبی راز ہیں..... میرے لیے مرد اور عورت بعض اوقات ایسی پرچھائیاں ہیں جو میرے سامنے سے گزرتی ہیں۔ میں نہایت خوش ہو کر اپنے آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں انھیں پہچان سکتی ہوں۔ مگر وہ پرچھائیاں سامنے سے نکل جاتی ہیں۔ ان کے کسی ایک رویہ، محبت، یا نفرت کا تجزیہ کر کے میں ان کی سارے چرتر پر کوئی فیصلہ تھوپ نہیں سکتی۔ ہم سب ذاتی طور پر الگ الگ ادھورے سلسلے ہیں۔ اسی وجہ سے زندگی کے زیادہ گہرے تجربات کو ایسے تجربات کو جن کی وجہ سے دل و دماغ اور روح کے پرخچے اڑ جاتے ہیں الفاظ میں ڈھال کر قاری کے سامنے پیش کرنا ناممکن ہے۔ فن کار خود اپنی چتا جلاتا ہے۔ اپنی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ اور ایک دن اسی میں بھسم ہو جاتا ہے۔ اگر اس آگ کی لپٹوں کی ہلکی سی جھلک بھی ادبی تخلیق کی شکل میں دنیا کے سامنے کی جائے تو اسے جلنے والے کی خوش قسمتی کہا جائے۔ حالاں کہ یہ ایسی لمبی چوڑی خوش قسمتی بھی نہیں۔

میں بڑی ہو کر بہت سے پرخلوص دوستوں کے درمیان گھری رہی ہوں اور ان کی وجہ سے میری یادوں کا فانوس تیزی سے جھلملاتا رہا ہے۔ بہت سے دوست ایسے ہیں جن سے برسوں ملاقات نہیں ہوئی اور نہ شاید کبھی ہو، مگر ایسا لگتا ہے، جیسے وہ پاس ہی موجود ہیں اور اکثر یہ بھی محسوس ہوا کہ سچی قربت اور سچی دوستی کی چند گھڑیاں ایسی انوکھی اور غیر حقیقی ہیں کہ شاید زندگی میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ بہت جلد ختم ہو جائیں گی اور کبھی واپس نہ آئیں گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

52 عیسوی میں میرا دوسرا ناول سفینۂ غم دل (جو خاصا بوگس تھا) چھپا تو مجھ سے کسی نے کہا تھا کہ تم اپنے ناولوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی ہو مگر حقیقت میں بچہ کی طرح

خوف زدہ ہو۔

میں نے زندگی کی لامعنویت اور مخول پر جی بھر کے قہقہے بھی لگائے ہیں اور جی بھر کر روئی بھی ہوں۔ مجھے بہت سی خوشیاں بھی ملی ہیں اور بہت سے غم بھی۔ میں خوش ہوتی ہوں تو ساری دنیا کی خوشی میں اپنے آپ کو شامل کر لیتی ہوں لیکن دکھ موت کی طرح ایک ایسا تجربہ ہے کہ جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا، ہم سب اپنی اپنی لاشیں کاندھوں پر اٹھائے گھوم رہے ہیں۔ ہمارے سامنے اپنی اپنی صلیبیں الگ الگ گڑی ہیں اور ہم ان سے برابر کرب پاتے رہتے ہیں۔ الفاظ اس حقیقت کو اپنی گرفت میں کیسے لے سکتے ہیں۔

پچھلے سال میں نے ایک ناول لکھنا شروع کیا۔ میں چودہ برس بعد اپنے گاؤں گئی، جو اتر پردیش میں ترائی کے قریب ہے۔ یہاں ہمارے آبائی محلہ میں تالاب کے کنارے میرے پرکھوں کی بنائی ہوئی حویلی کھڑی تھی جو 1947 عیسوی کے بعد دھیرے دھیرے ڈھا گئی۔ اب اس کے کھنڈر باقی ہیں۔ اس کی اینٹوں میں لمبی لمبی گھاس اگ آئی ہے۔ کیوں کہ اس حویلی کی مرمت کرانے والے سب پاکستان چلے گئے۔ ہمارا خاندانی بھاٹ جو ہمارے یہاں شادیوں کے موقع پر دولہا کا شجرہ سنایا کرتا تھا جو اسے زبانی یاد تھا میرے پاس آ کر رونے لگا۔ ''سب لوگ دوسرے دیش کو سدھار گئے۔ میں اب بھوکوں مر رہا ہوں۔''

کھنڈر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس سے کچھ فاصلہ پر جلاہوں کی ایک بستی تھی۔ یہ جلاہے ہماری رعیت تھے اور ان کو حکم تھا کہ کچے مکانوں میں رہیں اور جوتے اتار کر ہمارے سامنے آئیں۔ اب حویلی کے کھنڈر سے اونچے ان کے پختہ مکان آس پاس کھڑے ہیں اور وہ اپنی شخصیت اور احترام کے احساس کے ساتھ قصبہ میں سر اٹھا کر چلتے ہیں (یہ ''جلاہنیں اب لیڈی ہملٹن کے برقعے سلواتی ہیں''.... ایک خستہ حال رشتہ دار سیدانی بی بی نے جو مشین پر ان کے برقعے سی سی کر اپنی گزر کر رہی ہیں طنزیہ لہجے میں کہا) جلاہوں کے پکے مکان اور ان کی عورتوں کے لیڈی ہملٹن کے برقعے .... یہ وہ خاموش انقلاب ہے جو پچھلے چودہ سال میں ہندستان میں آیا۔ ایک زوال پذیر جاگیردارانہ تہذیب کا سورج ڈوب چکا اور اب ایک نئے یگ کی بنیادیں

رکھی جارہی ہیں۔

اسے صحیح معنوں میں سماج وادی سماج بنانے میں کتنی دیر لگے گی؟ مگر یہ بڑی بات ہے کہ ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ میں نے اس ناول کا نام ''کھنڈر'' سوچا ہے۔ یہ کھنڈر ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا مرثیہ نہیں کیونکہ اسی ملبے پر ایک نئے سماج کی بنیاد رکھی جائے گی لیکن تمام خامیوں کے باوجود مجھے اس تہذیب کے مٹ جانے کا بہت افسوس ہے۔ پرانی قدروں اور ہندو مسلم تہذیبی اتحاد کی علم بردار اردو نام لیوا تھی۔

لیجیے میں نے اتنے صفحات سیاہ کر ڈالے مگر بات وہیں کی وہیں رہی.... اپنے بارے میں کیا لکھوں؟

ساری زندگی کا حاصل صرف چند لفظ!

(ماہنامہ 'کتاب' لکھنؤ، جنوری 1963ء، 'نقش' کراچی، شمارہ 21، فروری 1963ء)

خانم جان کا سفر

افسانہ رنگین سے ڈانسنگ گرل تک

میری درخواست پر جناب عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ازراہ مہربانی سید حسن شاہ کے افسانہ رنگیں (مخطوطہ فارسی۔ ایچ ایل 4132) کے اوّلین صفحات اور آخری اوراق بھجوائے ہیں۔ شروع کے آٹھ صفحات کا ترجمہ نشتر (بھارگوا اسکول بک ڈپو امین آباد، لکھنؤ 1924ء) کے صفحہ ۷ سے شروع ہوا ہے۔ میں نے ''نشتر'' کے پہلے ایڈیشن کے ایک بے حد شکستہ نسخے کا ترجمہ انگریزی میں بعنوان ''ناچ گرل'' کیا تھا۔ یہ غالباً 1893 عیسوی کا ایڈیشن تھا اور مسلم ایجنسی لکھنؤ سے چھپا تھا۔

ناچ گرل کے پروف پریس سے آچکے تھے۔ جب ''شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان'' مؤلفہ مشرف احمد (ادارہ ادبیات پاکستان کراچی 1977ء) موصول ہوئی جو جناب مشفق خواجہ نے ازراہ کرم بھجوائی تھی[1]۔ چنانچہ آخری نوٹس میں اس کے متعلق چند سطور کا اضافہ کر سکی۔ بہت افسوس ہوا کیونکہ ناچ گرل کے لیے تمام تر ریسرچ میں نے خود ہی کی تھی جو مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ پروفیسر اقتدار عالم خان کا مضمون بھی بعد میں ملا۔ اور اس کے متعلق ایک فٹ نوٹ کا پروف

میں اضافہ کیا۔ بعد میں چودھری محمد نعیم سے معلوم ہوا کہ عشرت رحمانی نے بھی ''نشتر'' کا ایک ایڈیشن مع تدوین اور مقدمے کے لاہور سے شایع کیا تھا۔

شاہ حسین حقیقت کے نگڑ پوتے میجر جنرل شاہد حامد نے خاندانی دستاویزیں اور سارا مٹیریل اس کتاب کے لیے مولف جناب مشرف احمد کو فراہم کیا۔ شاہ حسین حقیقت حسن شاہ کے منجھلے بھائی تھے جن کا کئی جگہ مصنف نے اپنے ناول میں تذکرہ کیا ہے۔ چھوٹے بھائی قاسم شاہ کا ذکر بھی موجود ہے۔ شجرہ اس طرح ہے۔

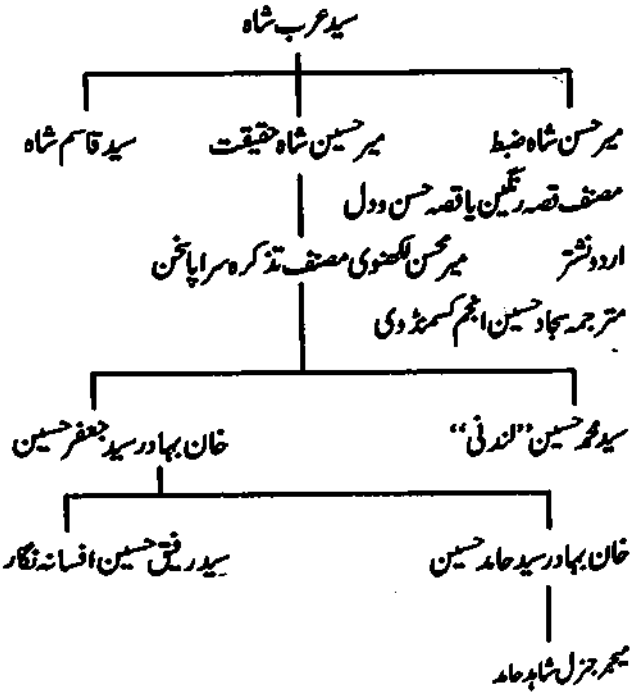

''فسانۂ رنگین'' عرف نشتر ایک سوانحی ناول ہے۔ خانم جان کے انتقال کے بعد دل گرفتہ محسن مصنف کان پور واپس چلا جاتا ہے۔ کہانی یہاں ختم ہوتی ہے۔ بعد کے حالات اس کتاب سے معلوم ہوئے جن کا غالباً مترجم انجم کسمنڈوی کو بھی علم نہیں تھا۔ انھوں نے ''نشتر'' (اوّلین

ایڈیشن) کے صفحہ 153 میں فٹ نوٹ لکھا ہے۔ ''مجھے بہ تحقیق معلوم ہوا ہے کہ حسن شاہ بعد اس واقعے کے مدت تک بہ حیطۂ حیات رہے اور شادی بھی کی۔ اولاد بھی ہوئی جو اب تک لکھنؤ میں ہے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ شاہ حسین حقیقت کی سوانح حیات میں جوان کے گھرانے کے مستند حالات پر مبنی ہے یہ درج ہے کہ حسن شاہ مجرد رہے اور فقیری لے لی۔ کسمنڈوی نے جو زیادہ تر حیدرآباد دکن میں مقیم تھے حسین شاہ حقیقت کی اولاد کو اخلاف حسن شاہ سمجھا ہو۔

488 صفحات پر مشتمل مشرف احمد کی کتاب ادبی تحقیق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور انھوں نے حسن شاہ، حسین شاہ اور محسن لکھنوی کی تصانیف پر بالتفصیل بحث کی ہے۔

منگ کے کلکتہ جانے کے بعد دونوں بھائی پھر لکھنؤ آ گئے جہاں ان کی ننہال تھی۔ یہاں انھوں نے جرأت کی شاگردی اختیار کی۔ بڑے بھائی کے انگریزوں سے مراسم کی بنا پر حقیقت کو پہلے بیلی گارد میں میر منشی کی ملازمت ملی پھر وہ کرنل کڈ کے میر منشی ہو کر مدراس چلے گئے۔ 1834 عیسوی کے لگ بھگ وفات پائی۔ اس وقت تک حسن شاہ زندہ تھے۔

حقیقت کی ''داستان جذب عشق'' نظم اور مقفیٰ نثر کا امتزاج ہے۔ اس کی کہانی بھی ''فسانہ رنگیں'' کی طرح عصری سوسائٹی کی رومانی تصویر کشی ہے۔ اس کہانی کے خاندان کی مخالفت کی وجہ سے دونوں خودکشی کر لیتے ہیں۔ ''جذب عشق'' 1797 عیسوی میں بھی فورٹ ولیم کالج کی طلسمی داستان سے پہلے لکھی گئی۔ اس کا ایک مخطوطہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں موجود تھا اور انجمن ترقی اردو نے شایع بھی کر لیا ہے۔ حقیقت کی دوسری تصانیف میں ہشت گلزار، ہیرامن طوطا، خزینۃ الامثال، دیوان حقیقت وغیرہ شامل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خانوادۂ میر کلالؒ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہ لوگ اپنے نام کے ساتھ شاہ لکھتے تھے۔ بعد میں لقب ترک کر دیا گیا۔

میر محسن لکھنوی مصنف ''تذکرہ سراپا سخن'' حقیقت کے بیٹے اور سید محمد حسین جنھوں نے لندن جا کر انجینئرنگ پڑھی میر محسن کے فرزند تھے۔ مشہور ماہر تعمیرات خان بہادر جعفر حسین میر محسن لکھنوی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کو مرزا نے اپنے ناول ''شریف زادہ'' کا ہیرو بنایا۔ ان کا

انتقال 1936 عیسوی میں ہوا۔ ان کے فرزند خان بہادر حامد حسین نامی گرامی انجینئر تھے۔ (وفات 1945 عیسوی)۔ منفرد افسانہ نگار سید رفیق حسین سید حامد (2) کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ انجینئروں اور شکاریوں کا خاندان تھا۔ ظفر عمر (3) مصنف ''نیلی چھتری'' جنھوں نے اردو میں سب سے پہلے سراغ رسانی کے ناول لکھے، خان بہادر مرزا جعفر حسین کے داماد اور سید حامد حسین کے بہنوئی تھے۔ اردو کی ممتاز ناول نگار الطاف فاطمہ بھی سید جعفر حسین کی دوسری بیٹی کی صاحبزادی ہیں، 1947 عیسوی تک الطاف فاطمہ کا کنبہ لکھنؤ میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی کوٹھی کے پڑوسی میں دین دیال روڈ پر رہتا تھا۔

اب کچھ زیر نظر مخطوطے کے بارے میں:

جس قلمی نسخے (کتبہ 49۔1848 عیسوی) کا ذکر پروفیسر اقتدار عالم خان نے کیا ہے جو قاضی محمد سعید صاحب پٹنہ کی ملکیت تھی۔ ممکن ہے یہ خدا بخش لائبریری والا نسخہ وہی رہا ہو۔ مخطوطے بعہد واجد علی شاہ بادشاہ 1269 ہجری میں کتاب مصنف سے نقل کیا تو کیا حسن شاہ کا یہ ناول ان کی حیات میں یا اس کے بعد کتابی صورت میں قلم بند ہو چکا تھا؟ لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر کے عہد میں پرنٹنگ پریس قائم ہو گئے تھے۔ کیا یہ کتاب چھپ گئی تھی اور اس کی نقل کی گئی؟ مترجم کسمنڈوی اپنے دیباچے میں لفظ ''کتاب'' ہی لکھتے ہیں۔ ''جن حضرات نے اصل کتاب دیکھی ہے وہ اس ترجمے کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔'' یعنی وہ مطلوبہ کتاب یا قلمی نسخہ بالکل غیر معروف نہیں تھا بلکہ متعدد قارئین کی نظر سے گزر چکا تھا۔ بہر حال ہمیں ان سوالات کا جواب نہیں ملتا نہ مترجم نے یہ بتلانے کی ضرورت سمجھی کہ ان کو یہ کتاب یا مخطوطہ کہاں سے ملا۔

پہلا ایڈیشن (جو مسلم ایجنسی مسلم پرنٹنگ ہاؤس امین آباد لکھنؤ میں غالباً 1899 عیسوی میں طبع ہوا) اس میں ''مسٹر منگ صاحب'' لکھا ہے۔ 1924 عیسوی کے بھارگوا بک ڈپو والے ایڈیشن میں پورا نام ہنری منگ موجود ہے لیکن منگ کے ماموں جنرل کوٹ جن کا نام پرانے ایڈیشن میں صحیح چھپا تھا 1924 عیسوی میں کاتب نے ان کو کورٹ بنا دیا۔ منگ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کے کمانڈر ان چیف جنرل کوٹ کی طرح ناول کے بیش تر کردار حقیقی اور تاریخی ہیں۔

پروفیسر اقتدار عالم کا یہ قیاس بھی صحیح ہے کہ ہولیئر کتابت کی غلطی ہے۔ یہ دراصل عہد شجاع الدولہ کا مشہور فرانسیسی نژاد مرغ باز پولیئر رہا ہوگا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ کلن صاحب وہی کلن کی لاٹ والے میجر کولنز ہیں۔ فوجی انگریزوں کا قدیم قبرستان گولہ گنج کے نزدیک اب گنجان محلہ ہے۔ لوگوں نے قبروں پر گھر بنا لیے ہیں لیکن کلن کی لاٹ ابھی باقی ہے۔

حکیم شفائی اور مصنف کے نانا حکیم میر محمد نواز کا ذکر کئی کتابوں میں ملتا ہے۔ مولوی اطاعت رسول بھی بہت جانا پہچانا سا نام ہے۔ کشمیری طائفوں کے متعلق میں تفصیل سے ''ناچ گرل'' کے مقدمے میں لکھ چکی ہوں۔ ہندستانی ''بیبیاں'' رکھنا جان کمپنی کے انگریزوں کا عام دستور تھا۔ ''بی بی یعنی اہلیہ صاحب موصوف کہ دختر یک افغان فرخ آباد بود.....'' کے واقعے کے ساتھ ہی یہ قصہ شروع ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ فرخ آباد میں بھی جان کمپنی کی چھاؤنی قائم ہو چکی تھی، کان پور اور چنار گڑھ دوسرے انگریزی فوجی مقامات تھے جو اس کہانی کے جائے وقوع ہیں۔ میرا یہ بھی قیاس ہے کہ چونکہ انگلش چھاؤنی پہلے بھیم کے اکھاڑے کے علاقے میں بنی تھی اسی وجہ سے خانم جان کا کنبہ بحیثیت Camp followers وہیں آن کر اترا۔

بقول پروفیسر سیول اسپیر اواخر اٹھارھویں صدی کے انگریز افسر انڈین ناچ اس سنجیدگی سے ملاحظہ کرتے تھے جس طرح یورپ اور برطانیہ میں اوپیرا دیکھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ابھی حاکم ومحکوم کی تفریق نہیں ہوئی تھی (گو اودھ پر برطانوی تسلط قائم ہو چکا تھا) لہٰذا خانم جان مجرے کے فرنگی حاضرین کو سفید کوے پکار کر ان کا مذاق اڑاتی ہے اور وہ برا نہیں مانتے۔

''نشتر'' فارسی متن کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے۔ لیکن کمسنڈوی خود بتاتے ہیں کہ بہت سی غزلیں انھوں نے حذف کر دیں۔ انھوں نے بے شمار اپنی طرف سے بھی شامل کر دیے جو اس دور کے اکثر مترجمین کا دستور تھا۔ کیونکہ ترجمے کا فن بھی اتنا Sophisticated نہیں ہوا تھا کہ اس قسم کی باریکیوں کا خیال رکھا جائے۔

پریم چند تک مکالمے ڈرامے کے انداز میں لکھے گئے۔ یہ انداز ڈینل ڈیفو کے بعد سے

انگریزی میں ترک کر دیا گیا تھا۔ 1790 عیسوی میں حسن شاہ نے بہ عمر اکیس سال یہ ناول لکھا۔ ہم اسے برجستہ مکالمہ نویسی، پلاٹ کی تعمیر اور کردار سازی کی بنا پر ایک جدید ناول کہہ سکتے ہیں۔ اس کے دس سال بعد فورٹ ولیم کالج میں دقیانوسی داستانیں قلم بند کی گئیں۔ مزید برآں یہ ''افسانہ رنگیں'' جین آسٹن کے پہلے ناول سے چھ سات سال قبل لکھ گیا۔ حسن شاہ کو انگریزی تعلیم کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انگریز خود اردو اور فارسی پڑھتے تھے۔ انگریزی ناول بھی اس وقت ایک ترقی یافتہ صنف نہیں بنی تھی کسی ناول کا ترجمہ اردو میں ہونا تو دور کی بات ہے۔ لہٰذا حسن شاہ نے محض اپنی جولانی طبع اور تخلیقی صلاحیت کی بنا پر اپنی داستان الم کو افسانوی انداز میں قلم بند کیا۔ اس میں جھول بھی ہیں۔ عبارت آرائی بھی بعض جگہ حد سے زیادہ ہے، یہ عصری تقاضا تھا۔ مجموعی طور پر یہ بیسیوں کا پرانے فیشن کا ناول معلوم ہوتا ہے۔

ہم اپنے احساس کمتری کی بنا پر تلے ہوئے ہیں کہ اردو ناول کی اولا د ثابت کریں۔ ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن 13 نومبر 1992 عیسوی میں راقم الحروف کے ترجمے ''ناچ گرل'' (4) پر مفصل تبصرہ The Novel's Indian Ancestors کے عنوان سے شایع ہوا تھا جس میں تبصرہ نگار عامر حسین نے ویسٹرن ناول پر مشرقی افسانہ طرازی کی تکنیک کے اثرات پر گفتگو کی (اس کا یہ مطلب نہیں کہ میر حسن شاہ نے بھی مغربی ناول کو متاثر کیا۔ ان کی بے چاری تصنیف تو اپنے وطن ہی میں گم نام اور لاوارث رہی۔) میں یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ ہم اپنی ادبی نظریہ سازی میں لکیر کے فقیر نہ بنے رہیں تو کوئی حرج نہ ہوگا۔ مزید برآں سنجیدہ ادبی معاملات میں اپنی بات کی لاج رکھنے کی کوشش یا ہٹ دھرمی اہل دانش کو زیب نہیں دیتی۔ بچکانہ چیز ہے۔ پریم چند کی پہلی کہانی کب چھپی ''زمانہ'' کان پور کے دستاویزی ثبوت کے باوجود یہ مسئلہ بھی اس ہٹ دھرمی کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ ایک علاحدہ بحث ہے۔

(سہ ماہی 'جامعہ'، ستمبر 1994)

حواشی:

1. اس کتاب میں مشفق خواجہ کا دیباچہ بھی شامل ہے۔
2. سید حامد حسین کی بڑی بیٹی جمیلہ شوکت عمر تھیں۔ ایک بیٹی سعیدہ کی شادی قاضی محمد عیسیٰ بلوچستان کے مسلم لیگ لیڈر سے ہوئی چھوٹی عزیزہ حامد ازابلا تھوبرن کالج میں راقم الحروف سے سینئر تھیں۔ ان کے بھائی سید شاہد حامد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل آفیسر ڈاکٹر عطاءاللہ بٹ کی صاحبزادی طاہرہ سے شادی کی۔ (بیگم آمنہ مجید ملک اور نگین والدہ سلمان رشدی طاہرہ کی دوسری بہنیں ہیں)۔ سید حامد حسین کی ایک کوٹھی جو یونیورسٹی روڈ پر تھی اس میں لیڈی کیلاش ہوسٹل بنا۔ دوسری فیروز کوٹھی کہلاتی تھی۔ کٹر مسلم لیگی خاندان تھا۔ 1947ء میں سب پاکستان چلے گئے۔
3. چچا ظفر عمر والد مرحوم کے کالج فیلو اور بے حد عزیز دوست تھے۔ مجھے دھندلے سے یاد ہیں، نامور پولس افسر تھے، لکڑی کی ٹانگ لگاتے تھے۔ انھوں نے سلطانہ ڈاکو کو پکڑا تھا۔ بنت نذر الباقر اور یلدرم کی مناکحت کے سلسلہ جنبانی کے دوران لوگوں نے اڑا دیا تھا کہ لڑکی نابینا ہے۔ چنانچہ موصوف بھیس بدل کر ''لڑکی'' کو دیکھ بھی آئے تھے۔ 1947 عیسوی کے بعد یہ سب بھی لاہور چلے گئے۔ بڑے بیٹے شوکت عمر اور بہو جمیلہ دونوں جواں مرگ تھے۔ زاہد عمر جن کی شادی خدیجہ منہاج (سلطانہ سردار جعفری کی بہن) سے ہوئی وہ بھی اللہ کو پیارے ہوئے چھوٹے بیٹے خلیل عمر کے لڑکے کی شادی راقم الحروف کے خاندان میں ہوئی ہے۔ بیٹی حمیدہ باجی یعنی بیگم اختر حسین رائے پوری کراچی میں رہتی ہیں۔
4. ''ناچ گرل'' کا امریکن ایڈیشن بہ عنوان ''ڈانسنگ گرل'' نیو ڈائرکٹر کشنز نیویارک نے شایع کیا۔

خانم جان کی توبہ

جب سے عالم بالا میں (نیک لڑکی تھی کسی اچھی جگہ پر ہی ہوگی) خانم جان کو اس عجیب وغریب مباحثے کی خبر ملی ہے وہ بندی توبہ استغفار میں مشغول ہے۔ دوسو سال بعد گڑے مردے اکھیڑنے والوں کو ذرا خوف خدا نہیں، پہلے ان دونوں میاں بی بی کے وجود ہی سے منکر رہے۔ پھر کہا گیا حسن شاہ بالکل تھے، بے حد تھے مگر خانم جان کی وفات کے بعد دوسرے شادی نہ کی۔ اے لیجیے اب ان کی آل اولاد کا شجرہ بھی نکل آیا۔

مردہ بدست زندہ۔

حسن شاہ ہمیشہ کے رقیق القلب۔ افلاک سے ان کے نالوں کی آواز بھی آرہی ہے۔

کس واسطے کہ اس کرۂ آب وگل کے شہر لندھن میں رہنے والے چند کیلکٹا لفٹسٹ انگلیچوئیل فرینڈز (یوں تو ہر بنگالی انگلیچوئیل ہوتا ہے) راقم ایں سطور سے ناخوش ہیں کہ ہندستان کے پہلے ناول نگار بنکم چندر تھے۔ یہ حسن شاہ کہاں سے ٹپک پڑے اور کیا بیچتے تھے۔

مزید برآں پرشین ایک فارن لینگویج ہے۔ اس میں لکھا ہوا ناول انڈین ناول کیسے کہلا سکتا ہے۔

کامریڈز۔ فارسی اس وقت ایسی ہی انڈین لینگویج تھی جیسی آج انگریزی ہے۔ جسے ساہتیہ اکادمی نے بھی ایک دیسی زبان کا درجہ دے دیا ہے۔

میں نے اپنے مضمون مطبوعہ جامعہ میں لکھا تھا۔ ''تاوقتیکہ کسی دوسری ہندستانی زبان میں ''قصہ رنگین'' سے قبل کا لکھا ہوا ناول دریافت نہ ہو جائے یہ نہ محض ہندستان کا بلکہ غالباً فارسی کا بھی پہلا ناول ہے۔ کیونکہ ایران میں عرصہ دراز کے بعد جدید فارم کے ناول لکھے گئے۔'' کاتب نے یہ پورا جملہ حذف کر دیا اور ماہر تعمیرات کو ماہر تعلیمات، چنار گڑھ کو چندر گڑھ اور برہمن لڑکی کو ہریجن لڑکی بنایا۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی جس مردم خیز قصبے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں کے حاذق طبیب مستورات کی کلائی پر بندھے دھاگے کے ذریعے نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا کمال یہ ہے کہ دھاگے کے بغیر ہی ''ناچ گرل'' کی تشخیص کر ڈالی۔ قاعدہ ہے کہ زیر تبصرہ کتاب کا نام، تعداد صفحات، قیمت، ناشر کا پتہ وغیرہ آغاز میں دیا جاتا ہے۔ سوغات نمبر 5 میں شائع شدہ صدیقی اور سرمست صاحبان کے مضامین ان تفصیلات سے عاری ہیں۔

دراصل صدیقی صاحب کے مضمون کا محرک وہ لیکچر تھا جو میں نے 92 عیسوی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ''ناچ گرل'' کے متعلق دیا تھا۔ وقتاً فوقتاً میں لندن، امریکہ کے علاوہ یورپ کے مختلف شہروں کے ادبی جلسوں میں یورپین حاضرین کو اپنے لیکچرز کے دوران اس کتاب کے متعلق بتلا چکی تھی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ والے لیکچر کے حاضرین جلسہ میں ڈاکٹر صدیقی شامل تھے۔ موصوف ایک مرنجان مرنج نیک آدمی ہیں لیکن اس وقت ان کو غصہ آ گیا۔ اور لیکچر کے اختتام کے فوراً بعد انھوں نے گرج کر فرمایا عینی آپا گمراہ کر رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ وہی سب باتیں جو انھوں نے اپنے مضامین میں قلم بند کیں۔ بعد میں انھوں نے ایک صاحب سے کہا کہ وہ ''ناچ گرل'' کا دیباچہ Xerox کروا کے پروفیسر سرمست کو حیدرآباد بھجوا دیں۔ اگر انہوں نے کتاب پڑھی ہوتی تو وہ اس کے Afterword اور ضمیمہ جات کی نقل بھی بھجوانے کی فرمائش کرتے۔ چنانچہ ڈاکٹر سرمست نے بھی میرے ''چاندنی بیگم کی واپسی'' میں شامل ''نشتر'' کے تذکرے اور ''ناچ

گرل'' کے پیش لفظ کی بنیاد پر ہی اپنے اعتراضات کیے ہیں۔[1] اب صدیقی صاحب نے جامعہ والے مضمون کے جواب میں دوسرا مقالہ تحریر فرمایا ہے[2]۔ اس سے میرا قیاس یقین میں تبدیل ہوگیا ہے کہ بے چاری ''ناچ گرل'' اب تک ان کی باصرہ نوازی سے محروم رہی ہے، کیونکہ فرماتے ہیں کہ میں نے ڈانسنگ گرل کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے، عرض ہے کہ ڈانسنگ گرل کے سرورق کی جو تصویر انھوں نے جامعہ میں دیکھی وہ امریکن ایڈیشن ہے جو یہاں دستیاب نہیں ہوسکتا۔ ناچ گرل جان کمپنی کے انگریزوں کی اصطلاح تھی جس سے امریکن ناواقف ہیں۔ لہٰذا اسے بدل کر انھوں نے ڈانسنگ گرل کر دیا ہے۔ مزید ارشاد ہوا کہ میں نے محض ایک فٹ نوٹ کا ذکر کیا ہے، باقی فٹ نوٹ نظر انداز کیے۔ عرض ہے کہ ''ناچ گرل'' میں اردو مترجم کے نہ محض سارے فٹ نوٹ ہیں بلکہ ان کے متعلق کتاب کے آخر میں مزید تشریحات بھی موجود ہیں۔

اس مضمون میں صدیقی صاحب محض اس ''پس نوشت'' کا حوالہ دیتے ہیں جو سیدہ حمید کے تبصرے (سنڈے ٹائمز نئی دہلی) کے اردو ترجمے میں شامل تھا۔[3]

پروفیسر صدیقی سوال کرتے ہیں کہ جب ''نشتر'' کے اتنے ثابت وسالم نسخے موجود تھے تو میں نے ایک شکستہ نسخہ کیوں منتخب کیا۔ بھئی جو کتاب مجھے دستیاب ہوئی اور مجھے بے حد اہم معلوم ہوئی میں نے فوراً اس کا ترجمہ کر ڈالا۔ یہ 1982 عیسوی کی بات ہے۔ عدیم الفرصتی کی وجہ سے ساتھ آٹھ برس تک مسودہ پڑا رہا۔ اتفاقیہ وہ دوبارہ مجھے اپنے کاغذات کے انبار میں دکھلائی دے گیا اور میں نے ریسرچ کرنے کے بعد اسے چھپوایا۔ اس نسخے میں دیباچہ کے پہلے صفحے کا وہ کونہ غائب تھا جس پر مترجم نے لکھا ہے کہ یہ قلمی کتاب ان کے پاس تھی۔ ذاتی طور پر مجھے تو اس کتاب کی ایک بے حد غیر اہم تفصیل بھی دلچسپ لگی کہ سید عرب شاہ کے ایک بھائی سرکار نجیب الدولہ سے وابستہ تھے اور دھام پور میں مقیم تھے۔ دھام پور نہٹور سے سات میل دور ایک تحصیل ہے۔ روہیلہ سرداران نجیب آباد ہمارے ایک بزرگ کے مرید تھے اور ہمارے گورستان سے متصل ان بزرگوں کے چھوٹے سے مقبرے کے احاطے میں ایک سرسبز گھنے درخت کے نیچے ان کے مزار موجود ہیں۔ میں آنکھ بند کر کے اس زمانے کا تصور کر سکتی ہوں۔ سیاسی انتشار کا یہ وہی ہولناک

دور تھا جب امیر خاں اور ان کے پنڈاریوں نے سادات نہٹور کو تاراج کیا اور وسیع پیمانے پر افاغنہ روہیلکھنڈ کے تسلط کا خاتمہ ہوا۔

آنولہ بریلی دربار ٹوٹا۔[9] اور حکیم میر نواز کو بریلی سے کان پور آ کر فاتحین کی ملازمت کرنا پڑی۔ جو قصہ رنگین کا نقطہ آغاز ہے۔ (منگ کے ہم وطنوں نے 1774 عیسوی میں حافظ رحمت خان کو شہید کیا۔ منگ کے ماموں جنرل آئرکوٹ نے حیدر علی کو جنوب میں شکست دی)

تاریخ اودھ روہیل کھنڈ کی ایک بہت ہی معمولی تفصیل کہ قلعہ محمود پور میں سجاع الدولہ کا ایک رسالہ تعینات رہا، میرے لیے بہت اہم ہے۔ تاریخ سے میرا رابطہ بہت ہی ذاتی نوعیت کا ہے۔ ٹوکیو میں اجنٹا اسٹائل فریسکو دیکھے تو اس اجنبی ماحول میں بہت اپنے لگے۔ ٹیکسلا اور سانچی کی سنگی تصاویر اور بدھسٹ سری لنکا کے تامل مندروں سے میں مذہبی یا روحانی طور پر نہیں بلکہ عمرانی اور تہذیبی سطح پر بخوبی Relate کر سکتی ہوں۔

ماسکو سے باہر ایک جنگل میں ایک Functioning گریک اور تھوڈوکس کلیسا کے اندر گئی۔ اس وقت وہاں ایک غریب روسی ضعیفہ کے خستہ حال رشتے دار نماز جنازہ ادا کرنے میں مصروف تھے۔ 1869 عیسوی کے اس شدید الحاد پرست معاشرے میں یہ دلدوز منظر اور یسوع مسیح کے آئیکن دکھلائی دیے تو ان سے بڑی قربت محسوس کی۔ انڈو مسلم اور عالمی مسلم تہذیب کے آثار راقمہ کی سائکی کے Chords کے لیے گویا مضراب سی بن جاتے ہیں۔ خواہ وہ ترکستان کی نقشبندیہ خانقاہیں ہوں یا آذربائیجان کے شیروان شاہی کتبات۔ 1974 عیسوی میں (سابق سوویت) جارجیا کے ایک میڈیول کلیسا کے الطار کے عین نیچے ایک عربی کتبہ دریافت کیا۔ تعجب ہوا۔ شاید وہ خلافت عباسیہ کے کسی عرب گورنر کا مزار تھا۔ کتبے کی عبارت آدھی مٹ چکی تھی۔ عراق کے قومی شاعر عبدالرازق سے اسے Decipher کروایا۔ دل دوز عبارت تھی پھر بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس کی تربیت تھی۔

اب پوچھیے دنیا میں اتنی ثابت وسالم الواح کی کوئی کمی ہے جو آپ نے گرجستان کے گرجا کا شکستہ کتبہ چنا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل تحسین نے 1775 عیسوی اور مہر چند کھتری نے 89-1788 عیسوی میں داستانیں ان انگریزوں کی ''ہدایت اور مشورے'' سے لکھیں جن سے وہ وابستہ تھے اور جن سے ان کے شاگرد اردو نثر سیکھنا چاہتے تھے۔ انگریزوں اور منشیوں کے مابین دوستی اور برابری کے تعلقات قائم ہو جاتے تھے۔ حاکم اور محکوم کی تفریق 1858 عیسوی میں برٹش راج کے قیام کے بعد باضابطہ شروع ہوئی۔ گو حصول دیوانی کے بعد اس کی داغ بیل لارڈ کارنوالس نے ڈال دی تھی۔ پروفیسر پرسیول اسپیر[5] اور ہوبسن جوبسن دونوں کے ہاں انگریزوں اور منشیوں کی دوستی کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہی یگانگت اور بے تکلفی ہمیں منگ اور حسن شاہ کے درمیان نظر آتی ہے۔ گو نوعمر منشی کی ڈیوٹی کے سلسلے میں منگ بہت سخت گیر تھا۔

حسن شاہ اس روداد کو قصہ کہتا ہے کہ لفظ ناول ابھی اس کی کلچر میں داخل نہیں ہوا تھا۔ ناول یا Novella تو ہم کہہ رہے ہے۔

داستانیں بے شک عصری تہذیب اور تاریخی کوائف کی نشان دہی کرتی ہیں لیکن وہ Allegory کے دبیز پردے میں ملفوف ہیں۔

جدید شارٹ اسٹوری جس کا جنم اوائل انیسویں صدی میں امریکہ میں ہوا۔ اردو میں شارٹ اسٹوری کے لیے قصہ ''زمانہ'' کان پور اور دوسرے رسالوں میں ہمارے اپنے دور تک استعمال ہوتا رہا۔ ناول کو افسانہ کہا جاتا تھا۔ ''فسانہ آزاد'' کے علاوہ دکن سے ایک رسالہ افسانہ نکلتا تھا جس میں ناول سلسلے وار شایع کیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر شائستہ سہروردی اکرام اللہ نے اردو ناول پر اپنے مقالے میں جس پر انھوں نے لندن یونیورسیٹی 1940 عیسوی میں ڈاکٹریٹ حاصل کیا، لکھا ہے کہ شارٹ اسٹوری المعروف بہ قصہ کے لیے پہلی بار یلدرم نے لفظ افسانہ استعمال کیا۔

اس کہانی کی داخلی تاریخی منطق اتنی مضبوط ہے کہ اسے فرضی تصور کرنا ناقدین کا ایک محیر العقول کارنامہ ہے۔ جان کمپنی کی لوٹ کھسوٹ کا دور تھا۔ کمپنی کی ساکھ گر رہی تھی۔ مہاجنوں سے قرض لے کر تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں۔ چنانچہ جب رجمنٹ کا تبادلہ پورب کا ہوتا ہے، منگ کے حکم پر حسن شاہ کو قرض خواہوں سے نبٹنے کے لیے کانپور میں رکنا پڑتا ہے اور وہ بروقت خانم

جان تک نہیں پہنچ پایا۔ ذرا سا کومن سنس یعنی عقل سلیم استعمال کیجیے تو کسی طرح اس قصے کو فارسی مخطوطے کی نایابی کی صورت میں بھی انجم کسمنڈوی کی طبع زاد تخلیق یا ادب فارسی قصے کی محض بنیاد پر لکھا ہوا ناول تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس خودنوشت کو مصنف روایتی داستان کے انداز میں شروع کرتا ہے۔ نادانستہ اور برجستہ ناول کا فارم اختیار کر لیتا ہے۔ صدیقی صاحب فرماتے ہیں مکالمے ناول کے انداز کے نہیں ہیں تو ناول کے مکالمے اور کس طرح کے ہوتے ہیں بھئی؟

امریکہ کے Kirkus Reviews نے لکھا ہے:

The first known modern Indian novel, now abridged and translated into English, is a beguiling tale of love and life under the more tolerant British Raj of the 18th century.

Written in 1790 in a strikingly realistic form that emphasizes dialogue over action, the largely autobiographical tale is narrated by Hasan Shah,a descendant of a famous Mogul family who's now employed as clerk to a British officer and Member of Council at Cawnpore. Reflecting the more relaxed customs of the period, when the British often adopted the local culture, Hasan's employer, locally known as Ming Saheb, "belongs to the breed of large-hearted, bold and adventurous Englishmen" and puts Hasan "Solely in charge of his business." It's a charge that, includes arranging performances of his dancing girls, the famous nautch girls, and

providing a mistress. And it is the arrival of these dancing girls, a class famous as much for their beauty and talent as for their availability as courteasans , that occasions the tragic romance of Hasan's life. While riding out on business,he is invited to meet the recently arrived troupe, and is instantly smitten with the beautiful but feisty khanum Jan , who has vowed never to be a courtesan, Ming Saheb is persuaded to declare their passion, and eventually marry, also secretly. But their love is doomed, the army is ordered to leave cawnpore; and, though Hasan arranges to meet Khanum downriver and take her away as his wife, he is fatally delayed by his official commitments. Khanum falls ill and dies,and the grieving Hasan, affirming that "Love is superior in honor and unique in contentment" will never forget her.

A charming and agreeably accessible portrait of a unique culture in a lyrically realized period setting . as well as an affecting love story. A multicultural plus."

امریکن پبلشنگ ٹریڈ کے ایک رسالے "بک لسٹ" نے لکھا:

The 200- year old autobiographical

romance has something many contemporary romance, with their graphically presented sex and, often, violence, lack. an authentic sweetness of heart that charms with its directness and simplicity. Set in India in the 1780s and written in 1790, this tale of flirtation, love, and secret also the beginning of an era --- Britain's colonial rule in India. and the intermingiing of two very different cultures. Shah aide-de-camp to British officer of the East India Company posted in Oudh in northern India, falls in love with beautiful and talented Khanum Jan, a dancer of the courtesan caste,one of a troupe of camp followers and entertainers. The young man mingles with troupe members while they are employed by the officer for a year and encamped on his grounds. When they are dismissed upon the officer's transfer, the lovers separate, with tragic consequence. This story for the modem Indian novel, seems surprisingly timely,compellingly fresh. --- Whitney Scottt.

ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن کے تبصرے کا ضمناً تذکرہ پچھلے مضمون میں کر چکی ہوں۔
نیویارک ٹائمز کے ریویو کا تراشہ میرے پاس موجود نہیں ہے۔
آکسفرڈ یونیورسٹی اور نیشنل انسٹی چیوٹ، آکسفرڈ یونیورسٹی کے جریدے ''ادبیات'' میں

چوہدری محمد نعیم (شکاگو یونیورسٹی) فرماتے ہیں۔

> To my mind, more than its first person narration and then degree of verisimilitude in the depiction of its milieu, it is the fact of its being a sustained prose narrative of considerable length that lends credence to the claim of its being the first novel in Persian — More inportantly it is an entirely indigenous development, there is no evidence that Hasan Shah had any knowledge of English language of literature.

(Edebiyat S:2, 1994)

''ڈانسنگ گرل'' پینگوئن (کینیڈا) نے بھی شایع کی ہے۔

گل بدن ایک انگریز کے ساتھ بھاگ گئی۔ شاید اس انگریز نے اس سے شادی کر لی ہو اور وہ بھی خانم جان کی طرح اس طرز زندگی سے متنفر رہی ہو۔ خانم جان نے بھی حسن شاہ کے ساتھ فرار ہونا چاہا مگر ناکام رہی۔

ناول میں ایک لڑکی عمدہ کا نام بھی ملتا ہے۔ اردو مترجم نے اپنے فٹ نوٹ میں لکھا کہ مصنف نے عمدہ کا دوبارہ ذکر نہیں کیا۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے یہ حسن شاہ کی خودنوشت ہے جس میں وہ چند کرداروں کا ضمناً تذکرہ کرتا جاتا ہے اور آگے چل کر وہ اس کے ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ حسن شاہ خانم جان کو بہت کم سن بتاتا ہے۔ ''معشوق چہاردہ سالہ'' ہماری ادبی روایت کی ایک ادا ہے۔ مصوری کی طرح مشرقی ادب بھی Stylised تھا۔ علاوہ ازیں آج بھی نامور فلم اسٹار خواتین بیان دیتی ہیں کہ وہ جب پہلی بار ہیروئن بنیں تو وہ تیرہ سال کی تھیں (مادام نور جہاں نے مجھ سے کہا تھا کہ تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی شوکت حسین رضوی سے ہوئی تھی) حال ہی میں ایک بی بی نے لکھا ہے کہ گیارہ برس کی عمر میں ان کو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں بطور اناؤنسر مقبولیت

ملی۔ برطانوی دور حکومت میں اتنی چھوٹی بچی کا سرکاری ملازمت حاصل کرنا بھی واقعی ایک کمال کی بات تھی۔

میری والدہ مرحومہ کہتی تھیں انھوں نے ''اختر النسا'' ناول بہ عمر چودہ سال لکھا تھا۔ ان کی دوست حجاب امتیاز علی فرماتی ہیں وہ گیارہ برس کی تھیں جب انھوں نے اپنا افسانہ ''میری ناتمام محبت'' تصنیف کیا۔

تو خانم جان کا بھی بہ عمر تیرہ سال اس قدر بقراط ہو جانا تعجب خیز نہیں۔ ''برس تیرہ یا کہ ہو چودہ کا سن'' Syndrome تو ہمارے ہاں ہمیشہ سے رائج ہے۔

حسن شاہ کا پندرہ سالہ ہونا بھی ممکن ہے۔ اودھ کے مسلم قصباتی معاشرے میں ہمارے ایسے طبقے میں جہاں ان کو بچپن سے ''میر شکار'' بننے کی تربیت دی جاتی ہو۔ میں پہلے ذکر کر چکی ہوں کہ برطانوی مصوروں کی بنائی ہوئی پینٹنگز میں عموماً رحم اللہ کی عمر کا ایک بچہ بھی طائفے میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ آج تک ہمارے راجستھان فوک سنگرز کی ٹولیوں میں کم سن لڑکے بحیثیت اہم فن کاروں کے شامل رہتے ہیں۔

پھر دہراتی ہوں کہ ہولیر کو میں O'Lear سمجھتی تھی جو ایک عام آئرش نام ہے اور کمپنی کی افواج میں آئرلینڈ کے باشندے بہ کثرت شامل تھے، میں نے سوچا O'Lear کو ہندستانیوں نے ہولیر کر دیا ہوگا جیسے ڈسنگو، بستن بہادر، کولنز کلن صاحب، جنرل اسکنر سکندر صاحب وغیرہ۔ لیکن پروفیسر اقتدار عالم ٹھیک کہتے ہیں ہولیر ہولیر تھا۔[9]

برطانوی مصور Telly Kettle کو شجاع الدولہ نے مدعو کیا تھا۔ اس وقت فیض آباد میں متعدد اکیڈیمی آرٹسٹ کام کر رہے تھے۔ کیٹل نے ایک تصویر بہ مقام فیض آباد 1772 عیسوی میں بنائی۔ Col. Poller Watching a Nautch یہ پینٹنگ میں نے لندن میں دیکھی ہے۔

بقول مولانا عبدالحلیم شرر دوسو فرانسیسی بہ عہد شجاع الدولہ فیض آباد میں سکونت اختیار کر چکا تھا۔

جنرل کلارڈ مارٹن کی طرح کرنل پولیر بھی سوئس فرنچ تھا۔ میرے نزدیک وہ اٹھارھویں

صدی فرانس کی کلچر کا ایک پرکشش Larger than life نمائندہ رہا ہوگا جس پر فیض آباد اور لکھنؤ کا رنگ سونے پہ سہاگہ ہوا۔ مرغ بازی وہ کرے، راگ رنگ کا وہ شوقین، ہندستانی فنونِ لطیفہ کا وہ شائق، علاوہ ازیں وہ مشرقی ادبیات پر ریسرچ بھی کر رہا تھا اور مخطوطات اور تصویروں کا نادر ذخیرہ اس نے جمع کیا تھا۔

1775 عیسوی میں شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ وزیر ہند نے راجدھانی لکھنؤ منتقل کی۔ پولیر لکھنؤ چلا گیا۔ پروفیسر اقتدار عالم خاں کی تحقیق کے مطابق پولیر 81-1780 عیسوی میں کان پور میں موجود تھا پھر وہ چنار گڑھ گیا۔ جو بالکل ''افسانہ رنگین'' کے واقعات سے مطابقت رکھتا ہے۔

فرانس واپس جانے کے بعد وہیں 1794 عیسوی میں بے چارے کا قتل کر دیا گیا۔ نہ جانے کیا چکر تھا۔ ''اس کے نوادر برٹش میوزیم پیرس، لوازں اور کیمبرج کے ذخائر میں محفوظ ہیں۔''[7]

مصور چارلس ڈائلی کی جو تصویر میں نے ''ناچ گرل'' کے سرورق کے لیے فراہم کی کمپنی کے ایک مشہور ''نباب'' کا بیٹا تھا جو کلکتہ میں 1781 عیسوی میں پیدا ہوا۔ 1798 عیسوی میں اس نے کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔ اس تصویر میں پانچ عدد انگریز ناچ ملاحظہ کر رہے ہیں اور رقاصہ نے بھاری ہندستانی پوشاک اور وزنی زیورات کے بجائے نسبتاً سادہ لباس اور کورٹ شوز پہن رکھے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طائفے مغربی ذوق کو ملحوظ رکھنے لگے تھے۔

ڈانسنگ گرل کے سرورق کی تصویر نیویارک پبلک لائبریری سے حاصل کی گئی ہے۔ یہ اس پینٹنگ کا نصف حصہ ہے جس میں دہلی کے ریذیڈنٹ سر ڈیوڈ اوکٹرلونی (جنھیں دلّی والے اختر لونی کہتے تھے) مغلیہ پوشاک میں ملبوس مسند پر بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے ہیں۔ طائفہ سامنے موجود ہے۔ پوری تصویر پروفیسر ٹوئن بی تخمینم کتاب A Study of History میں شامل ہے۔ اسے 1800 عیسوی کے لگ بھگ کسی ہندستانی مصور نے بنایا تھا۔ اس لیے مغربی ریلزم کے باوجود اس میں تناظر کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔

سیموئیل رچرڈسن کی پمیلا (1740) انگلستان کی نیک پروین تھی۔ ہمارے ہاں اس نوع کے اخلاقی درسی ناول عرصہ دراز کے بعد لکھے گئے لیکن ان کی ایک اوّلین جھلک ہمیں خانم جان کے ناصحانہ خطوط میں ملتی ہے۔ ان میں ممکن ہے حسن شاہ کی زیب داستاں بھی شامل ہو۔ جناب یوسف سرمست کا خیال ہے کہ قاضی عبدالغفار کے لیلیٰ کے خطوط خانم جان کے مراسلات سے متاثر ہو کر لکھے گئے۔ تو چلیے یہ بھی حسن شاہ کی ٹوپی میں ایک اور پر لگا۔ گو میں ''لیلیٰ کے خطوط'' کے اصل محرک کے متعلق تھوڑی بہت جانکاری رکھتی ہوں۔ قاضی صاحب کے خاندان سے ہمارے گھرانے کے پشتینی تعلقات تھے اور وہ مرحوم یلدرم کے بہت عزیز دوست بھی تھے اور ان کی صاحبزادی فاطمہ عالم علی میری بچپن کی عزیز دوست ہیں۔ اگر میں محمد خالد اختر کے منفرد انداز کی نقل کروں تو یوں لکھوں، مجھے خوف ہے (I am afraid) کہ میں اکثر تاریخی اور ادبی معاملات کے حوالے دیتے ہوئے ہر پھر کر اپنے ہی گھرانے اور دائرے پر آجاتی ہوں (مگر مجھے دوبارہ خوف ہے کہ اس صورت حال کا میرے پاس کوئی مداوا نہیں) ''لیلیٰ کے خطوط'' کے لیے یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ Letter of an unknown Woman سے متاثر ہو کر لکھے گئے۔ مجھے معاف کیجیے اگر میں ''صحبت ناجنس'' کا بھی حوالہ دوں جو 1905 عیسوی میں لکھا گیا۔

ڈاکٹر عظیم الشان نے حسن شاہ کی اولاد کا شجرہ پیش کیا ہے جو مثنوی نشتر غم کے ناشرین نے شایع کیا تھا (اس سے قبل ڈاکٹر صاحب کیوں مصر تھے کہ حسن شاہ ایک فرضی ہستی ہیں؟)

مشرف احمد رقم طراز ہیں: ''خانم جان سے جدائی اور اس کی موت کے بعد حسن شاہ لکھنؤ میں آن کر رہنے لگے جہاں انھوں نے جرأت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور حقیقت بھی اپنے بھائی کے توسط سے جرأت تک پہنچے اور ان کے شاگرد ہوئے۔ اس حادثۂ محبت کے بعد حقیقت (8) نے زندگی سے کوئی دلچسپی نہ لی اور ان کی کل دنیا سمٹ کر شعر و ادب کی دلچسپی کی حد تک رہ گئی۔ یہ بے نیازی یہاں تک بڑھی کہ آخری برسوں میں ترک دنیا اختیار کر لی۔ اسی اثنا میں انھوں نے اپنی آپ بیتی بھی قلم بند کی۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق حسن شاہ ضبط 1834 عیسوی تک بہ قید حیات تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے میں جو 1221ھ (1806 عیسوی) کی تصنیف ہے انھیں

ایک ''باحیا'' اور ''صاف طبیعت'' انسان قرار دیا ہے۔ ضبط کے حالات زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔''[9]

اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ''قصہ رنگین'' کے علاوہ انھوں نے بعد میں ایک آپ بیتی بھی لکھی مگر اس کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔

جنرل شاہد حامد نے جو خاندانی دستاویزیں مشرف احمد کے سپرد کیں ان میں حسن شاہ[10] کے متعلق مزید معلومات یا ان کی شادی اور اولاد کا تذکرہ کیوں نہیں ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ (اگر یہ نسب نامہ جو مثنوی نشتر غم والوں نے شایع کیا جعلی نہیں ہے) اکثر یک جدّی رشتہ داروں کی آئندہ پیڑھیاں رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے بے گانہ اور اجنبی ہو جاتی ہیں۔ حسن شاہ حسین شاہ دونوں بھائیوں کی اولادیں اگر ایک شہر لکھنؤ میں مقیم تھیں، ممکن ہے یہ بے گانگی خاندانی اختلافات کی بنا پر پیدا ہوئی ہے۔ بہر حال ہمیں ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں۔

مثنوی جذب عشق کے بارے میں حسین شاہ حقیقت فرماتے ہیں:

> ''1204 ہجری نبوی میں درمیان سیری کے جو مضافات پرگنہ بندرابن سے متصل قصبہ چھاتا میں واقع ہوا اور مفصلاً اخویصاحب وقبلہ جامع المعقول والمنقول حاوی الفروع والاصول حقائق ومعارف آگاہ سید محمد حسن شاہ دام ظلہ جو لمعہ طور افاضت اوسکی سے چراغ دانش وفرہنگ کا روشن ہے۔ شحہ سحاب افادت سے اوسکی باغ فضل وہنر کا سرسبز اور مزین اس قصے کی معشوقہ کو برسانہ پیرایہ الفاظ رنگین فارسی کی پوشت کر کے مجلس ظہور میں جلوہ افروز ناز کا کیا۔
>
> اب اگر کچھ خوبی رنگینی عبارت اور دست نشینی فقرات اوس کتاب مستطاب سے لکھوں تو مقصد سے باز رہتا ہوں اور اس پر کما حقہ تعریف اور توصیف اوسکی کو کب پہنچا ہوں الغرض یہ فقرۂ ناقص کئی جو طبع نارسا اس ہمچمدان سے سرزد ہوتے ہیں فقط فیض تسلیمات اون حضرت کا ہے وگرنہ مجھ پست لیاقت عاجز بیان میں یہ قدرت استعداد کہاں تھی جو ساتھ اس کے تالیف کتاب کے حضور سرفرازوں سخن کی گردن بلند کرتا۔

ایک روز کمال سرفرازی اور ہنر سے جو بزرگوں کو خوردوں کے حال پہ
ہمیشہ مبذول ہے اس کمترین عقیدت گزیں کو زبان معجز بیاں سے فرمایا کہ
چہرہ معشوقہ زیبا نگار اس مضمون عبرت مشحون کی ساتھ حلیہ اور زیور عبارت
نثر زبان اردو کی آراستہ کر کے تحفہ مجلس احباب کا کرے۔ سو بنا فرمان
واجب الاذعان اور عین انعاس۔ جناب کی

دُرِ فکر سے گوندھ لڑیاں کئی
ساتھ عبارت سلیس، رنگین اور دلچسپ کے ترتیب دے کے
ساتھ جذب عشق کے موسوم کیا۔

(جذب عشق مطبوعہ مطبع محمدی کان پور، 1269ھ (1852)[11]

اس نامکمل اقتباس کے شروع کے الفاظ مفقود ہیں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ 1204ھ (1789 عیسوی) میں وقوع پذیر ہوا۔ دوسرا مطلب یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حسن شاہ نے بزبان فارسی یہ سچا واقعہ مرہٹہ لشکر کے ایک نوجوان اور ایک برہمن زادی کے عشق کا 1789 عیسوی میں قلم بند کیا۔ (اور اس کے اگلے سال اپنی داستانِ عشق بہ عنوان قصہ رنگین لکھی) اور بڑے بھائی کی فرمائش پر حسین شاہ نے جذب عشق کا اردو نظم و نثر میں ترجمہ کیا۔ حسن شاہ کان پور چھاؤنی میں مقیم تھے۔ نواح دہلی کی مرہٹہ چھاؤنیوں کے کوائف سے ان کی واقفیت امر محال نہیں۔ اردو فارسی کا دل دادہ فرانسیسی نژاد جنرل پیرون سندھیا کی فوج کا سربراہ تھا۔ کرنل کڈ بھی مرہٹہ فوج سے وابستہ رہا تھا جس کے ساتھ بحیثیت اس کے میر منشی حسین شاہ حقیقت بہت عرصے بعد کرناٹک تشریف لے گئے۔

ڈاکٹر صدیقی کا اعتراض ہے کہ میں ''غالباً'' بہت لکھتی ہوں۔ تحقیق کا ایک اصول یہ ہے کہ جب تک ثابت نہ ہو جائے حتمی فیصلے نہیں کیے جاتے کہ نشتر کسمنڈوی کی اپنی تخلیق ہے۔ میں نے لکھا ہے ''جذب عشق'' کا ہیرو غالباً ایک یورپین افسر تھا۔

ہندستانی حکمرانوں کی افواج میں یورپین ایڈونچرز کی کمی نہیں تھی۔ ''انگریز کا رفیق کار'' اگر ایک یورپین افسر نہیں تھا (اس وقت سیاسی شطرنج کی بساط پر مرہٹے کبھی انگریز کے حلیف بن

جاتے کبھی حریف) تو ہوسکتا ہے وہ ساحل رتنا گیری کا نیلی آنکھوں اور سفید رنگت والا چت پاون برہمن[12] رہا ہو جو بہت ہی اعلیٰ ذات برہمن سمجھے جاتے ہیں۔ اس صورت میں ضلع متھرا کے باہمنوں نے اسے زدوکوب کیوں کیا؟ ممکن ہے وہ کورگی رہا ہو جو ایک بے حد خوش شکل گوری چٹی جنگجو قوم ہیں[13] یہ بھی یونانی النسل بتلائے جاتے ہیں۔

اگر وہ ہندستانی مسلمان تھا (ہولکر کے لشکر میں سردار میر خاں اور ان کے پنڈاری بھی شامل رہے تھے) یار و دیار سے جدائی کے سبب اور ناجنس لوگوں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ہردم رنجیدہ رہا کرتا تھا۔ کیوں؟ وہ اپنے ہی وطن میں موجود تھا اور اسے دور دور سیر کے لیے نکل جانے کا شوق تھا۔ جو عموماً غیر ملکی ہی کرتے ہیں۔

مزید برآں مصنف نے ہیروئن کو برہمن بتلایا ہے۔ لیکن ہیرو کی قومیت اور مذہب بیان نہیں کیا۔

ایک عام قاری کے لیے ضروری نہیں کہ وہ تاریخ سے بھی آگاہ ہو لیکن ناقدین کی سہل انگاری افسوس ناک ہے۔ ''آخر شب کے ہمسفر'' کے بنرجی خاندان کو ہر نقاد نے ادبدا کے اینگلو انڈین لکھا ہے۔ جبکہ میں نے بنرجی اور ان کی بیوی گری بالا کے Conversion کی تفصیل ناول میں بیان کی ہے۔ وہ انڈین کرسچین یا نیٹو کرسچین طبقہ تھا جسے ہندستانی استہزا سے Rice Christian بھی کہتے تھے۔ اس طرح کا ایک مضمون میں نے شمیم احمد مرحوم کا پڑھا۔ وہ بہت ذہن آدمی تھے۔ افسوس ان دونوں بھائیوں سے کبھی ملاقات نہ ہوئی۔[14]

گردش رنگ چمن کی کہانی سے شمیم احمد مرحوم نے یہ نتیجہ نہ معلوم کس طرح اخذ کیا ہے کہ میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ہماری سوسائٹی طوائفوں اور لال بیبیوں کی اولاد پر مشتمل تھی اور سول لائنز سے انگریزوں کے لیے عورتیں سپلائی کی جاتی تھیں۔[15]

''نشتر'' کی تفہیم بھی تاریخ سے اسی بے توجہی کا شکار ہے۔ ابھی ایک نامور ادیب کا افسانہ پڑھا جس میں عہد ایلزبتھ اوّل میں ڈاکیہ رجسٹری خط لاتا ہے اور ایک کردار نے وکٹورین لباس پہن رکھا ہے۔ (''وکٹورین'' ان کی دانست میں کسی ولایتی پوشاک کا نام تھا)۔

ایک نقاد نے ایک انگریزی مضمون میں لکھا ہے کہ ''گردش رنگ چمن'' ناول نہیں کہلا سکتا کیونکہ یہ ایک ڈوکومنٹری ہے (حالاں کہ میں نے خود ہی اسے ایک نیم دستاویزی ناول لکھا ہے)۔

یہ خیال سراسر غلط ہے کہ یہ معاشرہ محض طوائفوں اور ان کے انگریز مربیوں پر مشتمل تھا۔ عالی مرتبت انگریز شاہی خاندانوں میں شادیاں کرتے تھے۔ میں لندن میں جان گریگ سے ملی ہوں جو فخریہ اپنے آپ کو شاہ عالم ثانی کا نواسہ بتاتے ہیں۔ کیونکہ شہزادی فیض النسا ان کی جدہ تھیں۔ کرنل گارڈنر کی بیوی نواب کمبایت کی بیٹی منظور النسا بیگم تھیں۔ ان کے بیٹے کی شادی شہزادی سلیمان شکوہ کی متبنیٰ بیٹی شہزادی قمر چہرہ سے ہوئی اور ایک پوتی سوزن گارڈنر کا بیاہ بھی سلیمان شکوہ کے بیٹے انجم شکوہ سے ہوا۔ گارڈنر گھرانے کے رشتے فرخ آباد کے بنگش نوابوں میں ہوتے رہے۔ برطانوی ارسٹوکریسی کی مشہور ڈائرکٹری ڈیبرے میں شہزادہ انجم شکوہ اور سوزن گارڈنر کی اولاد کے نام موجود ہیں جو سلیمان شکوہ کی نسبت سے Shiko کہلاتے ہیں (انجم شکوہ کی بیٹی اختر زمانی عیسائی ہوگئی تھیں)

ہر عہد کے اپنے سماجی ضابطے بن جاتے ہیں (آج کل بعض انٹرکمیونل شادیوں میں پھیرے بھی ڈالے جاتے ہیں اور نکاح بھی ہوتا ہے) بشپ آف کلکتہ نے ایسی شادیاں جائز قرار دی تھیں لیکن دستور یہ تھا کہ لڑکے باپ کا مذہب اختیار کرتے تھے اور لڑکیاں ماں کے مذہب پر قائم رہتی تھی۔ کاس گنج ضلع ایٹہ میں گارڈنر بیگمات کا شاندار امام باڑہ 1837 عیسوی تک موجود تھا۔ جب راقمہ کے چچا سید نثار حیدر زیدی مرحوم کی نگرانی میں اس کا بیش قیمت شاہانہ سامان امام باڑہ شہید ثالث آگرہ منتقل کیا گیا۔ (ایٹہ میں چچا جان مرحوم کا ڈرائیور ایک خالص انگریز مسٹر ولیم تھا جو ایک ہریجن عورت کے ساتھ رہتا تھا۔ اس وجہ سے انگریزوں نے اس کو ناٹ باہر کر دیا تھا)

جنرل اسکنر کی ماں ایک راج پوت زمین دار کی بیٹی تھی۔ خود جنرل موصوف نے متعدد شادیاں مسلمان گھرانوں میں کیں۔ ایک بہو خاندان لوہارو سے تعلق رکھتی تھی۔ انھوں نے دہلی کے مشہور سینٹ جیمز چرچ کے علاوہ ایک مسجد بھی بنوائی۔ ان کی مسلمان اولاد درگاہ نظام الدینؒ

کے قبرستان میں مدفون ہے۔

یوریشین اور اینگلو انڈین بالکل مختلف طبقات تھے۔ اواخر انیسویں صدی تک ہندستان میں بسلسلہ ملازمت مقیم انگریزوں کو اینگلو انڈین کہا جاتا تھا۔ یوریشین کی اصطلاح انگریز (ڈچ یا پرتگالی ڈینش یا فرنچ) باپ اور ہندستانی ماں کی اولاد کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ انگریز باپ اور ہندستانی ماں کے لیے لفظ اینگلو انڈین بہت بعد میں رائج ہوا۔ ایک تیسرا طبقہ Domiciled انگریزوں کا تھا، یہ مخلوط النسل نہیں تھے۔ انھوں نے عموماً پرفضا پہاڑی مقامات پر مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ آج برطانیہ یورپین یونین میں شامل ہونے کے بعد پریشان ہے اور اپنا برطانوی تشخص بھی قائم رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن کولونیل دور میں لفظ یورپین سارے گوروں کے لیے مستعمل تھا۔ ٹرین کے ڈبے، کلب، اسکول اور اسپتال Europeans Only کے لیے مخصوص تھے۔

امپیریل تہذیبوں کے حکمرانوں اور باشندوں کی مختلف اقوام سے نسلی روابط کی ایک مثال ہمیں دولت عثمانیہ میں ملتی ہے۔ جب آل عثمان حاکم اور اہل مشرقی یورپ محکوم تھے۔

جس طرح بیش تر مغل بادشاہ نسلاً نصف راجپوت تھے سلاطین ترکیہ کی مائیں بھی اطالوی اور دوسری یورپین اقوام سے تعلق رکھتی تھیں۔ بوزینہ، البانیہ وغیرہ کے مسلمانوں کے اکثر اجداد ترک تھے۔ رومانیہ اور ہنگری وغیرہ کی زبانوں میں ترکی الفاظ موجود ہیں۔ ہنگری میں Zoltan (سلطان) ایک عام نام تھا۔ جب روس نے اپنے سفارت خانہ باب عالی بھیجا تو سترھویں صدی کے ترکوں نے جو اس وقت یورپ کی ایک بے طاقت و رقوم تھے ان روسیوں کو عجیب الخلقت وحشی سمجھا۔ 1857 عیسوی تک ہندستان میں مغلیہ تہذیب ایک غالب تہذیب تھی لہٰذا انگریزوں نے نوابوں کی نقل کی۔

پھر لوٹا الٹا گھوم گیا۔ انگریز بڑی چالاک قوم ہیں۔ آنریبل جان کمپنی کا ریذیڈنٹ اور اس کے افسران اعلیٰ نواب آصف الدولہ وزیر ہند کی مجالس محرم میں شریک ہوکر ماتم کرتے تھے۔ اگلی نصف صدی میں جب وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوگئے تو انھوں نے بعد سقوط لکھنؤ امام باڑوں کو (عارضی طور پر ہی سہی) چرچ اور اصطبل بنایا۔ اور سرسید احمد خان مویشیوں پر چھری

کانٹے سے کھانا کھاتے تھے اور بعد میں چرٹ سلگاتے تھے۔ انھوں نے ایک عظیم الشان تہذیب کو اپنی آنکھوں کے سامنے مٹتے دیکھا تھا۔ ان کے دل پر کیا گزری وہ ہم سب جانتے ہیں اور ان کا انگریزی طرز معاشرت اختیار کرنا ایک کرب ناک Expediency تھی۔

یہ تاریخ کے Dialectics ہیں۔ ایک Domiciled اردو داں یورپین مجھے ہلکے سے یاد ہیں۔ جنھیں ہم انکل نبلٹ کہتے تھے۔ وہ غازی پور میں والد مرحوم کے رفیق کار تھے۔ ڈپٹی کمشنر نبلٹ کا چند سال ہوئے الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ اس کے چھوٹے اردو داں بھائی 1956 عیسوی میں رنگا ماٹی کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ میں نے ان کا ذکر ''آگ کا دریا'' میں کیا ہے۔ ان کو ایک پاگل ہاتھی نے کچل کر مار ڈالا۔

دہرہ دون، مسوری، نینی تال وغیرہ میں بھی اس Breed کے لوگ موجود تھے جواب سب مرکھپ چکے۔

والدہ کی ایک قرابت دار خاتون نے چند سال قبل رحلت فرمائی۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہندستانی تاریخ کے اس ذیلی خاموش ڈرامے کے آخری باب کا خاتمہ ہوا۔ ان خاتون کے جدامجد[16] کی ایک تصویر بنگال کلب کلکتہ میں موجود ہے جس میں جنگ پلاسی کے بعد ہاتھی کے ہودے پر سے جھک کر نیچے کھڑے لارڈ کلائیو کو بنگال، بہار، اڑیسہ کے حقوق دیوانی کے کاغذات تھما رہے ہیں۔ ان بزرگ کے پوتے نے فیلڈ مارشل ارل رابرٹ کی سگی بہن سے شادی کی۔ یہ خاتون مذکورہ شکلاً اپنے والد کے نامور ماموں سے بے حد مشابہ تھیں جن کا پورٹریٹ ان کے گھر میں موجود تھا لیکن وہ انگریزی سے نابلد ایک خالص لکھنوی پردہ نشین بیگم تھیں۔ یعنی یہ نسلی وراثت سے زیادہ ماحول کی کارفرمائی تھی اور ان مرحومہ کے والد کی پہلی شادی نواب بہار آرا، بیگم دختر واجد علی شاہ سے مٹیا برج میں ہوئی تھی۔ انھی واجد علی کو معزول کرنے کے بعد لارڈ رابرٹ نے جو اس وقت کیپٹن رابرٹ تھے اور Bob کہلاتے تھے (ٹینی سن نے ان کے متعلق ایک نظم بھی لکھی تھی) 1857ء میں لکھنؤ کے مورچے پر زبردست فتوحات حاصل کی تھیں۔

انسانی زندگیوں کا عجب گھپلا ہے۔

اور سینے، فیلڈ مارشل جنرل رابرٹ کے والد سر فریڈرک رابرٹ کے فرزند اصغر نے لکھنؤ کے ایک شیعہ گھرانے میں شادی کی اور امام باڑہ شاہ نجف میں مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ اور بہت مفلوک الحال تھے۔

رام بابو سکسینہ اس دور کے انڈو یورپین شاعر اور شاعرات کے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھ گئے ہیں۔

سلطنت اودھ کے سلسلے میں مجھے اکثر وہ انگریزی "ورس" یاد آتی ہے جو کچھ اس طرح ہے:

My candle burns at both ends
it will not last the night
But ah my friends, and oh my foes
It gives a lovely light

ناچ گرل کے دیباچہ میں میں نے لکھا ہے کہ سلطنت اودھ ہمارا اپنا Camelot تھی[17] جس کے آغاز میں خانم جان ایک فروزاں شمع دان لیے استادہ ہے اور اختتام پر امراؤ جان جن کی شمعیں پگھل کر بجھ چکی ہیں۔ اور یہ دونوں خواتین اپنے عہد کے سماجی اور تاریخی عوامل کی پیداوار ہیں۔ امراؤ جان ان بجھتی ہوئی شمعوں کی روشنی میں رسوا کو اپنا قصہ سناتی ہیں۔ (یاد رہے کہ بیگم حضرت محل بھی ملکہ بننے سے پہلے ایک رقاصہ تھیں)[18]۔ اس روشن دماغ اور عالی ہمت خاتون نے ملکہ وکٹوریہ کے آرڈی ننس کو Defy کر کے اپنا فرمان جاری کیا جس میں انھوں نے اعلان کیا کہ حکومت کو رعایا کے مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ غیر معمولی دستاویز اپنی مثال آپ ہے۔ امراؤ جان کا سامع دور جدید کا ایک اسکالر ہے جو لکھنؤ کے انگریز کالج میں پڑھاتا ہے۔

خانم جان کے علاوہ میں امراؤ جان ادا کو بھی ایک تاریخی ہستی سمجھتی ہوں۔ پروفیسر اعجاز حسین مرحوم کا کہنا تھا کہ انھوں نے امراؤ جان کو اپنے بچپن میں دیکھا تھا کیونکہ انھوں نے بہت لمبی عمر پائی۔ امراؤ جان ادا پر بہت لکھا جا چکا ہے یہاں مزید اظہار خیال کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔

قاری سرفراز حسین کا شاہد رعنا، امراؤ جان ادا سے قبل شایع ہوا اور اس کے چند واقعات رسوا نے دہرائے ہیں، جن کو محض توارد نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن حقیقت اور فکشن ناول کا تانا بانا ہیں۔ امراؤ جان ادا جس تفصیل سے غدر کے چشم دید واقعات بیان کرتی ہیں اور یہ بھی بتلاتی ہیں کہ (واجد علی شاہ کی والدہ) ملکہ کشور کی سرکار میں سوز خوانی کرتی تھیں۔ شہزادہ مرزا سکندر بخت کے مجرائیوں میں اہم تھا۔ مرزا برجیس قدر کی تخت نشینی کے موقع پر مبارک باد کے لیے طلب کی گئی تھیں۔ یہ ناول کے اندرونی تاریخی شواہد ہیں۔ ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں لکھنؤ کے بلند پایہ فن کار ارباب نشاط کی بیگمات کے ہاں بھی پذیرائی ہوتی تھی اور ان کو سوشل آؤٹ کاسٹ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (بلکہ مرزا قتیل تو اس سلسلے میں اہل لکھنؤ کی آزاد خیالی پر معترض بھی تھے) یوں سمجھیے گویا لکھنؤ اٹھارھویں صدی فرانس کی توسیع تھا۔

مرزا رسوا کے استفسار پر امراؤ جان ادا بیگم حضرت محل کی لکھنؤ سے المناک روانگی کی تاریخ بھی صحیح بتلائی ہی۔ ''ہزاری روزے کے دوسرے یا تیسرے دن (یعنی 29 رجب 1274 ہجری مطابق 16 مارچ 1857 عیسوی) جب جناب عالیہ برجیس قدر اور درباریوں کے ہمراہ لکھنؤ سے نکلیں۔ امراؤ جان بھی اس وفادار میں شامل تھیں۔

یہ قافلہ خیر آباد اور محمود آباد ہوتا ہوا افتاں وخیزاں بونڈی وارد ہوا۔ بہرائچ میں جنرل کلاینڈ لڑتا بھڑتا اپنے لشکر قاہرہ کے ساتھ بونڈی آن پہنچا۔ جناب عالیہ کو پہاڑوں کی طرف جانا پڑا۔ عشق بلاخیز کا یہ قافلہ سخت جان کون سی وادیوں اور کون سی منزلوں سے گزرتا ہوا نیپال پہنچا؟ لکھیم پور کھیری کے جنگلات میں امام باڑوں کے کھنڈرات بھی ملتے ہیں جہاں بیگم حضرت محل کے درماندہ ساتھی بچھڑ کر راستے ہی میں ٹھہر گئے تھے۔ بونڈی اور نانپارہ کے درمیان ایک مسجد آج تک امراؤ جان کی مسجد کہلاتی ہے۔ شاید وہ اس کے قرب وجوار میں رکی ہوں۔ بہرحال ان کا اپنا بیان ہے کہ ''میں اپنی جان بچا کر بونڈی سے فیض آباد آ گئی۔''

حضرت محل اور امراؤ جان دونوں وقت کے اطلسی پردوں کے پیچھے غائب ہو جاتی ہیں۔ ایک تاریخی ہستی ہے۔ دوسری افسانہ بن گئی۔

عرصہ ہوا میں نے صابر دت کے ''فن و شخصیت'' کے غزل نمبر کا حصہ شاعرات مرتب کیا تھا۔ اس کے لیے اس بندۂ خدا نے ایک تصویر کہیں سے لا کر دی۔ اس کے پیچھے ''امراؤ جان ادا'' لکھا تھا۔ سائز وہی تھا جو مشکور الدولہ قیصر باغ کی کھینچی ہوئی ارباب نشاط کی تصاویر کا تھا جو اس فوٹو گرافر نے 1865 عیسوی کے لگ بھگ تیار کی تھیں۔ کوئی تعجب نہیں امراؤ جان بھی مشکور الدولہ کے اسٹوڈیو گئی ہوں۔ جو شمالی ہند کے پہلے ہندستانی فوٹو گرافر تھے۔

اس وقت فوٹو گرافری کی ترقی اس حد تک ہوئی تھی کہ اس سے بڑی تصویر اتاری نہیں جا سکتی تھی۔

ڈاکٹر وہاج الدین علوی کے ایک مرحوم تعلقہ دار بزرگ کے گھر سے جو سامان نکلا اس میں ''چند'' نہیں ستائیں ''تصویر بتاں'' اسی سائز کی اور سب مشکور الدولہ کی کھینچی ہوئی (چند کی پشت پر عاشقانہ اشعار بھی مرقوم ہیں۔ ایک طوائف نہایت بانکپن اور غرور کے ساتھ شاہانہ انداز سے کرسی پر متمکن ہے۔ نام۔ چھوٹی شہزادی صاحب نہ جانے وجہ تسمیہ کیا تھی اور وہ کون تھیں) فلم ڈائرکٹر مظفر علی کے پاس مشکور الدولہ کی تیار شدہ بے شمار تصاویر لکھنؤ کی ارباب نشاط کی موجود ہیں۔

فلم ڈائرکٹر مظفر علی نے اپنے مضمون (مطبوعہ تاج میگزین فرسٹ کوارٹرلی 1994 عیسوی) میں ناچ گرل کے دیباچہ اور متن سے اقتباسات دینے کے علاوہ چند اہم انکشافات کیے ہیں۔ ایک عزیزن بائی جو 1834 عیسوی میں پیدا ہوئی اور امراؤ جان ادا نے جو ست رنگی محل لکھنؤ[19] میں رہتی تھی عزیزن بائی کی پرورش کی۔ ایام غدر میں عزیزن کان پور پہنچیں اور پستول سے مسلح فوجی وردی میں ملبوس شہسوار کی حیثیت سے جنگ میں حصہ لیا۔ بقول مظفر علی کان پور کی حسینی خانم ایک اور مجاہد آزادی تھیں جن کے بنائے ہوئے منصوبے کے تحت دو سو انگریز مع جن بچہ تہہ تیغ کیے گئے۔ (اسی کان پور میں ایک وقت تھا جب خانم جان انگریزوں سے ہمسری کا رویہ رکھتی تھیں اور بلا خوف و خطر ان کے منہ پر انھیں سفید کوے پکارتی تھی) مظفر علی مزید فرماتے ہیں کہ برطانوی تسلط کے بعد 1864 عیسوی میں ایک نیا قانون[20] بنا جس کے تحت لکھنؤ کی طوائفوں کو

حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوٹو گرافر مشیر الدولہ قیصر باغ سے تصویر کھنچوا کر سرٹیفکیٹ یا لائسنس کے ساتھ منسلک کریں۔ اس مضمون سے یہ عقدہ بھی کھلا کہ ''مشیر الدولہ فوٹو گرافر قیصر باغ'' نے ایک ہی زمانے میں اتنی بے شمار ارباب نشاط کی تصویریں کیوں کھینچی تھیں اور سب ایک سائز کی۔ وہ گویا اس وقت کے پاسپورٹ فوٹو گرافر تھے۔

بقول مظفر علی لکھنوی کی فاتح انگلش سرکار نے ان اعلیٰ درجے کی ارباب نشاط کی انتقاماً مزید توہین یوں کی کہ ان کو اپنے نام عمر اور نمبر اردو میں لکھوا کر ان کی چوبی تختیاں اپنے دروازے پر لگوانی پڑیں اور معزول شدہ بادشاہ کی متوسلین کو بھی سرکاری پنشن حاصل کرنے کے لیے اپنا کیرکٹر سرٹیفکیٹ پیش کرنا لازمی قرار پایا۔ جو ہزار ہا عورتیں اپنی معصومیت کا ثبوت فراہم نہ کر سکیں افلاس کا شکار ہوئیں۔

1858 عیسوی کے بعد لکھنؤ کے ادبار اور انحطاط کی وجہ اندوہناک تھیں۔

گو اسی زمانے میں لکھنؤ عہد جدید میں داخل ہوا۔ وہ جنگجو تعلقہ دار جنھوں نے بیگم حضرت محل کی حمایت میں انگریزوں سے مورچے لیے تھے وفادار دولت انگلشیہ بن گئے۔ ان کو قیصر باغ میں بیگمات واجد علی شاہ کے مکانات بطور ٹاؤن ہاؤس مرحمت کیے گئے۔ رقص و موسیقی کی تجدید ہوئی اور لکھنؤ کی روایتی کلچر نے سنبھالا لیا۔ سرشار نے اسی نئے دور کی عکاسی کی ہے۔

شمس آباد کے نواب سید حیدر عباس موسوی نے عرصہ ہوا مجھے مذکورہ بالا فوٹو گرافر لکھنؤ کے باشندے مکشور الدولہ حیدر جان کے متعلق ایک مضمون بھیجا تھا جو نواب دولہا صاحب کی بھانجی کے لڑکے تھے۔ مضمون میں نے دیکلی میں مع ان کی کھینچی ہوئی تصاویر کے ساتھ شایع کیا تھا۔ ان میں ایک بڑے سائز کی تصویر کمسن نواب بچوا کی محفل رقص کی بھی شامل تھی۔ موجودہ صدی کی اوّلین دہائیوں میں ''نواب'' سر ہرکورٹ بٹلر نے کمپنی بہادر کے ''نوابوں'' کی روایت کی تجدید کی۔ وہ مہاراجہ محمود آباد ٹھاکر نواب علی وغیرہ کے گہرے دوست تھے۔ انگرکھا پہن کر حقہ پیتے تھے۔ لکھنؤ کی زہرہ ان کی منظور نظر تھی۔ اس نوابی میں ان کی افتادِ طبع کے علاوہ سیاسی مصلحت بھی کارفرما تھے۔ الہٰ آباد قوم پرستی کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ انھوں نے حکومت کا مستقر الہ آباد سے لکھنؤ منتقل کیا جو

وفادار جاگیرداروں کا گڑھ تھا۔

سیاسی شعور کی مالک جدن بائی (والدہ نرگس) بھی اسی عزیزن بائی والی روایت سے تعلق رکھتی تھیں۔ان کی تربیت کلکتے کی بے حد اینگلو برٹش گوہر جان نے کی تھی۔سید سبط حسن مرحوم نے ایک بار مجھے بتلایا تھا کہ لکھنؤ کے نئے نئے ترقی پسند ایک تعلیم یافتہ مغنیہ حسنی کے ہاں چوک میں اپنی انڈر گراؤنڈ میٹنگیں منعقد کرتے تھے اور وہ کامریڈ حسنی کہلانے لگی تھی۔لکھنؤ ریڈیو کی گوہر سلطان[21] دیہات کی گندھرو کاسٹ سے تعلق رکھتی تھیں اور تھوڑی سی ہندی ہی جانتی تھیں مگر ان کی یاداللہ پڑھے لکھوں سے تھی۔نجاس میں ان کے مکان کی ادبی محفلوں میں سبط حسن، ملک راج آنند وغیرہ شامل ہوتے تھے۔

فنکاسٹک۔

پروفیسر صدیقی نے زیرِنظر مضمون میں ترجمے کی اقسام گنائی ہیں تو سنیئے آزاد ترجمہ وہ ہے جیسے سرشار کا خدائی فوجدار۔تخلیقی ترجمہ یا Adaptation Transcreation کی مثال کے لیے مجھے دور جانے کی ضرورت نہیں۔''ثالث بالخیر'' کو لیجیے جو 1902 عیسوی میں چھپی تھی۔اس کے متعلق سلجوقیہ یونیورسیٹی قونیہ کے پروفیسر ارکمال ترکمین نے فرمایا ہے:

> It is neither nor a literay translation but an adaption of the original work - Ottoman Turkish shared a lot of Arabic and Persion words and that language was rich in metaphors and similes, etc. Yildirim deleted the ornamentation and simplified the language and so the translation became insipid. But Urdu itself had been over burdened with literary ornamentation and it was Yildirim's intention to simplify it.... Through subtle changes he gave an Indian

orientation to the characters, mannerisms and yet retained their Turkishness. He deleted or shortened entire paragraphs and wrote in his own, and a new style emerged...

The translator changed the very purpose of Ahmed Hikmet's novelette. The author wanted continue to cause confusion in Eastern society. The translator's aim was different from the authour's. As he says in his preface he wanted to show the social changes caused by the revolution in new Turkey. So as his aim differs form the author's his style and language varies too. Dr. Arkman Turkmen: "Sajjad Hyder Yildirim's translations, A Comparative Study" lecture delivered at Khuda Baksh Library, Patna. 1984

(اس قسم کی بات نشتر کے لیے نہیں کہی جا سکتی۔ اردو مترجم نے سوائے اس کے کہ متعدد اشعار کا اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے اور مصنف نے جو باب تمہید لکھا تھا اس کو کتاب کے آخر میں لگا دیا ہے۔ قصہ رنگین کے اسٹائل اور موضوع میں کوئی تبدیلی نہیں کی)

نوٹ: یہ افسانے کچھ طبع زاد ہیں کچھ ترکی و انگریزی سے ملخص۔

خیالستان و گلستان[22]

صحبت ناجنس[23] ترکی سے لیے گئے ہیں مگر میں نے

نکاح ثانی ان میں بہت کچھ تصرف کیا ہے۔

سودائے سنگیں

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ[24] انگریزی کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے

ازدواج محبت[25]

چڑیا چڑا کی کہانی

حضرت دل کی سوانح عمری میرے ہی ناکارہ تخیل کا نتیجہ ہیں۔

حکایت لیلیٰ و مجنون[26] وغیرہ وغیرہ

جلال الدین خوارزم شاہ (1925ء) پابند ترجمہ تھا۔ بقول خواجہ غلام السیدین مرحوم یلدرم ٹہل ٹہل کر ترکی ڈراما پڑھتے جاتے تھے اور اس کا برجستہ ترجمہ Dictate کرتے تھے جسے سیدین صاحب قلم بند کرتے جاتے تھے۔

اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی جو تراجم کا دور کہلاتا ہے اس میں عموماً افسانے کے آخر میں محض (ترجمہ) یا ماخوذ لکھنا کافی سمجھا جاتا تھا۔ فکشن کی تنقید بھی مفقود تھی (اوّلین تبصروں میں میں نے منشی نواب رائے (یعنی پریم چند) کا مختصر ریویو "خیالستان" کا پڑھا ہے۔ جو "زمانہ" کانپور میں چھپا تھا)۔

ڈرامے میں آغا حشر نے شیکسپیئر کا حلیہ بدل ڈالا۔ آل انڈیا ریڈیو کے قیام کے بعد یک بابی ناٹکوں کی ضرورت پیش آئی تو مغربی ون ایکٹ پلے بغیر حوالے کے ماخوذ کیے گئے۔ یہ سلسلہ آج تک ٹیلی ویژن میں جاری ہے۔27

تراجم کی اقسام کی دوسری مثال میں ناچیز اپنی دے سکتی ہوں۔ نوٹ فرمالیجیے۔ ہنری جیمز ٹی ایس ایلیٹ ("کلیسا میں قتل") ٹرومین کاپوٹ اور متعدد سوویت مصنفین کے انگریزی ورژن کے اردو تراجم "پابند" کہے جاسکتے ہیں۔ سودا، غالب، اقبال، میر انیس وغیرہ جو سب چھپ چکے ہیں فری ورس میں منتقل کیے۔ اپنے ناول اور افسانے جو خود انگریزی میں Transcreate کیے اپنی تحریر میں جس طرح چاہوں انگریزی میں منتقل کروں میری مرضی پر منحصر ہے۔ دوسرے مصنفین کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ آزادی جائز نہیں سمجھتی۔

بی بی سی میں انگریزی خبروں کو فی الفور اردو میں ترجمہ کر کے براڈ کاسٹ کے لیے دیتے

جانے کا تجربہ بھی مجھے حاصل ہو چکا ہے۔ اس زمانے میں Tape عام نہیں تھا۔ ساری نشریات Live ہوا کرتی تھی۔

دانش مندوں کے کمانڈر انچیف جناب مظفر علی سید نے بھی خلط مبحث میں قدم رنجہ فرمایا۔ انھوں نے اپنے کالم[28] میں میرے اس مضمون کا حوالہ دیا ہے جو ''نشتر'' کے متعلق السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں 1988 عیسوی میں چھپا تھا اور جس پر ویکلی کے کسی سب ایڈیٹر نے

A Startling Discovery

کی سرخی لگائی تھی۔ اس کے علاوہ موصوف نے صدیقی و سرمست صاحبان کے مضامین (مطبوعہ سوغات نمبر 5) کا تذکرہ کیا ہے۔ سید صاحب نے اس کتاب کو Partial translation قرار دیا ہے۔ حالاں کہ ترجمے کے آغاز میں میں نے لکھا ہے کہ یہ نشتر کا Abridgement ہے۔ لہٰذا گمان ہوتا ہے کہ اصلی تے وڈے ناچ گرل مظفر علی سید نے بھی نہیں پڑھی جو آکسفرڈ یونیورسٹی پریس (کراچی) سے مل سکتی تھی۔

اب تلخیص کا معاملہ یوں ہے۔

Imprint میں برطانیہ اور امریکہ کی تازہ ترین کتابوں میں سے منتخب کر کے دو فکشن اور Non-fiction ہر ماہ پچیس ہزار الفاظ میں تلخیص کی جاتی تھی۔ تین سال میں اس رسالے کی مینجنگ ایڈیٹر اور ایک سال ایڈیٹر رہی۔ 1964 عیسوی سے 1968 عیسوی تک ہم نے ایک سو بانوے کتب چھاپیں جن میں سے کم از کم اسی[80] میں نے خود تلخیص کی تھیں۔ یہ ''کرتے کی وتیا'' ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ پچھلا پیراگراف حذف شدہ حصے کے بعد اگلے پیرے سے محض چند الفاظ کے ذریعے منسلک کیا جائے۔ اپنی طرف سے آپ متن میں کوئی اضافے نہیں کر سکتے۔

مجھے کسی ادبی لابی سے سروکار نہیں نہ کسی سے ''معاصرانہ چشمک''۔ ہندستان میں انتظار حسین کو انگریزی میں ترجمہ کر کے میں نے متعارف کیا ہے (السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا، 6 ستمبر 1970ء)۔ شاید اس سے قبل محمد عمر میمن نے کچھ ترجمے کر لیے تھے جو انھوں نے مجھے امریکہ سے بھیجے مگر مین لے ا لے The Legs کر چکی تھی۔ خالدہ اصغر کی سواری (The wagon) ویکلی 24

ستمبر 1972 عیسوی میں چھاپی۔ یہ پابند تراجم تھے۔ ابوالفضل صدیقی کی طویل کہانی مختصر کر کے The Death of a Faqir کے عنوان سے شایع کی (9 مارچ 1975 عیسوی)

آغا بابر سے پہلی بار ملاقات نیویارک میں 92 میں ہوئی جہاں ایک ادبی محفل میں وہ پرانا تراشہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ مجھے ان کی یہ بات بہت Touching لگی۔ میں نے خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ اگر وقت ملے تو دل چاہتا ہے بہت سے معاصرین کی بہت سی کہانیاں جو مجھے پسند ہیں ان کا ترجمہ کروں۔ سرشار کے ناولوں کو Condense کروں۔ وغیرہ مگر اس کے لیے عمر خضر چاہیے۔

ابن انشاء مرحوم اپنے دوست آدمی تھے اور بے پناہ سنس آف ہیومر کے مالک۔ میں نے ان کی ''فرسٹ اردو ریڈر'' کا ویکلی کے ڈیڑھ صفحے میں اختصار کیا۔ (5 اپریل 1975 عیسوی) اور ان کے جملے And for a hotel in Ashoka is remembered for his pillar کے آگے New Delhi کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔ موصوف بہت محظوظ ہوئے اور خط میں لکھا ''لیکن آپ بھارت کے ذکر میں ڈنڈی مار گئی ہیں۔''

چوں کہ ناقد صاحبان نے ''ناچ گرل'' نہیں پڑھی ہے۔ اطلاعاً عرض یہ ہے کہ میں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اردو مترجم نے بھی اس کے پانچ صفحات اور متعدد غزلیں حذف کر دی ہیں (مطبع نول کشور کے ذخیرے کے ناقابل تلافی نقصان کا ذکر پہلے کسی مضمون میں کر چکی ہوں۔ میری استدعا کے باوجود کہ اردو اکیڈمی لکھنؤ اسے اپنے ہاں منتقل کر لیں) مجھے معلوم ہوا کہ ایک صاحب باقی ماندہ اسٹاک بھارگوا خاندان سے خرید کر امریکہ لے گئے ہیں اور اسی عیدالفطر کی شام ایک پارٹی میں رابعہ رام کمار بھارگوا کی بھتیجی بھارتی بھارگوا (بیگم جاوید لئیق) نے بتلایا کہ ایک جاپانی بچی کچھی کتابیں ٹوکیو لے گیا تو یہ سن کر میری عید ہو گئی اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اردو اکیڈمی دہلی نے ایک نول کشور ایوارڈ ناؤنس کیا ہے!

اگر نول کشور کا یہ ذخیرہ بچ جاتا تو پرانے اردو ناول کی ایک مبسوط تاریخ مرتب کی جا سکتی تھی۔

ادھر دارالاشاعت پنجاب لاہور کا سارا اسٹاک ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کے تمام فائیل وارثوں کی آپسی مقدمہ بازی میں تلف ہو گئے۔

وائے ناکامی متاع کارواں۔الخ

اردو میں تحقیق کا بھی جو حال ہے سو ہے۔ پی۔ایچ۔ڈی مینوفیکچر کرنے والی فیکٹریوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً مقالے جانچنے کے لیے مجھے بھیجے گئے ان میں سے چند حیرت انگیز حد تک غیر معیاری تھے۔ان کے نگراں اساتذہ نے شاید ان کو دیکھا ہی نہیں۔ میں نے نوٹ لکھ کر واپس کیے کہ دوبارہ لکھوایا جائے لیکن ان کو ڈاکٹریٹ دے دیا گیا۔عموماً اس قسم کے مقالوں پر یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے کہ ڈاکٹریٹ دے دیجیے مگر ان کو چھپوایا نہ جائے۔

O Tempa O Mores!

انتہائی Trivial موضوعات پر پی ایچ ڈی حاصل کرنا اب عام دستور ہے۔

مولانا حالی نے مولویوں کے لیے فرمایا تھا:

اماموں کا درجہ نبیؐ سے بڑھائیں
نبیؐ کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں

ہمارے بعض مفتیان تنقید کا بھی یہی شیوہ ہے۔ جسے چاہا آسمان پر چڑھایا۔جس کے لیے جو چاہا اندھا دھند لکھ دیا۔غیر ذمے دارانہ بیانات کی بھی کوئی کمی نہیں۔ابھی اردو افسانوں کی ایک انتھالوجی امریکہ میں چھپی ہے جس کے مرتب پروفیسر محمد عمر میمن نے بوجہ سہل انگاری اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:

There was nothing remotely resembling
a short story before Prem Chand.

کچھ سہل انگاری، کچھ مروت، کچھ ذاتی پرخاش، ذاتی تعصبات، احباب نوازی غرض کہ فکشن کی بیش تر تنقید اپنا اعتبار کھو چکی ہے۔ میرا اوّلین افسانوں کا مجموعہ ایک Teenager کی بچکانہ اور بے ساختہ Outpourings تھیں۔ ہر انڈر گریجویٹ اس دور سے گزرتا ہے جب وہ

انگریزی نظمیں بھی لکھتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اس دور میں بہت انگریزی نظمیں لکھیں۔ جو فیض صاحب نے پاکستان ٹائمز میں شایع کیں۔) بعد میں میرے ان افسانوں میں شعور کی رو وغیرہ دریافت کی گئی اور وہ انداز تحریر کافی ادیبوں نے خصوصاً خواتین نے اپنایا۔ پینتیس سال بعد باسی کڑھی میں ابال آیا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک کتاب بڑے طمطراق کے ساتھ لاہور سے چھپی جس کے افسانے ''ستاروں سے آگے'' والی کہانیوں کا چربہ تھے۔ گرد پوش پر فیض صاحب نے مصطفہ کے لیے تحریر فرمایا: اردو میں پہلی بار اس اسٹائل کے افسانے لکھے گئے ہیں۔'' Et Tu Brutus. (مجھے یقین ہے فیض صاحب نے وہ افسانے پڑھے نہیں۔ بس مارے مروّت کے لکھ دیا)۔

میں نے ''کار جہاں دراز ہے'' لکھا تو ناقدین میری جان کو آ گئے۔ اب ہر تیسرا شاعر اور ادیب اپنی خودنوشت ناول کے انداز میں تصنیف کر رہا ہے وہ جائز اور مباح ہے۔ جو الفاظ میں نے اردو میں متعارف کیے تھے وژن، الیوژن، نوسٹلجیا، اردو تہذیب وغیرہ اب وہ عام طور پر استعمال کیے جا رہے ہیں۔ (تازہ ترین نظم محمد علوی کی چھپی ہے بعنوان ڈپارچر۔ گزشتہ اکتوبر مجھے افتخار عارف نے اپنی کتاب لندن سے بھیجی۔ ان سے اسلام آباد فون پر بات ہوئی تو میں نے ان سے کہا ذرا ممتاز مفتی صاحب سے میری طرف سے پوچھنا انھوں نے تمھارے گرد پوش کی عبارت کی آٹھ سطروں میں سات مرتبہ لفظ Hostile کیوں استعمال کیا ہے۔ اردو لفظ نہیں ملا؟)

ایک مدیر نے لکھا ہے میں Total admiration چاہتی ہوں اور تنقید کو Male chauvinism پر مبنی کرتی ہوں۔ تو بھائی روز اول سے آج تک جتنی تنقیص میری ہوئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میں نے محض ایک بار اتنا لکھ دیا تھا کہ فلاں صاحب نے اپنے ناول میں میری تحریروں کے اقتباسات شامل کیے ہیں۔ ایک مغربی ملک سے ان کا میرے نام انگریزی میں چہار حرفی مغلظات پر مشتمل اتنا رکیک خط آیا کہ میں اپنی آنکھوں پر یقین نہ کر سکی۔ میں نے اس خط کی عکسی نقل ان نامور ادیب کے عزیز دوست اور مداح اور مترجم کو امریکہ بھیج دی اور خط تلف کر کے چپکی بیٹھ رہی۔

اپریل 1988 عیسوی میں ایک شام لاہور میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کے ہاں دعوت پر

لاہور کے سبھی ممتاز اہل قلم جمع تھے۔ ایک ادبی بحث زور شور سے جاری تھی۔ اس وقت اعجاز حسین بٹالوی نے مجھ سے کہا تم بھول گئیں فیض صاحب تو مہاتما بدھ ہو گئے تھے۔ میں نروان کی اس اسٹیج پر نہیں پہنچی ہوں۔ پھر بھی چونکہ ایک خاتون ہوں اکثر خاموش رہنا پڑتا ہے۔

میں Feminist نہیں ہوں۔ یہ تحریک میرے لیے ایک پیش پا افتادہ چیز ہے۔ کیونکہ (پھر وہی اپنے گھر کی مثال) آج سے تقریباً سو سال قبل 1898 عیسوی میں اکبری بیگم نے اپنا ناول آزادی نسواں کے متعلق شائع کیا تھا اور میرے والدین تحریک آزادی نسواں کے علمبرداروں میں سے تھے (نہ جانے آج کل تحریک آزادی، نسواں عجیب وغریب ترجمہ ''جنبش زناں'' کیوں کیا گیا ہے) لہٰذا یہ جتنے ادبی سماجی رویّے اور فیشن اور مغربی طرز حیات وغیرہ بہت قابل تقلید اور بڑے انوکھے سمجھے جا رہے ہیں میرے لیے ان میں کوئی نیا پن نہیں۔

لیکن تنقید کی بوالعجبوں پر چپ رہنا ذرا مشکل ہے۔ پہلے ''چاندنی بیگم'' جھاڑ کا کانٹا بن گئیں۔ اب ''ناچ گرل'' پر مجھے ایک چھوڑ دو مضمون لکھنے پڑے۔ مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ ایک ذمے دار یونیورسٹی پروفیسر اقتدار عالم خاں لکھ رہا ہے کہ اس نے اصل فارسی مخطوطہ کے متن کا موازنہ ترجمے سے کیا اور اسے اصل کے مطابق پایا۔ میں لکھ رہی ہوں کہ میں نے ''نشتر'' کے متن کے بہت Faithful ترجمے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کا Flavour باقی رہے۔ لیکن دونوں کے بیانات کو دروغ گوئی پر محمول کیا گیا۔ کیوں؟ آخر اس رویّے کی وجہ کیا ہے؟

اب آسان ترکیب یہ ہے کہ اس قضیے کو مزید الجھانے کے بجائے صدیقی اور سرمست صاحبان دلّی اور حیدرآباد سے اور مظفر علی سید (پاکستان سے ویزا بنوا کر) پٹنہ تشریف لے جاویں اور خدا بخش لائبریری میں ایک طرف فارسی نسخہ دوسری طرف ''نشتر'' اور ''ناچ گرل'' رکھ کر لفظ بہ لفظ صفحہ بہ صفحہ (نکتہ بہ نکتہ موبمو) تینوں کے متن کا تقابلی مطالعہ فرمائیں اور جو ترمیم، تنسیخ، تحریف نظر آئے اس کی نشان دہی کرتے جائیں۔

پروفیسر صدیقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''آخر شب کے ہمسفر'' کا آغاز میں نے گورکی کی ماں سے لیا ہے۔ اردو کے ایک مہامارکس وادی سوپر سدھ آلوچک نے لکھا تھا کہ اس ناول کا

پلاٹ میں نے فلم ''سیندور'' سے مستعار لیا تھا۔

عبرت۔عبرت

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ فاضل نقاد ایک ایسے علم پرست اور باذوق قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں نام بھی بے حد نادر اور دو چتر رکھے جاتے ہیں۔ تاجدار کمال، شاندار کمال، شجر حسن، حسب الارشاد حسین، جون ایلیا، زرون، معطرہ، خاسہ، سادسہ فرمانی، فیدیا، عاشورہ۔ خود راقم الحروف کے ایک قرابت دار کا اسم گرامی ہے نواب زادہ سید انتقام علی خان۔ بچہ بچہ اس جزیرہ سخوران کا بقراط ہے اور ہر تیسرا شخص ادیب، شاعر، مرثیہ گو، یا دکیل۔ اب یہی ملاحظہ کیجیے۔ ''قرۃ العین حیدر حقائق کو مسخ کر رہی ہیں۔ گمراہ کر رہی ہیں۔'' معلوم ہوتا ہے ادبی بحث نہیں ہے، فوج داری کا مقدمہ چل رہا ہے۔

لیکن اے معزز ناظرین میں سمجھتی ہوں کہ مسماۃ خانم جان کا کیس اب خارج کیا جائے کیونکہ یہ بوریت کی حدوں کو پار کر چکا ہے۔ آئندہ اس مسئلے پر مزید مناظرے، مباحثے، مجادلے، جرح کو منسوخ کیجیے۔

خلاصہ: کتاب پڑھے بغیر اس پر بحث کرنا مناسب نہیں۔

شکریہ۔ وعلیکم السلام

(سہ ماہی 'جامعہ'، جنوری-مارچ 1995)

حواشی:

1. موغات نمبر 5
2. موغات
3. ناچ گرل تبصرہ از سیدہ حمید مترجمہ نجم الثاقب شحنہ
4. 1856 عیسوی میں سید احمد خاں صدر امین بجنور نے راقمہ کے پردادا بندے علی سے ایک خط میں غلام قادر روہیلہ کے متعلق استفسار کیا تھا جب وہ ایک تاریخ لکھنے میں مصروف

تھے۔

5. خوش قسمتی سے مجھے ایک بار امریکہ میں پروفیسر اسپیر سے تبادلہ خیالات کا موقع مل چکا ہے۔

6. کاتب نے کوٹ کورٹ کر دیا ہے۔

7. E.S. Harcourt & Fakhir Husain, "The Last Phase of Oriental Culture by Sharar.

8. یہ بھی کاتب کی غلطی ہے حسن شاہ ضبط ہونا چاہیے۔

9. حسین شاہ حقیقت اور ان کا خاندان صفحہ 237

10. حسن شاہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے امام موسیٰ کاظم کی اولاد تھے۔

11. بحوالہ مشرف احمد

12. چت پاون برہمنوں کے لیے ایک روایت یہ بھی کہ وہ ایک قدیم انڈو جرمن نسل سے ہیں۔

13. جنرل تھمیا اور جنرل کری اپا کورگی تھے۔

14. کسی غلط فہمی کی بنا پر شمیم احمد مرحوم نے کہیں یہ بھی لکھا کہ میں سلیم احمد مرحوم کے ساتھ لال باغ لکھنؤ کے اسکول میں چھٹی کلاس میں پڑھتی تھی۔ میں نے لال باغ اسکول میں کبھی نہیں پڑھا۔

15. قرۃ العین حیدر کے دو اور ناول، از شمیم احمد، سوغات (5)

16. ان کی موجودہ پیڑھی کے ایک فرد کلکتہ کے سینما ہال میں ٹکٹ بیچتے تھے۔

17. پندرھویں صدی جونپور کی فراموش شدہ سلطنت

18. بیگم سمرو نے بھی ایک کشمیری نژاد رقاصہ کی حیثیت سے اپنا کیریر شروع کیا تھا۔

19. یہ شاید اس طرف تھا جہاں آج کل لکھنؤ میڈیکل کالج ہے۔

20. اس ''نئے قانون'' پر افسانہ لکھنے کے لیے ایک منٹو درکار تھا۔

21. گوہر سلطان، حفیظ جاوید سے شادی کر کے بی بی سی لندن چلی گئیں۔ ''اگلے جنم موہے بیٹانہ کیجو'' میں صدف آرا بیگم کا قصہ میں نے انھی کو ذہن میں رکھ کر لکھا تھا۔

22. مطبوعہ مخزن سلسلہ وار، 1906ء
23. مطبوعہ مخزن فروری، 1906ء
24. مطبوعہ مخزن 1900ء
25. مطبوعہ مخزن، 1907ء
26. مطبوعہ مخزن، 1907ء
27. امتیاز علی تاج کا اُلو کی زبان Monkey's Paw چچا چھکن، جیروم کے جیروم، قدسیہ زیدی کا خالد کی خالہ Charlie's Aunt
پاکستانی ٹیلی ویژن کا ایک مقبول ترین پلے ناچیز کے ایک انگریزی ناول کے اردو ترجمے پر مع مکالمے کے بغیر حوالے کے ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ جارجٹ ہیئر اور ملز اینڈ بون کے قصوں پر وہاں کے مقبول سیریلز کو تعمیر کیا جاتا ہے۔ لکھنؤ دوردرشن کے ڈائرکٹر نے بتلایا کہ میرے متعدد قصے اور ناول ٹی وی سیریلز میں Plagiarise کر لیے گئے ہیں۔
28. فرائیڈے ٹائمز، 9 فروری 1994ء
29. حال میں ایک شادی میں رونمائی کی تقریب تھی دلہن کسی دوسرے شہر کی تھی۔ اس کی سسرال کا ایک چھ سالہ بچہ بھاگا بھاگا آیا اور اس کا گھونگھٹ اٹھا کر بولا۔ ''کھپ گئی''۔ اور بھاگ گیا۔

آزادی کی چھاؤں میں

(تنقیدی جائزہ)

فرانس کے ایک نامور مصنف موسیو دومینک لاپیئر Dominic Lapiere نے ایک انگریز مصنف لیری کولنز کے ساتھ مل کر دو تہلکہ خیز کتابیں لکھی ہیں "PARIS IS BURNING" دوسری جنگ عظیم کے دوران پیرس پر نازی تسلط کے متعلق اور دوسری ''اویروشلم'' جنگ اسرائیل کے بارے میں ہے۔ موسیو لاپیئر کی تازہ ترین کتاب "FREEDOM AT MIDNIGHT" کا موضوع تقسیم ہند ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اور پبلسٹی کے سلسلے میں فرانسیسی ناشرین کا ایک گروہ حال ہی میں پاکستان اور ہندستان آیا جہاں دونوں حکومتوں کی طرف سے اس کا دھوم دھام سے استقبال کیا گیا جس کی تفصیل امریکن ہفتہ وار رسالے ''نیوز ویک'' میں شایع ہوئی ہے۔

"FREEDOM AT MIDNIGHT" مختلف یورپین زبانوں میں چھپ کر لاکھوں کی تعداد میں بکے گی اور ساری دنیا کے لوگ اسے پڑھیں گے۔ اس کتاب کے لیے مسالہ جمع کرنے کی غرض سے موسیو لاپیر کچھ عرصہ قبل ہندستان آئے تھے، مختلف لوگوں سے ملے ایک روز غریب

خانہ پر تشریف لائے ان کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ کانگریس مسلم لیگ اور تقسیم کے سیاسی اور عمرانی پس منظر سے موصوف کی واقفیت واجبی سے ذرا کم ہی تھی۔ بعد میں انھوں نے جو ریسرچ کی ہو سو کی ہو۔ بہر حال ناچیز سے دریافت کیا 1947 میں آپ کس طرح پاکستان گئیں۔

میں نے مسوری اور دلی کے فسادات کے متعلق مطلع کیا۔

پوچھا "اس وقت دلی کی فضا کیسی تھی؟"

عرض کیا "ہم لوگ رفیع احمد قدوائی صاحب کے ہاں چند روز کے لیے مقیم رہے۔ رات کے وقت میرے بھائی اپنے ایک ہندو صحافی دوست مسٹر شرما کے ساتھ نئی دہلی کا چکر لگا کر آئے اور بتایا کہ اس وقت کناٹ پلیس WAR TIME یورپ کے کسی شہر کی طرح ویران اور تاریک پڑا ہے۔ فرمایا آپ کے بھائی کو کس طرح معلوم ہوا کہ WAR TIME یورپ کے شہر ویران اور تاریک تھے؟"

تب میں نے سوچا ان بزرگوار بین الاقوامی شہرت کے فرنچ مصنف کو کچھ بتانا لاحاصل ہے۔ مگر اخلاق کا تقاضا تھا کہ ان کے سوالات کے جواب دیتی جاؤں۔

پھر دریافت کیا "آپ لوگ پاکستان کس طرح گئے۔

عرض کیا۔ "رفیع احمد قدوائی صاحب نے ایک ڈیکوٹا طیارے کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس طیارے میں مردولا سارا بھائی ہندو سکھ مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لیے لاہور جا رہی تھیں۔"

"رفیع احمد قدوائی اور مردولا سارا بھائی کون؟" استفسار فرمایا میں نے اکتا کر کہا "اب دوسرا سوال پوچھیے۔"

"آپ کے ساتھ اور کوا، تھا؟"

"میری والدہ، بڑے بھائی۔ بھابی اور ان کی دو خورد سال بچیاں۔" "کیا کیا سامان ساتھ لے گئے تھے آپ لوگ؟"

"صرف پہننے کے چند کپڑے اور بھابی نے اپنا شادی کا بھاری جوڑا ساتھ رکھ لیا تھا۔"

"ویڈنگ کوسٹیوم" پر موسیو لاپیر کی آنکھوں میں چمک آئی۔ یہ گویا ہیومین ٹچ کی بات تھی۔

''یہ ویڈنگ ڈریس کس رنگ کا تھا؟ کہاں سلا تھا؟''

''سرخ۔ لکھنؤ میں سلا تھا۔''

نوٹ بک اور پنسل سنبھال کر پوچھا۔''اس درزی کا نام اور پتہ یاد ہے جہاں یہ ڈریس سلوایا گیا تھا؟''

''کیا آپ لکھنؤ جا کر اس درزی کو انٹرویو کریں گے؟ ہمارے ہاں شادی کے جوڑے گھر پر سیئے جاتے ہیں۔''

''اوہ اچھا یہ بتایئے دلی سے روانہ ہوتے وقت آپ نے اپنے بوائے فرینڈ کو کس طرح خدا حافظ کہا؟''

''دیکھیے صاحب جس طرح ہمارے ہاں کرسچین ڈوئیر کی قسم کے فیشن ہاؤس نہیں ہوتے جہاں شادی کا لباس سلوایا جائے اسی طرح بوائے فرینڈ بھی نہیں ہوتے۔''

یہ تقسیم ہند کے المیے کے متعلق معلومات حاصل کرنے والے ایک مغربی مصنف کی اپروچ تھی۔ ان کی کتاب میں نے ابھی نہیں پڑھی ہے۔ ممکن ہے بعد میں فاضل مصنف نے اپنے پروجیکٹ کے سلسلے میں زیادہ معقولیت سے اپنا ہوم ورک کیا ہو۔ بہر حال جیسا میں نے شروع میں عرض کیا، اس یہودی نژاد مشہور و معروف فرانسیسی ادیب کی کتاب لاکھوں کی تعداد میں بکے گی اور شاید ہالی ووڈ میں اس پر مبنی ایک عدد فلم بھی بن جائے۔

اب اسی کرب ناک موضوع پر ایک اور کتاب کو لیجیے۔ اس کا نام ہے''آزادی کی چھاؤں میں''۔ مصنفہ بیگم انیس قدوائی یہ ایک حساس مخلص اور انسان دوست خاتون کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کی داستان ہے جن کی ساری زندگی بلا تخصیص مذہب و ملت اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرتے گذری ہے۔''آزادی کی چھاؤں میں''ایک مستند اور غیر جانب دار دستاویز ہے لیکن یہ اہم کتاب صرف ایک ہزار کی تعداد میں چھپی ہے اور ہزار دو ہزار لوگ اسے پڑھیں گے۔

1947 کے فسادات کیوں ہوئے ایسی بھیانک بربریت کا مظاہرہ کیوں کیا گیا۔ اس پر

پچھلے ستائیس سال میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن چند بنیادی سوال جوں کے توں موجود ہیں۔ مصنفہ نے ان سوالات کا تجزیہ بھی کیا ہے کیونکہ انھوں نے خود 1947 کی آتش نمرود میں بے خطر کود کر حالات کا مقابلہ کیا اور ان خوف ناک مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ دیباچے میں فرماتی ہیں ''ان دنوں حالات نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی تھی کہ غیر جانب داری انصاف اور انسانیت کا دامن پکڑے رہنا بعض وقت مشکل ہو جاتا تھا۔ لیکن اسلام کے اس صحیح اولین تصور کا نقش اور گاندھی جی کے فیض صحبت سے اتنا ہوش باقی تھا اور مجھے یقین رہا کہ آدمیت عین اسلام ہے اور اسلام عین انسانیت۔''

انیس قدوائی ان کلاسیکل گاندھی وادیوں میں سے ہیں جو اب ہندستان میں خال خال نظر آتے ہیں۔ ایک وطن پرست خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جن کا احوال یہ ہے کہ جب ان کی پھوپھی کی لڑکی رفیعہ پیدا ہوئی اس وقت مع شوہر گھر کے سارے مرد بسلسلہ جنگ آزادی جیل میں مقید تھے۔ لہذا بچی کا نام آزادی رکھا گیا۔

لیکن آزادی کے بعد انیس باجی پیشہ ور سیاست داں نہیں بنیں۔ حسب معمول نام ونمود سے بے نیاز ان تھک قومی خدمت میں مصروف رہیں۔ ''لال رومال'' گاندھین قوم پرستی، جمعیۃ العلما ہند، احرار پارٹی، خدائی خدمت گار وغیرہ تحریکوں نے ہندستان میں وطن پرست، دین دار، راست باز، خدا رسول کے عاشق مسلمانوں کا ایسا طبقہ پیدا کیا تھا جس نے سخت ترین مصائب کا مقابلہ کر کے اور بڑی سے بڑی ذاتی قربانیاں دے کر آزادی کی لڑائی لڑی۔ فرقہ پرستوں کی دشنام طرازی کا سامنا کیا اور اپنے مسلک پر سختی سے قائم رہے۔ وہ آزادی کے بعد کی RAT RACE میں شامل نہیں ہوئے۔ زیادہ تر گم نام ہیں یا بھلا دیے گئے۔

یعنی

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

جنگ آزادی میں ان وطن پرست مسلمانوں کے عظیم الشان رول کے متعلق اب تک

ڈھنگ سے کچھ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ ''آزادی کی چھاؤں'' میں ان پر خلوص اور دین دار مسلمانوں بالخصوص جمعیۃ العلما اور جامعہ ملیہ کے اراکین کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ خود مصنفہ اس گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے اس خوف ناک زمانے کی سیاست کے چند ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور ایسے افسوس ناک واقعات کی نشان دہی کی ہے جس کا ذکر آج تک کہیں نہیں کیا گیا۔

داستان ستمبر 1947 سے شروع ہوتی ہے۔ انیس باجی کے شوہر شفیع احمد قدوائی اس وقت مسوری میں تعینات تھے۔ فسادات شروع ہو چکے تھے۔ ''ایک دن مسوری میں صبح صبح نہاتے میں انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

کسی کے منہ سے نہ نکلا یہ میرے دفن کے وقت
کہ ان پر خاک نہ ڈالو یہ ہیں نہائے ہوئے

اس بدشگونی پر مجھے بہت غصہ آیا۔ کافی دیر تک جھگڑتی رہی۔ وہ ہنستے رہے۔ چند روز بعد مصنفہ کو کسی ضروری کام سے لکھنؤ آنا پڑا۔ شفیع صاحب شدید خطرہ کے باوجود مسوری میں موجود مظلوموں کی مدد کرتے رہے۔ وہاں سے لکھا ''خدا کو حاضر و ناظر جاننے کے یہی مواقع ہوتے ہیں۔ میرے لیے دعا کرو۔ قلب کو مضبوط کر دے اور موت کا خوف کسی ایسی بات کے کرنے میں مانع نہ ہو جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں۔

شفیع صاحب کو ''وارننگ'' مل چکی تھی۔ مگر وہ جان کو خطرے میں ڈال کر فساد زدگان کی خدمت میں مصروف رہے اور ۷ اکتوبر کے روز شہید کر دیے گئے۔

یہ غضب ناک سانحہ بہادر سے انسان کے قدم ڈگمگا سکتا تھا۔ ''کیسی تاویلیں کیں۔ کتنی دعائیں خدا سے مانگیں کہ بارالہا جس استقلال کی دعا شفیع صاحب مانگ رہے تھے وہ اب مجھے عطا کر دے۔ دلی آ کر گاندھی جی سے کہا۔ میں بھی اسی طرح خدمت کرتے ہوئے مرنا چاہتی ہوں۔ جس طرح شفیع صاحب نے جان دی۔''

اور اس کے بعد پرانے قلعے اور ہمایوں کے مقبرے کے میدان حشر اس لرزہ خیز دور کے

حالات کا اندازہ صرف ان ابواب کو پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ ''میں دلی کے نواب زادوں اور بیگمات اور روسا کو ڈھونڈتی رہی نہ وہ پناہ گزیں تھے نہ پناہ گزینوں کی مدد کرنے والے۔ دونوں کیمپوں میں بساطی، کرخندار، سادہ کار، رائی نیاریے ملازمت پیشہ سبھی تھے، مگر دلی کا اعلیٰ طبقہ اپنی شستہ تہذیب اور کوثر میں دھلی ہوئی زبان لے کر معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ معلوم ہوا وہ لوگ دو دو ایک ایک دن کیمپ میں ٹھہر کر ستمبر ہی میں پاکستان چلے گئے تھے۔''

بہرکیف ''زیادہ تر غریب ہی مارے گئے۔ غریب ہی زخمی اور لاوارث ہوئے۔ غریبوں ہی کو وباؤں نے ہلاک کیا اور بے ایمانوں نے کیمپ میں بھی بلیک مارکیٹ کی۔''

بہت طویل اور خونچکاں قصہ ہے۔ ''میں کہیں انسان کو ڈھونڈتی تھی کہیں مسلمان کو روتی تھی۔''

پھر پنجاب سے شرنارتھیوں کی آمد۔ ان کے دل دوز مصائب، لاوارث بچوں کے المیے ایک بچہ ہسپتال میں اطمینان سے کہتا ہے۔ ''یہ دیکھو یہ رشید ہے اس کے تو سب مر گئے اور وہ جو زینب ہے۔ اس کے بھی سب مر گئے۔ اور بابو کی اماں کا گلا کاٹ دیا گیا۔ بچوں نے اتنی خونریزی دیکھی تھی کہ چار سال کی عمر میں خون خون پکارتے تھے اور موت کا مذاق اڑاتے تھے اور اس کے آنے کی دعائیں مانگتے تھے۔ آخر یہ خونی دماغ میں یہ پتھر دل محبت سے ناآشنا بچے کہاں جائیں گے۔ یہ نسل تو ڈوبی ہی ہے۔ حال تو بدتر ہے۔ مستقبل بھی تباہ ہو رہا ہے۔ آئندہ نسل اس سے بھی کئی گنا بڑھ چڑھ کر اندھی ہوگی۔''

کیمپ میں ایک قوال کی حالت بہت قابل رحم تھی۔ ''رونی صورتیں رونی آوازیں سن کر حیران ہو گیا اور میرے پاس آ کر کہنے لگا۔ اس وقت آپ اطمینان سے بیٹھی ہوں تو کچھ عرض کروں۔

میں نے کہا آپ کون ہیں کیا چاہتے ہیں۔

اس نے ادب سے کہا۔ حضور مراثی ہوں بس حضور کو ایک چیز سنا دوں۔''

دلی کے نواح کی تباہی۔ ''ہم سب آگے بڑھے تو خالی مکانوں سے پاؤں کی چاپ سن کر

کتوں نے منہ نکال کر جھانکا۔ شاید اب تک اپنے مالکوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ بھوک نے انھیں ادھ موا کر دیا تھا۔''

مغویہ لڑکیوں کی خوف ناک کہانیاں۔ غنڈہ گردی کی گرم بازاری۔ ''لفظ غنڈہ سن کر ذہن فوراً ایک ایسے نوجوان کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ جو بالوں میں تیل ڈالے سلیقہ سے کنگھی کیے پان چباتا پارک میں عورتوں پر آوازے کس رہا ہو لیکن زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ اب غنڈہ گھروں میں رہتا ہے۔ دفتروں میں کام کرتا ہے۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھتا ہے۔ یونیورسٹی یونین کا صدر ہو سکتا ہے۔ پبلک کا لیڈر رہتا ہے۔''

نفرت اور جنون نے انسان کے دل دماغ پر کیا اثر کیا۔ ان دنوں جب میں شہر کی گلیوں میں پھر رہی تھی تو میں نے بے شمار ہندو مسلم ماں بہنیں دیکھیں جو اس پر بہ ضد تھیں کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ اور ابھی اور ہونا چاہیے یا ایک بار ہتھیار مل جائیں تو معرکہ ہو جانا چاہیے۔ عورتوں کے اندر یہ درندگی کیسے پیدا ہو گئی تھی۔؟''

چھوٹے چھوٹے لیڈروں کی باہم ذاتی چپقلش، سرکاری اہل کاروں کے مظالم اور بے انصافیاں اور ان سب چکیوں میں پسنے والے غریب ہندو مسلمان سکھ فساد زدگان۔

انیس قدوائی ان کی لڑکی کشور، سمدھ راجوشی، مردولا سارا بھائی اور ان کے ساتھیوں نے پناہ گزینوں کے کیمپوں اور فساد زدہ نواحی دیہات میں ان تھک کام کیا اور جب پناہ گزیں پاکستان گئے شرنارتھیوں اور مغویہ لڑکیوں کی بحالی اور آبادکاری اور لاوارث بچوں کی تعلیم و تربیت میں جٹ گئیں نہ جانے یہ خواتین تھیں یا قوم جنات سے تعلق رکھتی تھیں۔ مجال ہے جو کبھی مایوسی، بےزاری یا تھکن کا احساس انھیں ہوا ہو۔ وجہ محض ایک تھی شدید آئیڈیلزم، اصول پرستی اور انسان دوستی۔

انیس قدوائی کہنہ مشق مضمون نگار ہیں اور حس مزاح ان کو اپنے والد اردو کے صاحب طرز مزاح نگار ولایت علی بمبوق مرحوم سے ورثے میں ملی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

''ایک ورکر جو صورتاً نہ شیعہ معلوم ہوں نہ سنی کوئی ان کو کمیونسٹ سمجھتا تھا اور کوئی بگڑا ہوا ملا۔ زبان خالص دہلی کی بولتے تھے اور حلیہ مدراسی تھا۔ بہت کم بات کرتے تھے اور مسکراتے ہر

وقت تھے۔ اسی مسکراہٹ نے دوستوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ بہت خوش مزاج ہیں۔ اکثر خفا ہو جاتے تھے اور ہفتوں خفا رہتے تھے۔"

تین سو پچھتر صفحات کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد خیال آتا ہے کہ دانتے کا جہنم ایک پکنک رہی ہوگی یہ کوئی نئی دریافت نہیں ہے کہ انسان ایک دوسرے کے حق میں درندے ثابت ہوتے ہیں۔ ساری تاریخ عالم اس حقیقت کی گواہ ہے۔ صرف اس صدی میں دو عالم گیر جنگیں ہیروشیما، کوریا، ویت نام، کمبوڈیا، الجزائر، فلسطین وغیرہ وغیرہ بہت طویل فہرست ہے لیکن 1947 کی کارستانی ہم لوگوں نے خود کی تھی اور اس قسم کی کارروائیاں برصغیر میں جب سے لے کر آج تک وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں اور دونوں ملکوں میں نصاب تعلیم کے ذریعے بچوں کے ذہنوں میں مزید تعصب اور نفرت کے بیج بوئے جا رہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ تشدد اس وقت ایک عالم گیر رویہ ہے۔ ہر ملک کی نوجوان نسل تیزی سے تخریب پسند ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن مصنفہ کا یہ تجزیہ بھی بالکل درست ہے کہ برصغیر میں اخلاقی تنزل، تشدد، سخت دلی اور بے انصافی کی گرم بازاری 1947 کے واقعات کی دین ہے۔ ہمارے ماہرین تعلیم اور ماہرین عمرانیات کو اس نکتے پر غور کرنا چاہیے۔

کاش آزادی کی بھاؤں میں انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندستان کی ہر زبان میں ترجمہ ہو کر شایع ہو سکے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کرے گا کون۔ کیا یہی بات کم عبرتناک ہے کہ یہ غیر معمولی کتاب 1949 میں لکھی گئی اور اس کے چھپنے کی نوبت 1974 میں آئی۔ قومی ایکتا پریس، 15 بلونت رائے مہتہ روڈ لین، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت 40 روپے، صفحات 376 ہیں۔

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی، اگست 1975)

مصنف کے مسائل

مصنف کے مسائل سب کو معلوم ہیں میں کون سی نئی بات آپ کو بتاؤں گی۔ آئے دن ان مسائل پر شاندار سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ جن پر مختلف سرکاری اور نیم سرکاری ادارے لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ لیکن جب ایک نامور ادیب اردو زبان کا مرتا ہے سب کے ذہنوں میں پہلا خیال یہ آتا ہے ''مرحوم کے بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔؟''

اردو ادب اور ادیب کی یتیمی اب ایک ضرب المثل کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہے۔ جہاں بھی آپ کو کوئی تباہ حال فرسٹریٹیڈ ادیب یا شاعر نظر آئے پہچان لیجیے اور ایمان لے آئیے کہ وہ اردو زبان میں لکھتا ہے۔ اس یتیم دیسیر کے لیے چند ادارے قائم کیے گئے ہیں جہاں سے اسے اس کی کسی کتاب پر 500 یا ایک ہزار کے انعام کی شکل میں خیرات مل جاتی ہے تو وہ پھولا نہیں سماتا۔ اس کے مضامین یا افسانے یا کلام ان رسالوں میں چھپتے ہیں جن کی تعداد اشاعت ایک ہزار سے زیادہ نہیں۔

یہ اردو کے موجودہ ادیب کی دنیا اور اس کے قارئین کا حلقہ ہے۔ اتنی المناک اور عبرتناک حد تک مختصر بساط پر ہم اردو ادب کی بات اتنی دھوم دھام سے کیوں کرتے ہیں؟

سیدھی بات یہ ہے کہ جب تک ہندی ریاستوں کے اسکولوں میں اردو نہیں پڑھائی جائے گی پہلے اس کے قارئین کا حلقہ معدوم ہوگا پھر اردو پھر اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر۔

اردو اس وقت بھی ایک سماجی تفریح بن چکی ہے۔ مثلاً ایک نئی کتاب جس کا صرف پانچ سو یا ہزار کا اڈیشن (اکثر مصنف کے اپنے پیسے سے) چھپتا ہے اس کے افتتاح کے عصرانے پر ایک آدھ وزیر یا کوئی اور بڑا آدمی مدعو کیا جاتا ہے اور اس ادیب کی گل پوشی ہوتی ہے۔ (ادیب کی گل پوشی میری سمجھ میں آج تک نہ آئی) اس طرح ادب تفریح کے علاوہ اکثر سماجی ترقی کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔

لیکن حضور والا ایک ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب نہ اردو ادب رہے گا نہ گل پوش ادیب۔

کیا میں حد سے زیادہ قنوطی ہو گئی ہوں؟ دیکھیے اتنی کتابیں تو شایع ہو رہی ہیں۔

کتنی کتابیں؟ ذرا ایک سال کے اندر چھپنے والی تمام اردو کتابوں کے اعداد و شمار جمع کرنے کی زحمت گوارا کیجیے۔ ان کتابوں کے موضوع کیا ہیں؟ کتنی بکتی ہیں؟ ان مصنفوں کو کتنی رائلٹی ملتی ہے؟ ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟

میرے سامنے مسئلہ ادیب اور قاری کے مابعد الطبیعاتی رشتے، ترسیل وغیرہ کا نہیں ہے جب پڑھنے والے ہی نہ رہے آپ کمیونی کیٹ کس سے کیجیے گا۔ میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرے قارئین کی تعداد اردو میں اتنی کم کیوں ہے۔ اور اگر بحیثیت مصنف (پروفیشنل مصنف نہیں جو ہمارے ہاں تقریباً نایاب) مالی لحاظ سے میں ہمیشہ نقصان میں رہی ہوں تو اس کے اسباب کیا ہیں؟

پرانا رونا ہے کہ صاحب لکھنے والے کو پیسہ نہیں ملتا۔ آخر کیوں نہیں ملتا؟

ہمارے پاس خود پیسہ نہیں ہے۔ رسالہ بند ہونے والا ہے۔ مکتبہ بڑی مشکل سے چلا رہے ہیں۔ کتابیں آج کل کون خریدتا ہے؟

اور جو دولت مند پبلشر ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟

اور اس ساری کشمکش، تلخی، رقابت اور ذاتی بغض وعناد کی ایک بنیادی وجہ ادیبوں کی مالی ناآسودگی ہے۔ متمول معاشروں کے متمول ادیب کو ان جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

اور کیا عرض کروں۔ والسلام

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی، اگست 1975)

مایابازار

25 جون 1852 کے نیویارک ڈیلی ٹری بیون میں ایک مضمون بہ عنوان British Rule in India شایع ہوا، اس میں لکھا تھا:

Indian society has no history at all, at least no known history. What we call its history, is but the history of the successive intruders who founded their empires on the passive basis of that unresisting and unchanging society. the question, therefore, is not whether the English had a right to conquer India, but whether we are to prefer India conquered by the Turk, by the Persian, by the Russian, to India conquered by the Briton...

England has to fulfil a double mission

in India, one destractive, the other regenerating.....the annihilation of old Asiatic society and the laying of the material foundation of Western society.

مضمون نگار کوئی خرانٹ انگریز امپریلسٹ نہیں چچا کارل مارکس تھے۔ انھوں نے مزید تحریر کیا۔

English interference having placed the spinner in Lancashire and the weaver in Bengal, or sweeping away both Hindu spinner and weaver, dissolved these small semi-barbarism, semi-civilised communities, by blowing up their economical basis, and thus produced the greatest, and, to speak the trugth the only social revolution ever-heard of in Asia.

1857 میں بالخصوص لکھنؤ میں انگریزوں کے بے پناہ مظالم کی مارکس اور اینگلز دونوں نے مذمت کی۔ مگر بہرحال اپنے نقطۂ نظر سے مارکس برطانیہ کی اقتصادی بہبود اور ترقی کا خواہاں تھا اور اس سلسلے میں ہندستان کی حیثیت اس کے نزدیک ضمنی تھی۔

کلاسیکل مارکسزم کے بہت سے نظریات اور پیش گوئیاں غلط ثابت ہوئیں تو ہمارے ایک پرانے کمیونسٹ دوست نے کہا وہ Creative Marxism پر یقین رکھتے ہیں (گویا اجتہادی اسلام) اور ایک دانش ور سرخ خاتون نے بتلایا کہ وہ اب مارکسیت اور تصوف کے امتزاج کی قائل ہیں وغیرہ۔

میری بھانجی دشکا حیدر سیّد نے اپنی کتاب

Exporting Communism to India: Why Moscow Failed

حال ہی میں مجھے اسلام آباد سے بھجوائی ہے جو اسی سال نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ اسلام آباد نے شایع کی ہے۔ یہ دشکا کا مقالہ ہے جس پر کئی سال ہوئے ان کو لندن اسکول آف اکنامکس سے ایم فل کی ڈگری ملی تھی۔ اس سے پہلے ایل۔ ایس۔ ای سے انھوں نے اکنامکس میں بی۔ ایس۔ سی کیا۔ اب وہ کولمبیا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر رہی ہیں۔

دشکا نے زیرِنظر کتاب میں 1920 سے 1930 تک کے حالات یعنی ایم۔ این۔ رائے پیریڈ کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے۔ کتاب کا گرد پوش پاکستان کے ایک بنیادی ڈیلما کا عکاس ہے۔ مقالے میں 1930 تک کے ہندستان کے معاملات پر بحث کی گئی ہے لیکن کور پر جو نقشہ بنا ہے اس میں گہرے سبز رنگ سے پاکستان اور بنگلہ دیش بھی شامل ہے۔

توبہ توبہ 30-1920 کے غیر منقسم ہندستان کا نقشہ بھلا کس طرح پیش کیا جاتا؟ اس سے 1994 کے پاکستان کی سالمیت پر حرف نہ آتا؟ شکر ہے کہ دشکا نے انڈیا کو انڈیا ہی لکھا ہے۔ بھارت یا ''پاک انڈین سب کونٹی نینٹ'' نہیں بتایا۔ ورنہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ اردو ادب میں ہندستان خسرو کے دور سے ''پاک و ہند'' چلا آ رہا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جسے سید سبطِ حسن جیسے مارکسسٹ بھی حل نہ کر سکے۔ شاید یہ مسئلہ برصغیر تک ہی محدود نہیں، ساری تاریخِ عالم میں سرحدوں کے جذباتی اور سیاسی تعین، قوموں کی تشکیل اور ان کی نظریاتی اساس بہت جان لیوا رہی ہے (آج اس گھڑی بہت ہی خوفناک ہو چکی ہے) اس معاملے نے اٹلس کے نقشے متواتر بدلے ہیں۔ ہمارا خیال تھا انٹرنیشنل کمیونزم نے سرحدوں، مذہبی عصبیتوں، نسلی اور لسانی نفرتوں کے جھگڑے مٹا دیے۔ معلوم ہوا ہم دھوکے میں تھے۔

انقلابِ روس جسے علامہ اقبال نے بھی خوش آمدید کہا تھا، آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا..... وہ آفتاب گہنا کیوں گیا؟

لیکن کمیونزم کے اس اچانک غیر متوقع خاتمے پر ہندستان میں بغلیں بجانے والوں کو یہ بھی دھیان میں رکھنا چاہیے کہ ہماری کمیونسٹ پارٹیاں ہی مذہبی جنون اور فسادات کے خلاف مخلصانہ آواز اٹھاتی ہیں۔ میں نے شاید 1969 میں ہندی مسلمانوں کے متعلق ایک مفصل مضمون

السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں لکھا تھا جسے پڑھنے کے بعد ٹائمز آف انڈیا کے ایک رفیق کار اور مشہور صحافی پریم شنکر جھا نے اس کے چند حصوں پر بہت اعتراض کیا (زلہ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں) اس وقت انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ کمیونسٹ ہو جائیں۔ میں نے جواب دیا کہ پارٹی نے ان کو اس قدر برگشتہ کر رکھا ہے کہ وہ بڑی تعداد میں کبھی اس کی طرف نہیں آئیں گے خواہ بر بنائے مصلحت وہ ان کے لیے کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو اور چاہے حسرت موہانی اور اسحاق سنبھلی جیسے مولاناؤں کی مثال ان کے سامنے موجود کیوں نہ ہو۔ آپ حضرت ابوذر غفاری کا تذکرہ بھی کر لیجیے، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

دشکا نے اپنی تصنیف میں پارٹی کی انھی غلطیوں کا تذکرہ کیا ہے جن کی بدولت ہندستان میں کمیونزم، ہندو یا مسلمان کسی کے لیے پنپ نہ سکی۔ دشکا نے کارل مارکس کے مذکورہ بالا نظریے کا حوالہ دیا ہے کہ نوآبادیاتی نظام ایشیا کے لیے فائدہ مند ہے جس کی بدولت پس ماندہ غیر متمدن مشرق سرمایہ داری کی طرف بڑھے گا کیونکہ ایشیائی Mode of Production مغربی طریق پیداوار کی طرح اثر آفریں اور ڈائی نیمک نہیں۔ یورپ کی بورژوازی ایک سوشل انقلاب اور سرمایہ داری کی محرک بنی۔ اس طرح بقول مارکس ہندستان کے لیے انگلستان کی امپریلزم ایک Unconscious tools of history ہے۔ دشکا نے اپنے مقالے میں ان وجوہ پر روشنی ڈالی ہے جن کی بدولت ہندستان میں کمیونزم پنپ نہ سکی۔ دشکا کے نزدیک ایم۔ این۔ رائے کی قیادت اور Comintern کی مکمل تابع داری ہندستان میں کمیونزم کی ناکامی کی بنیادی وجہ تھی۔

کارل مارکس نے کہا تھا کہ یورپ اور برطانیہ میں سرمایہ داری کی ترقی کے لیے ہندستان کی خام پیداوار کی جلد از جلد فراہمی اشد ضروری ہے۔ مارکس کے نزدیک برطانیہ کی سرمایہ داری زیادہ اہم اور ہندستان کی حیثیت ثانوی تھی۔ گویا برطانوی نظام لامحالہ ایک برتر نظام تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد گاندھی جی نے اس نظریے کو چیلنج کیا۔

دشکا لکھتی ہیں کہ روس پر جاپان کی فتح اور نوجوان ترک پارٹی کے عروج کے بعد لینن نے عالمی انقلاب کے تناظر میں مشرق کی اہمیت کو پہچان لیا۔ لینن کا خیال تھا کہ ایشیا میں بھی ایک

بورژوا جمہوری انقلاب کی بہت ضرورت ہے۔ یہ تحریکیں جو سامنے آئیں کسانوں اور چھوٹے سرمایہ داروں پر مشتمل تھیں لیکن اصلاح پسند تحریکوں نے امپریل طاقتوں کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس منعقدہ 1920 میں اس موضوع پر گرما گرم بحث ہوئی اور ایم۔این۔رائے نے نئی نظریہ سازی میں اہم رول ادا کیا۔ متعدد ہندستانی انقلابی براہ کابل، ماسکو پہنچ کر لینن سے ملے۔ ملاحظہ کیجیے راقم الحروف کا سلسلہ وار مضمون۔

"The Terrorist"

The Illustrated Weekly of India

June 27, July 4, July 11, 1971.

دشکا لکھتی ہیں.....رائے کا نظریہ مارکس سے مختلف تھا۔ برٹش امپیریلزم نے ہندستان کو اقتصادی طور پر تباہ کر دیا تھا۔ سرمایہ داری کے خاتمے کے لیے مغرب میں پرولتاری انقلاب اور مشرق میں قوم پرست تحریکوں کی کامیابی اشد ضروری تھی۔ رائے کا خیال تھا کہ ان تحریکوں کی قیادت پارٹی کو اپنے ہاتھ میں رکھنی ضروری ہے۔ بقول رائے، گاندھی جی بورژوازی کے ایجنٹ تھے۔ 1929 میں لاہور، دہلی، کلکتہ اور بمبئی میں کمیونسٹ جماعتیں قائم ہوئیں۔ رائے نے کہا طبقاتی جدوجہد بڑھ رہی ہے اور قوم پرست تحریکیں اس سے خائف ہیں۔ رائے نے فیصلہ کیا کہ کانگریس کے بائیں بازو کا ساتھ دیا جائے مگر کانگریس نے ان کی تجویز کو بولشویک کہہ کر مسترد کر دیا۔ اس پلان میں مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ فیوڈل کلاس برطانیہ کی حامی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم سے قبل وہ کسی مصالحت کے لیے تیار نہ تھا لیکن 1920 میں حالات مختلف ہو چکے تھے، عام بے چینی بڑھ گئی تھی۔ لہٰذا برطانیہ کو ''نیٹو اپر کلاس'' سے مراعات کے ذریعہ اتحاد کرنا پڑا تھا۔

رائے نے ایک اہم بات کہی کہ قوم پرست مذہب کا نعرہ لگا کر عوام کی حمایت حاصل کر رہے ہیں (آج ستر سال بعد ہم بی جے پی کی کلچرل نیشنلزم اور اسلامی تجدیدیت کا سامنا کر رہے ہیں اور اس سے پہلے اس چکر میں ملک تقسیم ہو گیا لیکن رائے اور ان کے ساتھیوں نے یہ نہیں سوچا

کہ عوام کی اس مذہب پرستی کو کس طرح ہینڈل کیا جائے)۔ رائے نے یہ بھی دیکھا کہ مڈل کلاس انٹلجنسیا بائیں بازو کی طرف جھک رہی ہیں۔ Comintern کو ہندستانی عوام سے راست رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ رائے کے سامنے مصر کی مثال موجود تھی جہاں زاغلول پاشا نے اقتدار حاصل کرتے ہی کمیونسٹوں کو جیل میں ڈال دیا تھا۔ (آزادی کے بعد ہندستان اور پاکستان میں بھی یہی ہوا)۔ دراصل رائے خود قومی تحریک کی قیادت کرنا چاہتے تھے۔ 1923 میں مزدور کسان پارٹی بنی۔ وہ اینٹی بولشویک نکلی۔ اب رائے اور ان کے ساتھیوں کے مابین اختلافات پیدا ہوئے۔ 1924 میں کان پور سازش کیس چلا اور حکومت ہند نے تمام کمیونسٹوں کو گرفتار کرلیا۔ اسی سال جون کے مہینے میں Comintern کی پانچویں کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کے اجلاس میں رائے نے پُرزور مطالبہ کیا کہ ہندستانی عوام سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ رائے کو deviationist کہا گیا (جون 1953 میں کزن تقی احمد سیّد اور میں بی بی سی اردو سروس کے لیے ملکہ ایلزبتھ کے جشنِ تاج پوشی کی تیاریاں Cover کرتے ہوئے برمنگھم پیلس کے سامنے گھوم رہے تھے۔ پاکستانی فوج کا دستہ مارچ کرتا گزرا جو اس جشن میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ ایک پاکستانی دوست نے کہا دیکھیں جی نہرو نے اپنی فوج نہیں بھیجی۔ انگریز انڈیا کو گالیاں نکال رہے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ آگے چلے گئے۔ اس وقت لامحالہ ہم لوگ پارٹی کی ناکامیوں کا تذکرہ کرنے لگے تو تقی میاں مرحوم نے پُراسرار انداز اور رازدارانہ لہجے میں فرمایا: ''میرا خیال ہے ایم۔این۔ رائے Trotskyite'' ہے۔

دشکا اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں کہ جب ماسکو سے ایم۔این۔ رائے پیرس پہنچے اور ان کو کان پور سازش کیس کی ناکامی کی اطلاع ملی اور انھوں نے کہا:

"We must have better communists than this lot."

یہاں امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کے سیاسی پروگراموں اور ان خطوط کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جو انھوں نے اسی سال 1924 میں لکھے۔ ان کے مخاطب ڈاکٹر اقبال شیدائی سیال کوٹی تھے۔

مکتوب سیزدہم

برادر مکرم

سلام مسنون!

عرصہ ہوا آپ کے خط کا جواب نہیں لکھ سکا۔ ہم بھی مجبور ہو کر ہندی تلیے میں آ گئے۔ اس عرصے میں پہلے لالہ لاجپت رائے آئے۔ ان سے دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔

ان کے بعد سید سجاد حیدر یلدرم رجسٹرار مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ تشریف لائے اور آخر ستمبر تک یہیں رہیں گے۔ ان سے پرانے علی گڑھ کے احباب کے حالات سن کر مسرت ہوئی۔ سید صاحب سے مختلف معاملات پر گفتگو جاری رہتی ہے۔ آج کل حسرت موہانی آزاد ہو گئے اور سرور راجیہ پارٹی کا عقیدہ مکمل آزادی کی صورت میں تبدیل کرا لیا۔ تنظیم کا کام اچھی طرح جاری ہے۔

دو چار روز سے ظفر حسن پہنچ گئے ہیں۔ اب بہ شرط عافیت لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھ سکیں گے۔ کاش کتابیں ہند سے آ جاتیں۔ وفو کو اب تک راہ داری نہیں ملی۔

آپ اگر ہندستانی اخبار ہی منگا دیں تو وقت اچھا گزرے گا۔ ہمدرد کامریڈ (اور) الہلال دہلی سے نکلنے والا ہے۔

ڈاکٹر حفیظ کے خط سے آپ کی مالی مشکلات کا علم ہوا مگر مضمون واحد ہے۔ ظفر حسن (اور) عزیزم سلام کہتے ہیں۔

والسلام

عبیداللہ

11 ستمبر 1924

سبیل الرشاد استانبول

مکتوب بستم

بہ خدمت شریف

برادر گرامی قدر سلمہٗ

سلام مسنون!

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پروگرام آپ کو سلامت مل گیا۔ آپ کا اسے قابلِ غور سمجھنا اس کی پوری داد ہے۔ جزاکم اللہ۔

کامریڈ اور توارش کی بے رحمانہ تنقید سے جو تکدر پیدا ہوا تھا، رفع ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ کچلو، ظفر علی اور حسرت اسے اچھی نگاہ سے دیکھیں گے۔ محمد علی (اور) شوکت علی ان تینوں کی تائید کے بعد مان جائیں گے۔ جمعیۃ العلما اسے پورے طور پر قبول کر لے گی۔ گزشتہ سال مختلف طور پر پروگراموں کے اساسی نکتے لکھ چکا ہوں۔ وہ نہایت خوبی سے مانے گئے۔ خلافت کانفرنس میں تنظیم کا پروگرام اسی کا عکس ہے۔ اگر آپ میرا خط اور ظفر علی خاں کا امرتسر خلافت کانفرنس کا خطبہ ملا کر پڑھیں تو آپ حیران ہوں گے۔

تقسیم ہند سے ہندو ناراض ہوں گے۔ آپ کی رائے یقیناً صحیح ہے مگر افتراق کی پہل انھوں نے کی۔ سوامی شردھانند، مالوی (اور) راجہ مہندر پرتاپ علاحدہ ہو گئے۔ اس کی تفصیل پھر سناؤں گا۔ انھیں بھی سمجھا چکا ہوں۔ ہندو مہاسبھا (اور) شدھن اسی کا نتیجہ ہے۔ ہم کو پھر کوئی چارہ کار نہیں رہا۔

سید سجاد حیدر، رجسٹرار مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ایک مہینہ استانبول میں رہے ہیں۔ تمام تفصیلات ان سے بھی کہہ چکا ہوں۔ وہ پوری طرح پر موئید تھے۔ آپ دیکھیں گے علی گڑھ پارٹی اور مسلم لیگ سب مان جائیں گے اور کوآپریٹر (اور) نان کوآپریٹر سب مل جائیں گے۔ سب سے پہلے مسئلہ تقسیم کا نظریہ میں نے کابل میں 1916 میں لکھا تھا۔ مولوی احمد علی کو اس کی پوری تعلیم دے کر واپس بھیجا تھا۔ ڈاکٹر اقبال (اور) فضل حسین پہلے یہ نظریہ قبول کر چکے ہیں۔

کامریڈ رائے تقسیم پر ناراض ہے لیکن ہمارے پروگرام میں انقلابی روح اس کے نیشنل پروگرام سے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے مجبوراً قطعی مخالفت نہیں کرتا۔ اس کی تنقید کا جواب اور توارش کا جواب لکھ دیا تھا۔ فراغت میں اس کی نقل آپ پڑھ سکیں گے۔

پروگرام ہندستان میں کئی راستوں سے بھیج دیا ہے، افغانستان بھی، روس کو دیا ہے، ترکی

اور مصری اہل الرائے بھی دیکھ چکے ہیں۔ ایرانیوں کو بھی دیا ہے، جاپان بھی دیکھ لے گا۔

یہاں کے روسی تائید کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ مصری و ترک احباب (اور) ماسکو سے بھی امید ہے تائید ہوگی۔ مگر ذرا محبت اور مقابلے کے بعد۔ جاپان بہت مسرت سے قبول کرلے گا۔ افغان گورنمنٹ الٹی میٹم سمجھے گی۔ ہندستان دیکھیں کس نتیجے پر پہنچتا ہے۔

آپ کو خوشی ہوگی لالہ لاجپت رائے خود پنجاب کو تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ مولانا محمد علی نے کہا ہے کہ سہارن پور تک یا مسلم آبادی ہے یا مسلم اکثریت۔

آپ کے خط میں یو۔ پی میں مسلم آبادی کی نسبت تخمینہ صحیح نہیں۔ وہاں تیرہ فی صد مسلم ہیں، سوراجیہ ہند کا مرکز، لاہور مسلمانوں کا ہے اور آگرہ ہندوؤں کا۔ یو پی راج پوتانہ (اور) گجرات میں ہندو آبادی زیادہ ہے۔ اسی امتزاج سے ہندستانیت محفوظ رہتی ہے۔

خدا کا نام یاد کرنے کے لیے جس قدر عبادت گاہیں ہوں اگر جہالت سے وہ لوگ مشرکانہ رسوم و بت پرستی کے مرتکب ہو رہے ہوں، میں ان پر حملہ اپنی تحقیق میں اسلام کی تعلیم کے مخالف سمجھتا ہوں۔ میں سلطان محمود غزنوی انار اللہ برہانہ کے بعض اعمال، ان کی اجتہادی خطا مانتا ہوں۔ اس لیے رضا کار کے لیے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی سمجھ میں اسلام کی تعلیم کے اندر ہندستان میں مسلمانوں کو انسانیت کے بلند پایہ منصب پر ثابت کرنے کے لیے لکھا ہے۔

عبید اللہ

28 جنوری 1925

ایک عام انگریز لبرل اور انصاف پسند انسان تھا۔ گو سوئز عبور کرتے ہی وہ غیر شعوری طور پر امپریلسٹ بن جاتا تھا۔ یلدرم نے مسلم یونیورسٹی کے انگلش پروفیسر ڈکسن کے بارے میں جو انگلستان جاتے ہوئے جہاز پر ان کا ہم سفر تھا، والدہ کو لکھا تھا۔ ''وہی ڈکسن جو علی گڑھ میں روزانہ شام کو ہمارے ہاں آتا تھا اب مجھ سے ذرا الگ تھلگ رہنے لگا ہے۔ میں بھی اس سے کم ملتا ہوں۔''

اب صورت حال یہ تھی برطانیہ خود ہندستانی انقلابیوں کی تربیت بھی کر رہا تھا۔ برٹش

کمیونسٹ پارٹی جس میں انگلستان میں رہنے والے ہندستانی اشتمالی اور یورپین بیورو کے یورپ میں مقیم اہلِ ہند شامل تھے، ان کی رہ نمائی رائے کر رہے تھے۔ برطانیہ کا انڈین بیورو ملاحوں اور ایسٹ اینڈ میں بسنے والے ہندی مزدوروں کی تنظیم کرتا تھا لیکن خود ہندستان میں کمیونزم محض اہلِ دانش تک ہی محدود رہی۔

راقم السطور کے پاس دہلی کے ہفتہ وار ''قوم'' کے چند شمارے موجود ہیں جن کو والدہ مرحومہ نے اس وجہ سے محفوظ کرلیا ہوگا کہ اس میں اس کا ناول ''وفادار'' سلسلہ وار شایع ہو رہا تھا۔ 11 دسمبر 1925 کے شمارے میں اطلاع چھپی ہے کہ مولانا حسرت موہانی اور آزاد سبحانی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہو گئے۔

وشکا لکھتی ہیں کہ ہندستان میں دہشت پسندوں نے زور پکڑا۔ انگلستان سے دو کمیونسٹ اسپراٹ اور بریڈلے پارٹی کی قیادت کے لیے انڈیا بھیجے گئے۔ رائے کو یہ بھی ناگوار گزرا۔ سی پی جی بی نے اوکسفرڈ مجلس وغیرہ کے ذریعے ہندستانی طلبا کو متاثر کرنا شروع کیا۔

اسپراٹ اور بریڈلے گاندھی جی کی اہنسا کے شدید مخالف تھے۔ رائے نے لکھا کہ اہلِ ہند بورژوا تحریکوں سے مایوس ہو کر دہشت پسندی اختیار کر رہے ہیں۔

Comitern نے اپنی رپورٹ میں تحریر کیا کہ سی پی آئی ورکنگ کلاس میں ناکام رہی اور مزدور کسان تحریک طاقت ور ہو چکی ہے۔

حکومت ہند نے 1929 میں میرٹھ سازش کیس کے ذریعے عوامی تحریک پر وار کیا۔

ہندستان میں تشدد پھیل رہا تھا لیکن صوبۂ سرحد میں بادشاہ خاں کے زیرِ اثر جنگ جو پٹھان اہنسا وادی بن گئے جو ایک معجزہ سا تھا۔ 1982 میں راقم الحروف نے اس تھکے ہارے اور بے حد بوڑھے رنجیدہ شیر سے ملاقات کی۔ وہ راج بھون پٹنہ میں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر بہار کے مہمان تھے۔ بہ غرضِ علاج پٹنہ تشریف لائے تھے۔ پھر ان کے بھتیجے محمد یونس خاں جن کا نہرو اندرا گاندھی عہد میں طوطی بولتا تھا، ایک دو سال قبل راشٹرپتی بھون کی ایک تقریب میں اس حال میں نظر آئے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جواں مرگی سے پژمردہ اور سیاسی حالات سے مایوس وہ

ہال کے ایک کونے میں کرسی پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ان نینوں کے بھی پر کھے۔

دشکا کی کتاب پر واپس چلیے۔ وہ لکھتی ہیں کہ گاندھی جی سے عوام نے خود کو مماثل کیا کیونکہ وہ انھی کی طرح کے تھے۔ (ٹھیک! لیکن مسلم عوام نے جو ایک مدت تک کھدر پوش سرفروش، ستو باندھ کر پیدل چلنے والے مولویوں کے ساتھ Identify کیا تھا، وہ 1937 کے بعد براؤ صاحبوں اور نواب زادوں کے پیچھے کیوں ہو لیے؟ حالانکہ قائداعظم نے شیروانی اور شلوار اور مس جناح نے ساری ترک کر کے غرارہ اور شلوار پہننی شروع کر دی تھی مگر یہ محض پوشاک تبدیل کرنے کی بات نہیں تھی۔ مسلم عوام کے ایک سیکشن کی اجتماعی سائیکی کس کس طرح بدلی؟ دونوں کیمپوں کا ایک دوسرے کے خلاف زبردست پروپگنڈہ اور اسلام کی اپیل؟ لیکن اسلام تو احرار پارٹی اور مولانا آزاد کے پاس بھی تھا۔ مسلم لیگ پریس نے ان کے لیے کہا کہ کانگریس کے زرخرید ہیں اور دیوبند میں کانگریس کے پیسے سے دیگیں پکتی ہیں۔ مولانا آزاد عالم اسلام کے عظیم ترین مفکرین میں سے تھے، ان کو لیگ نے ''شوبوائے'' بتایا۔

راجہ مہندر پرتاپ جو کابل کی مذکورہ بالا آزاد ہند گورنمنٹ کے صدر تھے اور علی گڑھ مدرسہ میں یلدرم کے ساتویں آٹھویں کلاس میں ہم جماعت مولانا حسرت موہانی اور محمد علی کالج میں یلدرم کے روم فیلو اور گہرے دوست تھے۔ ڈاکٹر سید محمود چھوٹے چچا جان ڈاکٹر سید وحید الدین حیدر کے ہم جماعت اور عزیز دوست تھے۔ 1903 میں علی گڑھ میں ایک اینٹی برٹش خفیہ تنظیم قائم ہوئی۔ حسرت، سید محمود، عبدالرحمٰن بجنوری، سید محمد ٹونکی اور یلدرم جس کے اراکین تھے۔ حسرت اور مولانا محمد علی کے خطوط بہ نام یلدرم تلف ہو چکے ہیں لیکن راجہ مہندر پرتاپ اور ڈاکٹر سید محمود نے جو خط مجھے لکھے وہ میں اپنے زیر ترتیب مجموعہ مکاتیب ''دامانِ باغباں'' میں شامل کر رہی ہوں۔ ان دونوں بزرگوں کی موجودہ حالات سے بے پایاں مایوسی کرب ناک ہے۔ راجہ مہندر پرتاپ تھوڑے سے سنک گئے تھے۔ بادشاہ خاں اسی عمر میں بالکل صحیح الدماغ اور Alert رہے)۔

دشکا کے نزدیک پارٹی کی ناکامی کی ایک وجہ یہ تھی کہ رائے یورپ میں بیٹھ کر رہنمائی کر رہے تھے اور ہندستان کے حالات کو صحیح طور پر نہیں سمجھے اور غلط مشورے دیا کیے۔ دوسری بات یہ

کہ دشکا کے خیال میں ہندستان میں ایک مسلح بولشویک انقلاب اس لیے ممکن نہیں تھا کہ یہاں ایک آئینی نظام قائم تھا جس کے ذریعے سیاسی مراعات خواہ کتنی ہی محدود رہی ہوں گی، برابر دی جاتی رہیں۔

(ہندستانیوں کی اس غیر مشروط وفاداری کا آغاز جنگِ پلاسی ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ آزادی سے قبل کی برطانوی دور کی India's who is who کی جلدیں اٹھا کر دیکھیے تو اندازہ ہوگا کہ کس قدر کثیر تعداد میں نائٹ، رائے بہادر، راؤ بہادر، خان بہادر ہمارے ملک میں موجود تھے۔ نواب، راجہ اور تعلقہ داران کے علاوہ۔)

مزید برآں بہ قول دشکا یہ ایک خوں ریز خوں آشام حکومت نہیں تھی۔ حد سے حد پولیس کا لاٹھی چارج اور جیل یاترا۔ (یہ بڑی حد تک صحیح ہے کیوں کہ جلیاں والا باغ جیسے واقعات شاذ و نادر ہی ہوئے۔ دہشت پسندوں کی پھانسیوں کا تذکرہ البتہ دشکا نے نہیں کیا نہ اگست 1942 کے اندولن کا جس میں دس ہزار ہندستانی پولیس کی گولیوں کا شکار ہوئے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد ہندو پاکستان، سری لنکا اور بنگلہ دیش میں جتنے شہری سرکاری بندوقوں کا نشانہ بنے ہیں، برطانوی دورِ حکومت میں ہلاک شدگان کی تعداد اس کی عشر عشیر بھی نہیں تھی۔ بہر حال دشکا کا کہنا ہے کہ ایک تو ہندستانی کمیونسٹ رائے سے برگشتہ ہوئے اور Comintern نے مزدور کسان تحریک کی مخالفت کر کے دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا کیونکہ اسی موومنٹ کے ذریعے کمیونزم آگے بڑھتی، وہ شہری مڈل کلاس میں محدود رہی اور Grass roots سے کوئی لیڈر پیدا نہیں ہوا۔ دو انگریز پارٹی کی رہنمائی کر رہے تھے! ادھر سی پی جی بی اور رائے میں رسہ کشی جاری رہی کہ ہندستانی تحریک کی قیادت کون کرے (دو ملاؤں میں مرغی حرام)۔

دشکا نے اپنے اس معروضی مطالعے میں 1930 تک کے واقعات کا احاطہ کیا ہے اور یہ کتاب اہم دستاویزی حیثیت رکھتی ہے اور خشک اور غیر دلچسپ بالکل نہیں ہے۔

اسی زمانے میں علامہ اقبال نے ملک راج آنند کو لندن بھجوایا۔ لندن کے اس گروپ میں محمود الظفر، سجاد ظہیر وغیرہ شامل تھے۔ یہ نوجوان برطانیہ کی دانش گاہوں کے ریڈیکل ماحول سے

متاثر ہوئے۔ صاحب زادہ محمود الظفر کی تربیت اتنے انگریزی ڈھنگ سے دہرہ دون میں ہوئی تھی کہ ان کی اصطلاحات، بات سمجھانے کا انداز سب اپر کلاس برٹش تھا۔ اسی طرح جواہر لعل نہرو، کرشنا، اقبال سنگھ بنیادی طور پر برطانوی لبرل لفٹ ونگ انٹلکچوئل تھے۔

بنے بھائی کی کتاب 'لندن کی ایک رات' اردو فکشن کا نیا موڑ ہے۔ اسی 1932 میں 'انگارے' چھپی جس پر گورنمنٹ نے پابندی عائد کی۔ اب دیکھیے تو وہ Lady Chetterly's Lover کے مانند ایک خاصی پھس پھسی کتاب تھی۔ تہلکہ مچا، لیکن اس میں ان نئے انقلابیوں نے وہی غلطی کی یعنی اپنے الحاد کو مشتہر کر کے مسلم مڈل کلاس کو اپنے خلاف بھڑکا دیا۔ چنانچہ آج تک ایک عام مسلمان کمیونسٹوں کو ملحد اور بے دین سمجھتا ہے۔

عالمی کساد بازاری کی وجہ سے یورپ، برطانیہ اور امریکہ میں لفٹ ونگ ادیب پیدا ہو چکے تھے۔ لندن کے Bloomsburey ماحول میں رہنے والے ہندستانی نوجوانوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کی۔ اس تحریک نے ہندستان میں بالخصوص اردو کو تابندگی، تازگی اور بصیرت اور توانائی بخشی۔ چند سال یہ ستارہ بڑی آب و تاب سے چمکا۔ اب لگتا ہے گویا شہاب ثاقب تھا۔

وجہ وہی تھی یعنی پارٹی کی غلط ہدایات۔ ہندستان میں 1930 کے بعد کمیونزم نے طلبا اور دانش وروں کو بہت متاثر کیا۔ ایک کافی ہاؤس کلچر اور ادبی اور نظریاتی مباحث کا دور شروع ہوا۔ دانش گاہوں میں علم پرستی موجود تھی۔ طلبا کی دلچسپیاں محدود تھیں۔ سنیما اور ٹی وی کی یلغار ابھی بہت دور تھی۔ نوجوانوں میں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ ترقی پسند ادب کی ترویج کے لیے فضا نہایت ساز گار تھی۔ لکھنؤ، لاہور، کلکتہ اور بمبئی اس تحریک کے اہم مراکز تھے۔ جنگ شروع ہوئی۔ سامراجی لڑائی روس کی شمولیت کے بعد عوامی جنگ کہلائی اور پارٹی نے ایک اور چولا بدلا۔ اب وہ حکومت کی حامی اور ایک قانونی جماعت تھی۔ فیض صاحب کرنل اور بعد میں ادبی ای بنے۔ مجید ملک بھی کرنل بنے۔ حفیظ جالندھری نے گانا لکھا۔ یہ اڑوسن پڑوس کہے جو کہے میں تو چھورے کو بھرتی کرآئی رے۔ جسے ملکہ پکھراج نے گایا۔

پارٹی نے دوسرا فتویٰ یہ دیا کہ پاکستان کا مطالبہ عوامی مطالبہ ہے اور لینن کے نظریوں پر

پورا اترتا ہے۔ ان کے یہاں ہمیشہ سے گاڑی پہلے گھوڑا بعد میں رہا۔ پہلے تھیوری بنائی، بعد میں حالات کو اس تھیوری پر منطبق کیا۔ لہٰذا اب لال اور ہرے جھنڈے ساتھ چل پڑے۔ تقسیم کی خون ریزی کے دوران بالخصوص دہلی کے فسادات میں پارٹی ورکرز نے فساد زدگان کی ان تھک اور بے لوث خدمت کی لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جو شر نارتھی لٹے پٹے غم و غصے میں بھرے پاکستان پہنچے۔ ان کے کیمپوں میں پارٹی کے بجائے جن سنگھ نے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ نتیجہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ بنے بھائی کو پارٹی کی تنظیم کے لیے پاکستان بھیجا گیا۔ وہ اوّلین برسوں میں میاں افتخار الدین، مظہر علی خاں اور فیض احمد فیض کے ''پاکستان ٹائمز'' اور چراغ حسن حسرت اور ایوب احمد کرمانی کے ''امروز'' کا بہت ہی ولولہ خیز اور سنہرا دور تھا۔ نوجوان بہت پُر امید تھے کہ اس نئے ملک میں ایک اشتراکی نظام جلد آ جائے گا۔

ظہیر کاشمیری نے کہا:

ہمیں یقین ہے ہم ہیں چراغ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

لیکن دونوں ملکوں میں فوراً ہی پارٹی انتہا پسندی کی طرف چلی گئی۔ اقبال کو فسطائی پکارا گیا۔ فیض صاحب جو ہمیشہ کے اعتدال پسند تھے، انھوں نے حسب عادت سگریٹ کا کش لے کر کہا یہ کیا بے وقوفی ہے۔ اس زمانے میں انھوں نے وہ پیاری نظم لکھی۔

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا

پارٹی بہر حال وہاں بھی مقبول نہ ہوئی۔ انقلاب روس کی سالگرہ کے روز البتہ لاہور کے شیزان ریستوراں میں چنندہ ہستیاں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ، خدیجہ، سبط حسن وغیرہ جمع ہو جاتے تھے اور ٹی پارٹی ہوتی تھی۔ پھر پنڈی سازش کیس میں فیض صاحب اور بنے بھائی گرفتار ہوئے۔ ان کے جیل سے باہر آنے کے بعد بھی شیزان میں پارٹی ہوا کی۔

بمبئی میں سکندر علی وجد مرحوم ایک ہندی شاعر کی کویتا بڑے مزے سے سنا کرتے تھے۔

بڑی بڑی خلافتی ہوئی پھرنور چکا

فیض صاحب نے قید و بند میں اپنی شاعری کا نور چکایا۔ انھوں نے کلاسیکل تلمیحات کی ایک پوری سیاسی پیکر تراشی کی اور لیلائے وطن کا Cult بنایا۔ اس قسم کی وطن پرست شاعری ہندستان میں نہایت سکینڈ ریٹ قسم کی لکھی جاتی۔ فیض صاحب نے شہہ پارے تخلیق کیے:

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

جنرل ضیاالحق کے دور میں احمد فراز اور فہمیدہ ریاض نے بھی لیلائے وطن کی تقدیس کی۔

(2)

''والگا کے ملاح کا گیت'' دنیا کے حسین ترین نغموں میں سے ایک ہے اور اس کے بے حد دقیق Notations کو بڑی محنت سے یاد کر کے میں اسے اپنے پیانو پر بجایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ پال رابسن کا Ole Man River اور دوسرے امریکن گیت بھی۔ میں نے ایک مرتبہ وادی نیکر کے ایک ریستوراں میں جمع جرمنوں کو اپنے لوک گیت گاتے سنا تو ان کی دھنیں بہت مانوس سی معلوم ہوئیں۔ تب مجھے خیال آیا کہ جو جرمن ہجرت کر کے گزشتہ زمانوں میں امریکہ گئے وہ یہ دھنیں اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ نغمے اور سیاسی نظریات سرحدوں کے پابند نہیں۔

والگا کا کتنا پانی اس کے پلوں کے نیچے سے گزرا۔ ایک بے حد تاریک رات، ایک زار شاہی محل جواب Palace of culture بنا دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند سے ریڈیو والے انٹرویو کر رہے تھے اور وہ نہایت عالمانہ و بصیرت افروز اور انتہائی مخلصانہ انداز میں Marxism اور Leninism پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ میں میز کے دوسری طرف بیٹھی سوچ رہی تھی کہ یہ کتنے خوش قسمت انسان ہیں کہ انھوں نے اپنے خوابوں کی تعبیر بھی دیکھ لی۔ یہ ایم این رائے کے دور میں روس آئے اور بعد میں بھی۔ ستمبر 1969 کی اسی رات والگا کے کنارے مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میں بھی جب والگا کے ملاح کا گیت بجاتی تھی تو یہ معلوم نہ تھا کہ ایک روز بالکل اس عظیم دریا کے کنارے اسی گیت کو بجوا کر سنوں گی۔ میں نے بھی ایک نہایت صاف ستھری سوسائٹی اور نیا

سوویٹ انسان دیکھ لیا۔ یہاں نہ عورت بازار میں بکتی ہے، نہ مذہبی، لسانی اور فرقہ وارانہ عصبیت کا وجود ہے، نہ کوئی کشمکش، تشدد، فسادات وغیرہ وغیرہ۔ واقعہ یہ ہے کہ دو مرتبہ 1969 اور 1974 میں سوویت یونین شمال جنوب اور مشرق سے مغرب تک اچھی طرح گھومنے پھرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ بے شک یہاں شخصی آزادی کا فقدان ہے لیکن ہمارے یہاں محض مارنے یا مرنے اور فاقہ کشی کی آزادی ہے۔ سوویت یونین میں مختلف النوع قومیتوں کے لوگوں میں کس قدر بھائی چارہ، یگانگت اور دوستی دکھلائی دی تو کیا یہ سب ایک جابر نظام کے تحت مصنوعی دوستیاں اور امن چین تھا؟ لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ دیگ پر سے کمیونزم کا ڈھکن اٹھتے ہی حشر بپا ہو گیا۔ میری تو عقل حیران ہے۔ روسی چاند پر پہنچ گئے مگر ٹوتھ پیسٹ اچھا نہیں بنا سکتے تھے۔ ان کے ہوائی جہاز تین تین گھنٹے تاخیر سے اڑتے تھے۔ ریستورانوں میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ان کی یہ غیر متوازن ترقی ان کو لے ڈوبی۔

کلاس کا معاملہ یہ تھا کہ مجھے ایک منا سا میڈل دے کر اسکوف شمالی روس کے ریلوے ورکرز یونین کا اعزازی ممبر بنایا گیا۔ جب ہم ہندستانی ادیب (وجئے تندولکر، مسٹر سنگھ، ایک ہندی ادیب اور میں) پشکن فیسٹول کے دوران 1974 میں اسکوف کے ریلوے ہیڈ کوارٹرز کے ایوان میں افسران بالا اور جرنیلوں کے ساتھ ضیافت اڑا رہے تھے اور ریلوے مزدور اوپر ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھا رہے تھے۔ وہ مرد و زن گھنٹوں عمارت کے نیچے ایک ہال میں ہمارے آٹوگراف لینے کے لیے کھڑے رہے تھے۔ اس منظر میں دو باریکیاں مضمر تھیں۔ ایک یہ کہ روس میں ایک نوع کا طبقاتی نظام موجود تھا۔ دوسرے یہ کہ وہاں کے عوام الناس بھی ہندستانی ادیبوں کے روسی تراجم پڑھتے تھے اور بے حد پڑھتے تھے اور بے حد پڑھتے تھے۔ گو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں اینگلو سیکسن لٹریچر کی درآمد پر مکمل پابندی عائد تھی۔ وہ ''مادام بوواری'' نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ''امراؤ جان ادا'' کا ترجمہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتا تھا۔

عام بس ڈرائیوروں کے سامنے ڈیش بورڈ پر ٹالسٹائی اور گورکی کی کتابیں رکھی ہوتی تھی۔ یہ منظر سرمایہ دار مغربی ملکوں میں عنقا تھا۔ مہد سے لحد تک علاج معالجہ اور تعلیم فری تھیں۔ مگر جن

باتوں کو ہم امریکن پروپگنڈہ سمجھتے تھے، اکثر وہ بھی درست نکلیں مثلاً وٹر وڈرینگ۔ میں نے کہا مجھے ایک عام ازبک کسان کا گھر دکھلایئے۔ وہ ایک خاصے متمول مکان میں لے گئے جہاں صاحب خانہ کی بوڑھی دادی تخت پر بیٹھی قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ انھوں نے چھینٹ کی شلوار پہن رکھی تھی، اندر گئے تو وہ ایک متوسط الحال پشاوری گھر معلوم ہوا۔ دیواری قالین، ایک کونے میں لحاف اور توشکیں، ٹیلی ویژن۔ میں نے سوچا کہاں ہمارے کسانوں کے کچے گھروندے، دیواروں پر اپلے، اندر کوڑا کرکٹ اور افلاس اور کہاں سوویت ازبک کسان کا آرام، وہ ترقی یافتہ مکان۔ ہمیں صحن میں ایک جنگلے دار تخت پر بٹھایا گیا جو بالکل مغل تصاویر کا منظر تھا۔ پیالیوں میں قہوہ پیش کیا گیا۔ ایک بچے نے رباب پر ازبک نغمہ سنایا۔ میں بے حد متاثر ہوئی۔ واپس آکر السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں تین قسطوں میں In Russia Today لکھا۔

بعد ازاں چند اور ادیب ازبکستان گئے۔ انھوں نے بھی واپس آکر اسی گھر کا نقشہ کھینچا۔ باہر وہی بوڑھی دادی قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ اندر وہی بچہ رباب بجا رہا تھا۔

میں یہاں سے آرٹسلک ہندستانی مصنوعات بہ طور تحائف لے جاتی تھی۔ روسی دوستیں کہتی تھیں کہ اس کے بجائے ہمیں اپنا امریکن میک اپ کا سامان دیتی جایئے۔ ایک بار لینن گراڈ کے ایک زار شاہی محل کے باغ میں فیض صاحب کے ساتھ میں ٹہل رہی تھی۔ فیض صاحب کے ہاتھ میں امریکن سگریٹ کا ایک پیکٹ تھا۔ اچانک چند لڑکے نمودار ہوئے اور روسی زبان میں ان سے امریکن سگریٹوں کا مطالبہ کیا۔ فیض صاحب نے جیب سے مارول برو کے کئی پیکٹ نکال کر ان کے حوالے کیے۔ میں نے کہا ''فیض صاحب! یہ عبرت ناک منظر تھا'' خاموش رہے۔

اب ہمارے پرانے کامریڈ دوست کہتے ہیں کہ ہم ہمیشہ اس کمیونزم کے خلاف تھے جو سوشلسٹ بلاک میں رائج تھی۔

ارے بھئی کہاں خلاف تھے۔ روس کی غیر مشروط مدح اور امریکہ پر تبرا آپ کے مسلک میں شامل تھا۔ ہمارے دو ادیب باقاعدہ ایک دوسرے کو سی آئی اے اور K.G.B ایجنٹ پکارتے تھے۔ میں نے اپنے ایک مضمون ''عالم آشوب'' میں جو ''انکار'' علی گڑھ میں چھپا، ایران میں خمینی

انقلابات کے بعد قتل عام اور ادیبوں اور عورتوں کو گولیوں کی باڑھ کا نشانہ بنائے جانے کی پُرزور مذمت کی تھی، تو علی گڑھ کے ایک بزرگ لیفٹیننٹ پروفیسر نے مجھ سے کہا تھا'' آپ امریکن ایجنٹ ہیں۔'' اب کہ بادپیماؤں کا رخ ماسکو سے ملواکی کی طرف ہو چکا ہے، مرغ قبلہ نما بھی سرنگوں ہے۔

لیکن سرمایہ داری کا مداری جو تماشا دکھا کر گیا تھا اس کے واپس آتے ہی ماسکو میں طوائفیں نمودار ہو گئیں اور پونجی دار کی ساری بے ہودگیاں بھی لوٹ آئیں۔ بالکل ناقابل یقین اور سو فیصد سچ۔

وہ جو ہزارہا تصاویر ہلاک شدگان کی لینن میوزیم وغیرہ میں آویزاں تھیں، وہ ان گنت مرد اور عورتیں جو نئے معاشرے کی تخلیق کرتے ہوئے مارے گئے، وہ لاتعداد لوگ جو اسٹالن اور ہیریا نے موت کے گھاٹ اتارے۔ مرنے والوں کی تعداد کا کوئی حدوحساب نہیں۔ سفید روسیوں کے خلاف خانہ جنگی اور دوسری جنگ عظیم میں مارے جانے والوں کی تعداد اس کے علاوہ۔ وہ سب اس لیے کہ لینن گراڈ پھر سے سینٹ پیٹرزبرگ بن جائے؟

اب جا کر معلوم ہوا کہ سوویت بچوں کو اپنی بھدی چوبی گڑیا بوشکا کے بجائے باربی ڈول چاہیے تھی۔ لیکن سچے آدرش وادیوں کی دنیا علاحدہ ہے۔ وہ بنیادی طور پر معصوم ہوتے ہیں اور دنیاوی سیاست کے مکروفریب سے ناواقف۔

ہمارے بہت سے آدرش وادی دانشوروں نے اس امید پر اپنی زندگی جلاوطنی میں گزاریں کہ اصلی اشتراکی نظام کا یوٹوپیا بھی جنم لے گا اور وہ ایک نہ ایک دن وطن بھی واپس آجائیں گے۔ کزن تقی احمد سید جو پرانے کلاسیکل قسم کے نیشنلسٹ اور بچپن سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں پڑھتے تھے، 1947 میں پاکستان گئے۔ وہاں سے دو سال بعد لندن جہاں بی بی سی میں انھوں نے عمر گزاردی اور ریٹائر ہوئے۔ چند سال قبل جب میں ان سے ملنے ان کے گھر گئی وہ بہت علیل تھے۔ لیکن کہنے لگے کہ اب آپ واپس جاتے ہی جامعہ نگر میں ایک مکان کا بندوبست کر دیجیے۔ اب ہم باقی زندگی وہیں گزاریں گے۔ میں نے کہا چالیس سال لندن میں رہنے کے

بعد خود آپ بھی طبعاً انگریز ہو چکے ہیں اور آپ کی انگریز بیوی اور لڑکی کسی طرح جامعہ نگر کی گرد اور گرما ہرگز نہیں برداشت کر پائیں گی۔ نہ اب وہ آپ کے زمانے کے آئیڈیلسٹ لوگوں کا ادارہ ہے، لیکن وہ مصر رہے اور واپسی کا خواب دیکھتے دیکھتے اگلے سال راہی ملک عدم ہوئے۔ اس قسم کے بہت سے المناک واقعات ہیں جن کو موجودہ نسل کے نوجوان، بزنس مینجمنٹ اور حصول دولت جن کا مقصد حیات ہے، سمجھ ہی نہیں سکتے، نہ انھیں اس کی حاجت ہے۔

اس ملک میں اردو نے جب محض ایک انٹرٹین منٹ انڈسٹری کی حیثیت اختیار کی تو ہمارے بہت سے ترقی پسند شعراء، شراب نوشی جن کی کمزوری تھی، سرمایہ داروں کے یہاں دعوتوں میں پائے جانے لگے۔ ان لوگوں نے بھی اپنی سیاسی جدوجہد کے دور میں کم صعوبتیں نہیں اٹھائی تھیں لیکن مجھے محمود الظفر، رشیدہ آپا اور ڈاکٹر حمیدہ ظفر جیسے لوگ بھی یاد آتے ہیں۔ ان نند بھاوج نے ساری عمر بے لوث خدمت خلق کی۔ حمیدہ آپا روبن ہڈ کی طرح امیروں سے بھاری فیس لے کر غریبوں کے مفت آپریشن کرتی تھیں۔ بیرون ہند میں بہ حیثیت آئی سرجن ان کی دھوم تھی۔ وطن میں شاید اس وجہ سے کہ وہ کمیونسٹ تھیں ان کو پدم بھوشن کیا، پدم شری بھی نہیں ملا، نہ کبھی انھوں نے اس کی تمنا کی۔ چند سال قبل علی گڑھ کی ایک جھلستی دوپہر لوگی اور خاموشی سے مر گئیں۔ ان کا کوئی نام بھی نہیں لیتا، یادگار قائم کرنا تو دور کی بات ہے۔

مڈل کلاس ہندستان میں صارفیت یعنی کنزیومرزم تو ابھی پہنچی ہے لیکن جن پروگریسو رائٹرز کو فلم انڈسٹری خوش آئی ان کی قلب ماہیت ہوتے، میں نے بہ چشم خود ملاحظہ کی ہے۔

ایک پروگریسو ہندی صحافی رائٹر اپنے گھر میں چمکیلی ریشمی لنگی کرتا پہن کر فلمی سیٹھوں کی طرح گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھنے لگا۔ ایک ترقی پسند فلمی رائٹر کے کتوں کو مرغ کے قیمے کے کباب کھلائے جاتے تھے (یہ مبالغہ نہیں ہے)۔ اکثر نئی نئی دولت کے ساتھ رعونت بھی آجاتی ہے۔ ایک خوش گلو موسیقار عرصے سے بمبئی میں جدوجہد کر رہے تھے مگر Big Boys تک رسائی نہیں تھی۔ میں نے ان سے خود کہا کہ فلاں دعوت میں فلاں صاحب آرہے ہیں ان کو اپنا گانا سنائیے گا وہ ضرور آپ کی مدد کریں گے۔ یہ صاحب اس وقت بے حد کامیاب نغمہ نگار اور ترقی پسند تھے۔ اس

شخص نے بڑے افکسار اور امید سے ان کو اپنا گانا سنایا۔ آں جناب ایک نواب کے انداز میں بیٹھے رہے۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر دوسری طرف چلے گئے۔ وہ بے چارہ لجاجت سے ان کو سلام کرتا رہ گیا۔ پھر اس نے کہا یہ اپنا جدوجہد کا زمانہ بھول گئے۔ میں نے جواب دیا۔ عین ممکن ہے کہ جب آپ ایک کامیاب میوزک ڈائرکٹر یا پلے بیک سنگر بنیں آپ بھی اپنا یہ وقت بھول جائیں اور دوسرے حاجت مندوں کو گھاس نہ ڈالیں۔

بندہ بشر کمزوریوں کا پتلا ہے۔ ایک نامور مجاہد شاعر زیادہ تر یورپ اور امریکہ کا قیام کرتے تھے۔ ایک بار دلی تشریف لائے۔ میزبان خاتون کا اہل زبان سخنور ملازم ان کا دل دادہ تھا۔ وہ چائے لے کر آیا اور بڑی عقیدت سے ان کو دیکھنے لگا۔ انھوں نے درشتی سے کہا..... ''تم کیوں کھڑے ہو، جاؤ''۔

میں ان کے اس رویے پر بہت متعجب ہوئی۔ ایک اور عظیم المرتبت بائیں بازو کے شاعر ماسکو میں ہندستانی سفیر کے ہاں مدعو تھے۔ وہاں سفارت خانے کے ایک رکن نے بڑی شردھا سے ان کو اپنے گھر کھانے پر بلانا چاہا۔ جب وہ کمرے سے باہر گیا تو انھوں نے سفیر کی اہلیہ سے پوچھا۔ ان کا کیا عہدہ ہے؟ انھوں نے کہا یہ ہمارے مشن میں کلرک ہیں اور آپ کے پرستار۔ انقلابی شاعر نے عدیم الفرصتی کا بہانہ کر کے دعوت نامنظور کر دی۔

وجہ وہی تھی جس کا دشکا نے بھی اپنی کتاب میں تذکرہ کیا ہے کہ محض ہماری مڈل کلاس شہری انٹلیجنسیا کمیونزم سے متاثر ہوئی۔ ہمارے لیڈر زیادہ تر Grass Roots سے نہیں آئے تھے (ہندستان کے نکسلائٹوں کا یہاں تذکرہ بے محل ہے) لیکن ہماری جمہوریت میں بھی دیہات سے آنے والے کسان لیڈر منتری بنتے ہی راجاؤں اور مہاراجاؤں والا طرز حیات پل کی پل میں اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ سارے جہان سوم کا المیہ ہے۔ تمام سابق نوآبادیوں میں اڈونیزا سے لے کر افریقی ممالک تک آپ کے وزرا کے Corruption کا یہی نظارہ دیکھنے کو ملے گا۔

افریقہ کے ایک پروگریسو فلم ڈائرکٹر نے 1974 میں ایک طنزیہ فلم بنائی تھی جس میں ان کے ملک کے صدر نے حصول آزادی کے فوراً بعد گورنمنٹ ہاؤس میں منتقل ہو کر فرانسیسی گورنر

جنرل کا مجسمہ ہٹوایا، اپنا مجسمہ ہال میں نصب کروالیا اور شاہانہ طور طریقے اختیار کیے۔ صدیوں تک مفلس اور محروم رہنے کے بعد اچانک اقتدار اور دولت ملنے پر عموماً یہی ہوتا ہے۔

اب سنا ہے چین بھی مایابازار میں شامل ہوا چاہتا ہے۔ شنگھائی کو ایک بار پھر عیاشی کا اڈہ بنایا جارہا ہے۔ مہاٹھگنی مایا کمیونزم کو کھا گئی۔

برلن کی دیوار گرنے کے بعد میں نے چند عبرت ناک مناظر دیکھے۔ برنیڈن برگ گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر سابقہ مشرقی برلن کے حصے میں سڑک کے کنارے سابقہ سوویت آرمی والوں کی سموری ٹوپیاں اور تمغے اور طغرے امریکن سیاحوں کے لیے فروخت کیے جارہے تھے اور ان کو بیچنے والے کون تھے؟ ہندستانی، پاکستانی ترک نوجوان۔

اس قسم کے چھوٹے چھوٹے میڈل میرے پاس بہت سے ہیں۔ ہم جب ان ممالک میں بہ طور مہمان جاتے تھے تو بھی یہ تحفتاً ملتے تھے۔ کسی پر بابر کی تصویر کندہ تھی جو چغتائی زبان کا پہلا مصنف تھا، کسی پر علی شیر نوائی نظمی گنجوی کی۔

نہ بھولیے کہ ماسکو نے ایشیائی جمہوریتوں کی تہذیبوں کی خوب خوب تجدید کی۔ زار شاہی روس نے ان مرکزی ایشیائی اقوام کو غلام بنایا تھا۔ روسی امپریلزم، برطانوی سامراج کی طرح روشن خیال اور لبرل نہیں تھی اور اگر بفرضِ محال وہی بخارا وغیرہ کے امیر اب تک موجود ہوتے تو ان کی پسماندگی کی وہی حالت ہوتی جو افغانستان کی ہے۔

ایک وقت تھا جب سارے سوشلسٹ بلاک میں عظیم الجثہ مجسمے یا کٹ آؤٹ یا تصاویر جا بجا باپ بیٹا اور روح القدس کی ایستادتھیں پھر اس تثلیث میں سے روح القدس یعنی اسٹالن کو برخاست کر دیا گیا، باپ بیٹا رہ گئے۔ اب وہ بھی گئے۔ سابقہ مشرقی جرمنی میں ایک خاتون پروفیسر نے بڑے معذرت خواہ انداز میں مجھ سے کہا کہ وہ جو یونیورسٹی کے اوپر بہت بڑی آہنی تصویر مارکس اور لینن کی لگی ہے وہ اتنی بھاری ہے کہ اب تک اس کو اتارا نہیں جاسکا۔

اجتماعی اور قومی رویے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ غدر کے بعد ہم برٹش ہوگئے۔ کنگ ریڈر سے ہماری پڑھائی شروع ہوتی تھی۔ پھر سارے ملک پر قوم پرستی کا رنگ چڑھا۔ اس کے بعد جنگل کا

جنگل ہرا ہو گیا۔ پھر زعفرانی رنگ دیکھتے دیکھتے چند سال میں کہاں سے کہاں پہنچا۔ اس طرف چند نظریات پاکستانی ذہنوں میں بیٹھ گئے ہیں مثلاً یہ کہ آزادی سے قبل برصغیر کے مسلمان سکنڈ کلاس شہری تھے، یہ وہاں شاید درسی کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ مجھے اس کا اندازہ اس سے ہوا کہ کئی پاکستانی نوجوانوں سے یہی بات سنی۔ یہاں مغلیہ تاریخ جس ڈھنگ سے پڑھائی جا رہی ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔ وہاں ہندو پیریڈ بالکل غائب کر دیا گیا۔ گزشتہ 45 سال میں دونوں ملکوں کے باشندوں کی سائیکی بدل چکی ہے تو آئندہ پچاس سال میں کیا ہوگا۔

انسان کی جبلت دس بارہ ہزار سال کی تمدنی زندگی کے باوجود بنیادی طور پر بدلی نہیں ہے۔ اس کے تحت الشعور کی گہرائیوں میں ابھی تک غاروں کی تاریکیاں پنہاں اور جنگلی درندوں کی خوں آشامی یعنی وہ فطرت جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھا کر زندہ رہتے ہیں، انسان کی سرشت میں ابھی موجود ہے۔ ذرا سا کھرچنے پر وہ نمودار ہو جاتی ہے۔ نیویارک میں میری دوسری بھانجی زیبا حیدر (وائس پریزیڈنٹ کیمیکل بینک) کے ہاں ایک روز ایک Bosnian Serb مستری غسل خانہ ٹھیک کرنے آیا۔ اسی صبح بوزنیا میں مسلمانوں پر ہونے والے غیر انسانی مظالم کی خبریں چھپی تھیں۔ یہ شخص یوگوسلاویہ کا مہاجر تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ Serb ہے۔ میں نے کہا تم مسلمانوں پر اتنے ظلم کیوں کرتے ہو۔ بپھر کر بولا، وہ بدمعاش ہیں۔ چھ سو سال قبل ترکوں کے اثر میں آ کر انھوں نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا۔ انھیں وہاں رہنے کا کیا حق ہے۔ میں نے کہا، کمیونزم نے تو یہ مذہب وزہب کے سارے جھگڑے مٹا دیے تھے۔ وہ کمیونزم کے خلاف بکتا جھکتا اپنا کام ختم کر کے چلا گیا۔ لیکن اسی دنیا میں نسلی اخوت اور قومی یا نسلی یگانگت کی مثالیں بھی ان گنت مل جائیں گی۔ نیویارک ہی میں اسی شام میں دو پاکستانی دوستوں کے ساتھ اردو میں باتیں کرتی ٹیکسی میں آ رہی تھی تو پنجابی ہندو ٹیکسی ڈرائیور نے کرایہ نہیں لیا۔ نہیں جی آپ اپنے ہی لوگ ہیں، آپ سے کرایہ کیا لینا اور نمستے کر کے چلا گیا۔

تو اب جولڑ کے متحدہ برلن کی اس سڑک پر سوویت کمیونزم کے آثار بہ طور تحائف فروخت کر رہے تھے وہ دنیا کی تازہ ترین سیاسی اور اقتصادی صورت حال کے نمائندہ تھے۔ یورپ اور

برطانیہ میں پاکستان کے احمدی اور دوسرے سیاسی پناہ گزین بھی بہت ملتے ہیں۔ جس سے پوچھو، کہتا ہے۔ جی میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا ممبر تھا۔ بڑا پراسیکیوشن ہوا۔ میاں پاکستان میں اتنی بڑی کمیونسٹ پارٹی کب پیدا ہوگئی؟ برطانیہ میں پناہ لینے والا بھائی کہتا ہے جی میں پی پی پی کا ممبر تھا۔ بڑا پراسیکیوٹ ہوا۔ بہن کہتی ہے جی میں بھٹو کے خلاف تھی، بہت پراسیکیوٹ ہوئی۔ دونوں کو سیاسی پناہ مل گئی، مع عمدہ کاؤنٹی کونسل فلیٹ اور وافر وظائف۔ لوگ باگ برسوں ملازمت ہی نہیں کرتے۔ یہی ٹھاٹھ ہالینڈ اور سوئیڈن کے سیاسی ''پناہ گزینوں'' کے ہیں۔ لندن میں ایک ایرانی نوجوان سیاسی پناہ گزین کو اپنا فلیٹ پسند نہیں آیا۔ اس نے حکومت کو کہہ کر دوسرا لے لیا۔ ایسا سرمایہ دارانہ فلاحی نظام کارل مارکس کے خواب وخیال میں بھی نہ آیا ہوگا۔

لیکن امریکہ پر ایکٹوٹی ہوگئی۔ اس نے کمیونزم کے خلاف اسلامی بنیاد پرستی کا جن بوتل سے باہر نکالا۔ اب وہ جن بوتل کے اندر جانے کے لیے تیار نہیں۔

عالم گیر بنیاد پرستی کی وجوہ پیچیدہ ہیں۔ غلو آمیز سیاسی احیاپسندی اور اب الیکٹرونک میڈیا کے تسلط اور جارحانہ قسم کے مغربی طرز حیات سے مدافعت اور اپنا تشخص برقرار رکھنے کی خواہش۔ مسلمانوں کی حد تک دو مثالیں سامنے موجود ہیں۔ ہندستان اور برطانیہ۔

Pill کی ایجاد کے بعد مغرب میں حد سے زیادہ جنسی آزادی پھیلی۔ لگ بھگ اسی زمانے میں لاکھوں آدم مع زن بچہ انڈیا، پاکستان، یوگنڈا اور جزائر غرب الہند سے برطانیہ پہنچا۔ اس نئی ''کلرڈ'' آبادی میں سرمایہ دار پروفیشنل مڈل کلاس اور مزدور بھی شامل تھے۔ نسبتاً قدامت پسند اور شریف انگریز عمر طبعی کو پہنچ کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ نئی نسل مادر پدر آزاد تھی۔ ویسٹ انڈین لوگوں کے یہاں جنسی آزادی بہت پہلے سے موجود تھی۔ بقول ایک پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور جو چالیس سال سے لندن میں آباد ہے ''جی یہ تو ان ویسٹ انڈین کالوں نے انگریزوں کو سکھلایا ہے کہ اصل آوارگی کیا ہوتی ہے۔'' جنوبی ایشیا سے گئے ہوئے قدامت پرست کنبوں نے اپنی لڑکیوں پر اپنی کلچر کی پابندیاں عائد کیں۔ بہت سی گھروں سے بھاگ گئیں۔ ان کے لیے ایشین ویمنز ریسکیو ہوم قائم کیے گئے۔ اپنی تہذیب اقدار اور مذاہب کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کا

رجحان بڑھا۔ مسجدیں، گوردوارے، مندر۔

شدید مذہبیت دائیں بازو کی طرف جھک جاتی ہے۔ چنانچہ اب برطانیہ اسلامی بنیاد پرستی اور وی ایچ پی دونوں کا گڑھ بن چکا ہے۔ تصادم بھی شروع ہو گئے۔ یہی صورت حال امریکہ کی ہے۔

میں پچھلے تیس پینتیس سال سے وقتاً فوقتاً برطانیہ جاتی رہی ہوں۔ موسم کے ساتھ ساتھ وہاں کا سماجی اور عمرانی منظر بھی بدل چکا ہے۔ انگریز اب عام طور پر امریکن انگریزی بولتا ہے۔ انتہائی قدامت پسند اخبارات میں اب تک امریکن انگریزی لکھی جاتی ہے۔ بی بی سی کا بھی یہی حال ہے۔ انگریز نے ایشیائیوں کی چند خصلتیں اختیار کر لی ہیں، چٹورا ہو گیا ہے۔ انگریزی زنانہ رسالوں میں مغلیہ کھانوں کی ترکیبیں چھپتی ہیں۔

وہ زمانے بھی لد گئے جب فٹ پاتھ پر اخبار کے ڈھیر رکھے رہتے تھے۔ راہ گیر اخبار خرید کر اس کے دام وہیں رکھ جاتے تھے۔ ریزگاری اور نوٹوں کی ڈھیریاں لگی رہتی تھیں۔ کوئی ان کو چراتا نہیں تھا۔ بڑے بڑے ڈپارٹمنٹ اسٹورز میں ہجوم کے باوجود مکمل خاموشی طاری رہتی تھی۔ اب سلفر بجز مچھلی بازار معلوم ہوتا تھا۔

عرب دولت سے عالی شان مساجد تعمیر کی گئیں۔ جابہ جا دینی مدرسے کھل گئے۔ مسلمان لڑکیوں کے لیے علاحدہ اسکول۔ لندن میں ایک شاندار امام خمینی گرلز ہائی اسکول بھی ہے اور نو مسلم وہابی مبلغ یوسف السلام (سابق پوپ سنگر کیتھ اسٹیونز) کا قائم کیا ہوا سنی اسکول بھی۔ نفاق بین المسلمین زور پکڑ چکا ہے۔ بریلوی مسجد میں وہابی نماز پڑھ لے تو وہ مسجد دھوئی جاتی ہے اور وہابی مسجد میں علی ہذا القیاس۔ شیعہ سنی فتنہ بھی بڑھ رہا ہے۔ مطلب یہ کہ مغرب میں آباد ہونے کے بعد مسلمان اپنے پسندیدہ مشاغل میں منہمک ہو چکا ہے۔ ناروے کے شہر اوسلو میں 1986 میں، میں نے پوسٹر لگے دیکھے جس میں برطانیہ کے بریلوی علمائے کرام بھی ایک میلاد شریف میں آنے والے تھے۔ ''لکھا تھا مستورات کے لیے علاحدہ انتظام ہے۔'' وہ پوسٹر اپنے ساتھ لیتی آئی تھی۔ اکبر نے لکھا تھا۔

وہاں پہ آنر بشپ ہے
یہاں بجائے نماز گپ ہے

معاملہ الٹا ہوگیا۔ گرجا گھروں میں اذانیں دی جارہی ہیں۔ ایک پُرفضا گاؤں کی Priory یعنی راہب خانہ خرید کر اس میں جزیرہ قبرص کے ترک حضرت مولانا شیخ ناظم نقش بندی نے اپنی خانقاہ قائم کرلی ہے۔ ہندستانی اور پاکستانی اولیا کے غائبانہ عرس بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ محرم تو خیر دھوم دھام سے ہوتا ہی ہے۔

دوسرا رخ یہ ہے کہ اسلام کی ایک انتہائی رجعت پسند تصویر مرتب ہوچکی ہے۔ ایک نومسلم صحافی Jensen نے لکھا تھا کہ پندرھویں صدی ہجری کا اسلام اس اسٹیج پر ہے جہاں پندرھویں صدی عیسوی میں اصلاح دین سے قبل مسیحیت تھی۔ مگر Jensen یہ بتانا بھول گئے کہ تحریک اصلاح دین کس حد تک عرب ایرانی آزادی افکار اور عرب سائنٹفک نظریات سے متاثر ہوئی جو براہ اندلس کر سپین یورپ پہنچے۔ اپنا اجالا دوسروں کو دے کر ہم خود تاریکی میں چلے گئے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

لفظ ''عرب'' اب علمیت کے بجائے محض عیاشی کا سمبل بن چکا ہے۔ لندن میں بڑے ہوٹل اور لگژری فلیٹ خرید کر شیوخ نے برصغیر کی لڑکیاں (یا وہ لڑکیاں جو برطانیہ میں ہی پیدا ہوئی ہیں) ان میں رکھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد وہ لامحالہ جسم فروشی کرنے لگیں۔ لندن کے Tabloid پریس یا محلوں کے مقامی اخبارات کے مخصوص قسم کے اشتہارات میں بھی ہوتا ہے۔

Exotic Indian Girl

Beautiful Pakistani Girl

مع پتا اور فون نمبر۔ فحش ''ایشیان گرل میگزین'' شائع ہورہے ہیں۔ گھر گھر بے ہودہ ترین انڈین پکچرز ویڈیو اور T.V Asia پر چل رہی ہیں۔ ہیلن کے رقص Vulgur کبھی نہیں لگے۔ آج کل کی فلموں کے ناچ گانے Obsence نہیں۔ 1992 میں میں نے ایک بڑے عبرت ناک واقعہ کا مشاہدہ کیا۔ دو مسلم پاکستانی لڑکیوں کو پریس نے بہت اچھالا جو اسٹیج پر بے لباس رقص کرتی

تھیں۔ان میں سے ایک کے والد بیرسٹر تھے جن کا انتقال ہو چکا تھا۔ جنگ (لندن) میں ان کے انٹرویو چھپے۔اس قسم کی بے ہودگیوں کے ردِعمل کے طور پر جوق در جوق ایشیائی مسلمان لڑکیاں اپنی خوشی سے محجوب ہو رہی ہیں۔ سفید اسکارف مغرب میں اسلامی تشخص کا سمبل بن چکا ہے۔

حال ہی میں لندن کے ایک جلسے میں میں سحاب قزلباش حسب معمول کھلے سر بیٹھی تھیں۔ اسٹیج پر سے ایک صاحب نے پرچہ بھیجا ''خاتون سر ڈھکیے'' سحاب نے پروا نہیں کی۔ پرچہ تین بار آیا۔ جلسے کے اختتام پر وہ صاحب خود سحاب کے پاس آئے، بولے ''خاتون! آپ ایک غیر شرعی حرکت کی مرتکب ہو رہی ہیں۔'' سحاب نے جواب دیا ''آپ بھی ایک خلافِ شرع حرکت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ نامحرم عورتوں کی طرف نظر اٹھانا منع ہے۔ آپ کیوں بار بار مجھے دیکھ رہے تھے۔''

ہوا کا رخ بدل چکا ہے۔ فیض صاحب کے انتقال پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا کہ وہ مرحوم پنجاب کے صوفی شعرا کی انسان دوستی کی روایت سے تعلق رکھتے تھے۔ تو لیجیے اب وہ واقعی پنجاب نیشنلزم کے تحت ایک ''پنجابی صوفی'' شاعر بنا دیے گئے ہیں جن کے لیے کہا جا رہا ہے کہ وہ میلاد شریف بھی کرواتے تھے۔

Glasnot تازہ تازہ شروع ہوا تھا۔ کلکتہ میں وویکانند آشرم اور ساہتیہ اکادمی کے اشتراک سے ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ ''دورِ حاضر میں وویکانند کی معنویت'' اس کا موضوع تھا۔ اس کے ایک سیشن کی صدارت مجھے کرنی تھی۔ وہاں آشرم میں ایک پرانی روسی دوست مل گئیں جو سوویت رائٹرز کی ایک اعلیٰ افسر تھیں۔ میں نے حیرت سے کہا ''بھئی! آپ یہاں کہاں۔ کہنے لگیں ''میں تو ہمیشہ سے ایک Seeker رہی ہوں۔''

اور ہماری چند سرخاسرخ فرخ آبادی خواتین مجلسیں پڑھ رہی ہیں۔

عزیز داب اللہ ہی اللہ ہے۔

(بہ شکریہ پروفیسر محمد اسلم۔ استاد شعبہ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

حواشی:

1. دشکا حیدر سیّد بنت حمیرا حیدر سید و جری احمد سید مرحوم۔ دشکا قائداعظم اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں تاریخ کی استاد ہیں۔ ان کے شوہر مشاہد حسین سید پاکستان کے نام ور صحافی ہیں۔ دشکا کے والد جری احمد سید جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کا ایک افسانہ رسالہ جامعہ میں 1937 میں شایع ہوا تھا جسے نئے اردو افسانے کا ایک پیش رو کہا جاسکتا ہے۔ جب سے اب تک بہت سا پانی جمنا کے پلوں کے نیچے سے بہہ چکا ہے۔ دشکا نے اپنی کتاب اپنی والدہ حمیرا حیدر سید اور والد مرحوم کے نام معنون کی ہے۔

Who envisioned Islam as a form for the creation of a just an egalatian society.

2. ان انقلابیوں میں جوشیلے جذباتی مسلمان، ہندو، سکھ، پنجابی، بنگالی سبھی شامل تھے۔ سب تحریکیں ناکام رہیں لیکن وہ کفن باندھ کر نکلنے والے لوگ تھے۔ اب لگتا ہے یہ دیوزاد تھے جو کسی اور کرۂ مریخ وغیرہ سے آئے تھے۔ اس دیس کے باسی نہیں تھے جس نے آج کے بے ضمیر اور جرائم پیشہ اہل سیاست کو جنم دیا ہے۔ ان میں مراد آباد کے صوفی اسبار شاہ جیسے لوگ شامل تھے جو مولوی کے بھیس میں طہران رہے۔ بھیس بدل بدل کر دوسرے ملکوں میں رہنا اور جان کی بازی لگا کر کسی خفیہ سیاسی تنظیم کے احکام پر عمل کرنا ان کا مقصد تھا، مارے گئے یا عسرت اور گم نامی میں مرے۔

لکھنؤ کے مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے فتویٰ دیا کہ ہندستان دارالحرب ہے اور بے شمار مسلمان اپنی جائیدادیں نہایت سستے داموں ہندوؤں کے ہاتھ بیچ کر ہجرت پر چل کھڑے ہوئے۔ پیدل کابل پہنچے۔ کہاں کہاں مارے پھرے، 1947 کی ہجرت کی۔ انتظار حسین نے ایک Myth تیار کی ہے لیکن اس دور کی تباہ کن ہجرت پر اردو میں ایک بڑا ناول لکھا جانا باقی ہے جو ہندی مسلمانوں نے محض ایک خواب اور ایک جذباتی اپیل کی بنا پر کی تھی۔ مغربی صیہونیت کی پشت پناہی پر بے اندازہ دولت تھی۔ مسلم لیگ کے مطالبہ

پاکستان کے دوران سیاسی صورت حال ہی مختلف تھی مگر ان بے چارے مہاجرین کو سب بھول چکے ہیں جنھوں نے محض ایک فتوے کی بنا پر اپنے گھر بار تج دیے۔

3. مولانا عبیداللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات: ''بہ سعی واہتمام'' محمد اسلم۔ استاد شعبہ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ناشر ندوۃ المصنفین، سمن آباد، لاہور۔

مولانا عبیداللہ سندھی 1872 میں ضلع سیال کوٹ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کیا اور 1888 میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے جہاں ان کو شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے بزرگوں کی صحبت ملی۔ 1905 میں حضرت شیخ الہند نے جمعیت انصار کی تاسیس کا کام ان کے سپرد کیا لیکن مولانا سندھی کے مخصوص نظریات کی بنا پر دیوبند کے ارباب اہتمام ان کے مخالف ہو گئے اور مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کی مخالفت شروع کی جو ان کی تکفیر پر منتج ہوئی اور مولانا کو دیوبند سے دہلی آنا پڑا۔ 1914 میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے ساتھیوں نے اس موقع پر انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے غنیمت جانا اور مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل روانہ کیا تاکہ وہ امیر افغانستان کو آمادہ کریں کہ وہ ہندستان پر حملہ کر دے۔ صوبہ سرحد پر قبائلی لشکر ان کا ساتھ دیں، ادھر ہندستانی بھی حملہ کر دیں اور ملک آزاد ہو جائے۔ کابل پہنچ کر مولانا برکت اللہ راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا سندھی نے آزاد ہند حکومت کی بنیاد رکھی۔ حضرت مولانا شیخ الہند ہندستان سے حجاز گئے کہ وہاں کے ترک گورنر کے توسط سے حکومتِ ترکیہ کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ہندستان کا ساتھ دے تاکہ افغانستان برٹش انڈیا پر حملہ کر دے۔ کابل سے مولانا عبیداللہ سندھی نے پوری اسکیم ریشمی رومالوں پر لکھ کر ایک قاصد کے ذریعے شیخ عبدالرحیم سندھی (وہ بھی ایک نومسلم انقلابی اور اچاریہ کرپلانی کے بھائی تھے) کو بھیجی۔ اس قاصد کو ایک سرکاری مخبر نے ملتان میں گرفتار کرا دیا اور سینکڑوں افراد ریشمی رومال سازش کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ ادھر حجاز میں شریف حسین مکہ کی

وساطت سے شیخ الہند مولانا محمود حسن مع اپنے رفقا کے مالٹا میں گرفتار کر کے نظر بند کر دیے گئے۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دینِ مصطفیٰ

تحریک کی ناکامی کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل چھوڑنے کا حکم ملا اور وہ ماسکو چلے گئے۔ وہاں آٹھ ماہ رہ کر کمیونزم کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام کے معاشی نظام کا کوئی جواب نہیں اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے جس انداز سے مزدوروں، کاشت کاروں اور اہل صنعت و حرفت کے مسائل حل کیے ہیں، ویسا حل کمیونسٹ بھی پیش نہیں کر سکے۔ جولائی 1923 میں مولانا سندھی روس سے ترکی تشریف لیے گئے جہاں اتاترک خلافتِ عثمانیہ کو ختم کر چکے تھے۔

ڈاکٹر محمد اقبال شیدائی 1888 میں سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1917 میں بی اے کیا اور مولانا شوکت علی کی تحریک و ترغیب پر انجمن خدام کعبہ میں شامل ہو گئے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے فتوے پر انھوں نے بھی کابل ہجرت کی۔ وہاں سے انھیں تاشقند بھیجا گیا پھر وہ مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ ماسکو گئے جہاں انھیں ترکی سفارت خانے سے پاسپورٹ ملا اور وہ انقرہ پہنچ گئے لیکن وہاں خلافت ختم ہو چکی تھی اور شیدائی اس کے حامی تھے لہٰذا انھیں ترکی سے اخراج کا حکم ملا اور وہ یورپ چلے گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ روم سے انگریزوں کے خلاف ریڈیو پر براڈ کاسٹ کرتے رہے۔ جنگ کے خاتمے پر پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں ہندستان میں عبوری حکومت قائم ہوئی تو مولانا ابوالکلام آزاد نے پنڈت نہرو سے ان کے سلسلے میں بات کی اور پنڈت جی کی سفارش پر برطانیہ نے ان کو ہندستان واپس آنے کی اجازت دے دی۔ 1942 میں وہ پاکستان پہنچے۔ اسکندر مرزا کے دورِ حکومت میں انھوں نے کسی افسر کی اسلحے کی خریداری کی دھاندلی کی اطلاع دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس مردِ مجاہد کو جو وطن کی خاطر آدھی دنیا میں مارا مارا پھرا تھا، ملک چھوڑنے کا حکم ملا اور وہ پھر اٹلی چلے گئے۔

1965 میں پاکستان آئے اور 1974 میں رحلت کی۔

5. عین اسی زمانے کے ایک گروپ فوٹو گراف میں لالہ لاجپت رائے، یلدرم اور دوسرے احباب اٹلی کے شہر روم کے ایک تاریخی کھنڈر کے سامنے بہ طور سیاح موجود ہیں۔ یہ فوٹو گراف میرے چچازاد بھائی سید سعید حیدر مرحوم کے نادر ذخیرۂ تصاویر میں محفوظ ہے۔ اس کی ایک کاپی بنوا کر مرحوم نے چند سال قبل مجھے کراچی میں دی۔ لالہ لاجپت رائے "مخزن" کے پرانے مضمون نگار بھی تھے۔

6. ترکی میں قیام کے دوران مولانا سندھی نے اپنا سیاسی پروگرام شایع کیا۔

1- ہندستان کے لیے کامل آزادی حاصل کرنا اور آزاد وطن میں دفاقی نظام حکومت قائم کرنا۔

2- ہندستان میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں اور اسلام کو محفوظ کرنا۔

3- ہندستان میں محنت کش طبقے کی اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرنا۔

4- امپریلزم کا توڑ کرنے کے لیے ایشیا تک فیڈریشن بنانا۔

اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے مولانا سندھی نے سرراجیہ پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل کی۔ یہ پارٹی رنگ و مذہب اور مال و دولت کے فرق کو مٹا کر انڈیا میں جمہوری حکومت قائم کرنا چاہتی تھی۔

مولانا سندھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ ہندستان کے تین قدرتی حصے ہیں۔ یعنی شمال مغربی، مشرقی اور جنوب۔ وہ ان حصوں کو لسانی اور تمدنی بنیادوں پر صوبوں میں تقسیم کر کے وہاں جمہوری حکومتیں قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ جمہوریتیں داخلی معاملات میں بالکل آزاد ہوں گی اور وفاقی حکومت کے پاس صرف امور خارجہ، دفاع اور ایکسپورٹ، امپورٹ کے محکمے ہوں گے۔

مولانا سندھی یہ بھی چاہتے تھے کہ ان جمہوریتوں کی مجالس قانون ساز میں کسان مزدور، دماغی کام کرنے والے کلرک، تاجر اور کارخانہ دار اپنی آبادی کے تناسب سے اپنے ہی

طبقے سے نمائندے چنیں۔ اس طرح ان مجالس قانون ساز میں محنت کشوں کی اکثریت ہوگی اور یہ لوگ اپنے مفاد کی کما حقہ حفاظت کر سکیں گے۔

مولانا سندھی فوائد عامہ کے تمام ذرائع تو میانے کے حق میں تھے۔ اسی طرح وہ منقولہ جائیداد کی حد متعین کرنے کے بھی حامی تھے۔ زرعی زمینوں کے بارے میں ان کی یہ رائے تھی کہ ایک کاشت کار کے پاس اتنی ہی زمین ہونی چاہیے جس پر وہ خود کاشت کر سکے۔ وہ سودی نظام ختم کرنا چاہتے تھے اور قومی ملکیت میں لیے گئے کارخانوں کو مزدوروں کی انجمنوں کے ذریعے چلانے کے حامی تھے۔ داخلی تجارت کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ اسے کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے اور اگر کاروباری لوگ چاہیں تو وہ ان سوسائٹیوں کے رکن بن سکتے ہیں، جہاں تک برآمدات کا تعلق ہے یہ حکومت کے ہاتھ میں رہیں گے۔

مولانا سندھی مڈل تک مفت تعلیم کے حامی تھے۔ وہ محنت کشوں کو مفت طبی امداد اور صاف ستھرے گھر دلانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جمہوریت کا سرکاری مذہب وہاں کی اکثریت کا مذہب ہونا چاہیے، لیکن وفاقی حکومت سیکولرازم پر کاربند ہو اور وہ کسی کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔

جہاں تک وفاقی حکومت میں ریاستوں کی نمائندگی کا تعلق ہے، مولانا سندھی نے ترک حکومت کی اجازت سے یہ پروگرام طبع کروا کر اپنے دوست احباب کو بھیجا۔ برطانوی حکومت نے 15 مئی 1925 کو ایک حکم نامہ کی رو سے انڈیا میں اس پروگرام کے داخلے پر پابندی عائد کر دی۔

بعد ازاں مولانا نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی اور تیرہ سال مکہ معظمہ میں گزارے۔ 1937 میں جب ہندستان کے متعدد صوبوں میں کانگریس برسر اقتدار آئی تو کانگریسی رہنماؤں نے مولانا سندھی کی واپسی کے لیے برطانوی حکومت پر زور ڈالا۔ وہ واپس آئے اور ان کا قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی میں رہا۔ اب ہندستان میں دیوبندی

مولانا ان کے مخالف ہو گئے۔ مولانا سندھی کا خیال تھا کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا مگر مسلمان دینی طبقہ بہت پیچھے ہے، اسے پرانی ڈگر سے ہٹنا ہوگا۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی فرماتے ہیں: ''شاہ ولی اللہ کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی سے زیادہ روشن دماغ عالم کوئی نہیں ہوا۔'' 22 اگست 1944 کو ان کا انتقال ہو گیا۔

داستان عہد گل

تری وندرم کے راج محل کے ایک اسٹوڈیو میں راجہ روی ورما رائل اکیڈیمی آف آرٹ لندن کے نیم کلاسیکل، نیم رومانی اسٹائل میں قد آدم روغنی تصاویر بنانے میں مصروف ہیں۔ زمانہ: اختتام انیسویں صدی۔ تصویر کے نسوانی فیگر اور ان کے پوز یونانی دیویوں اور اٹھارھویں صدی برطانیہ کی فربہ مطمئن ارسٹوکریٹ لیڈیز سے مشابہ ہیں لیکن کلاسیکل Draperies یا یورپین ملبوسات کے بجائے ساڑیاں، جوڑے اور قشقے۔ موضوع وینس اور ہیلن اور ڈچز آف مارل برو کے بجائے شکنتلا اور دمینتی۔ لیکن ان کی صورتوں اور ساڑیوں کی وضع بھی ملیلالی کے بجائے مرہٹی۔ کیونکہ راجہ روی ورما کی مسٹریس ایک مراٹھن ہے۔

تو گویا ان مشہور تصاویر کے ماخذ تین ہوئے۔ برطانوی رائل اکیڈمی جس کا اسٹائل گورنمنٹ آف انڈیا کے قائم کردہ آرٹ اسکولوں میں سکھلایا جارہا تھا (اور رائل اکیڈمی اطالوی نشاۃ ثانیہ والی مصوری کی کلاسیکل روایات کی پابند تھی) اور نئی ہندستانی تہذیبی تجدیدیت کے زیر اثر پراچین سنسکرتی کے کردار سیتا شکنتلا دمینتی۔ اور بالکل ذاتی انسپریشن: ایک مرہٹی رقاصہ۔

راجہ روی ورما کی مثال کو آپ اس تشکیلی دور کے اردو ادب بالخصوص فکشن پر منطبق کیجیے،

بات صاف ہو جائے گی۔

وہ تشکیلی دور اردو ادب کا عہد گل تھا، جب نوجوان اہل قلم، شاعر، افسانہ نویس، مضمون نگار اور ادبی رسالوں کے مدیر اردو لٹریچر کی ترقی کے مساعی کو قومی اور تہذیبی فریضہ جانتے تھے۔ نئے اسالیب ادب سرسید اور مولانا حالی کے مشن کی توسیع بھی تھے اور مغرب کی نت نئی ایجادوں کی طرح تازہ اور انوکھے انکشاف بھی۔ نئے ادبی تجربے وہ خود بھی کر رہے تھے اور مغرب سے بھی اخذ کرنے میں مصروف تھے۔ گویا اپنے گیتا، ایرانی، مغل، راجپوت مجسموں، تصویروں اور ظروف کے گرد و آلود گودام میں موجود مغرب کی سمت دریچے وا کر کے تازہ دم ہونے کے بعد اپنے ذخیرے کی جھاڑ پونچھ کر رہے تھے اور ولایتی فن پاروں کو بھی اپنے سامنے رکھنے میں مصروف تھے۔ تیشے، موقلم، رنگ، کینوس، کاغذ اور موڈل یہ سارا سکنڈ ہینڈ مال انگلستان سے حاصل کیا جا رہا تھا۔ فنی اوزار سکنڈ ہینڈ سہی لیکن 1857 کے بعد گیس لائیٹ سے روشن اور ریلوے ٹرین پر رواں دواں یہ زمانہ کم دلفریب نہ تھا۔ نئی صدی برقی روشنی سے منور ہوئی۔ سوئیز میں سے گزرنے والے دخانی جہازوں کی رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ اکا دکا مسلمان لڑکیاں ''میگزینوں'' میں ''آرٹیکل'' اور ''ایسّے'' لکھ رہی تھیں۔ نئی صدی کے اس سارے اکسائٹمینٹ اور ولولے اور مسرت کی جھلک ان اوّلین تحریروں میں ملتی ہے جو نئے ادبی رسالوں میں چھپ رہی تھیں۔ مثال کے طور پر اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار مس نذر الباقر[1] اپنے مضمون ''مکالمہ'' (1906 عیسوی) میں بطور نئی روشنی کے ایک سمبل ''گراموفون'' کا تذکرہ کرتی ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن ''ڈرائنگ روم'' میں ایک قدامت پسند مہمان بی بی سے ''شیک ہینڈ'' کرنے کے بعد ان کو سمجھاتی ہیں کہ زمانہ انگریزی پوشاک (جو وہ دونوں خود پہنتی ہیں) بہ لحاظ پردہ و حفظان صحت دیسی لباس سے افضل ہے۔

یلدرم کی 'حکایۂ لیلےٰ و مجنوں' (1907 عیسوی) میں قیس ''بائیسکل'' چلاتا ہے اور لیلےٰ اسے ''تار'' بھیجتی ہے اور ''25 گھوڑوں کی طاقت والی موٹر کار'' پر روانہ ہو جاتی ہے۔ اس مضمون میں بنت نذر الباقر اور یلدرم کا ذکر اس اولین دور کے دو ایسے نمائندوں کی حیثیت سے کروں گی جن سے میں ذاتی طور پر واقف تھی۔ ان نوجوانوں اور ان کے ساتھیوں کے لیے ان کا اپنا تہذیبی

اور قومی ورثہ بھی بہت اہم تھا۔

نصف صدی قبل ان کے بزرگوں کو برطانیہ کے مقابلے میں جس شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا تھا اس سے یہ نئی نسل بے حد دل گرفتہ اور مضطرب تھی اور اپنی رنجیدہ اور پشیمان دنیا کو ترقی یافتہ مغرب کے قریب بھی لانا چاہتی تھی۔ نہ بھولیے کہ یہ بنیادی صورت حال آج 1983 عیسوی میں بھی اسی طرح موجود ہے۔

اور آج جبکہ ہمارے طرز رہائش، ادبیات، بول چال کی زبان افکار و خیالات، حرکات وسکنات تک پر مغرب کی اتنی گہری چھاپ پڑ چکی ہے کہ ہم کو فرزندانِ تثلیث کے اس عمیق نفسیاتی تصرف کا اس وقت بھی اندازہ یا احساس نہیں ہوتا جب ہم نیشنلزم یا حالیہ ''اسلامی تجدیدیت اور بنیاد پرستی'' کے زیر اثر مغربیت سے خود کو آزاد کرانے کی سعی میں جدید علوم و اصطلاحات اور ذرائع ابلاغ بھی مغربی ہی استعمال کرتے ہیں!

''قومی تشخص کی تلاش'' کا تذکرہ بالخصوص پاکستان میں ادبی فیشن بن چکا ہے۔ اور آج کا عالم اسلام اور سارا جہانِ سوئم مختلف سطحوں پر اس تلاش میں سرگرداں ہے۔ مقصد وہی ہے کہ خالص اپنی Sources کی طرف لوٹا جائے اور انھیں اُجاگر کیا جائے۔ یہ عمل عالم اسلام میں اٹھارھویں صدی سے شروع ہو چکا تھا لیکن بنگالی بابوؤں اور ایم اے او کالج کے طلبا کی ذہنی تشکیل کرنے والوں کی ہم قوم لیڈی برٹن اور دوسرے امپیریلسٹ انگریزوں نے بار بار استہزا کے ساتھ کہا کہ نیٹو ذہن یا مشرقی ذہن اور سیکنڈ نہیں نقائی البتہ بہت اچھی کر سکتا ہے۔

کیا مشرقی ذہن واقعی اور سیکنڈ نہیں رہا تھا؟ یہاں اردو ادب کی بات کی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں چند تاریخی حقائق پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کا اثر مجموعی طور پر ان کے شعر و ادب پر منعکس ہوتا ہے۔ سب رس 1638 عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ پلگرمز پروگریس 1678 عیسوی میں لیکن پادری جان بنین نے بے چارے ملا وجہی کو مار گرایا۔ لہٰذا دیکھیے انگریزی فکشن وہاں جا پہنچا جہاں وہ ہے اور اردو جہاں وہ ہے۔ فارسی شاعری چاسر سے بہت قبل عروج پر پہنچ چکی تھی لیکن جدید عالمی ادبی اٹلس پر چاسر

کے ہم قوم و ہم زبان چھائے ہوئے ہیں۔

1790 عیسوی میں جب کانپور کے سید حسین شاہ نے بزبان فارسی جان کمپنی کے عیاش انگریزوں اور ان کی تنخواہ دار مسلمان طوائفوں کے متعلق ''نشتر'' تصنیف کیا وہ نہ جانتا تھا کہ ہمارے انحطاط اور سیاسی غلامی کا نشتر میں پہلا مبصر ہے۔ نہ اسے یہ معلوم تھا کہ ہندستانی ادبیات میں تقلید ادب کا جو دور شروع ہونے والا ہے اس کے برعکس اس نے ایک اور بجنل ''ناول'' تصنیف کیا ہے۔ ''نشتر'' اس نے ایک ایسی زبان میں لکھا تھا جو عنقریب ہندستان سے معدوم ہونے والی تھی۔ چند سال بعد ہی کمپنی بہادر نے استمراری بندوبست کی طرح اردو نثر کا انتظام بھی فورٹ ولیم کے ایڈمنسٹریشن کے ذریعے کر ڈالا۔ لیکن ان کے منشی صاحبان نے کلکتے اور دلّی کی عصری زندگی کے بارے میں بھی کچھ کیوں نہ لکھا جس طرح حسن شاہ نے فارسی میں کانپور چھاؤنی کے متعلق حقیقت نگاری کی تھی؟

ہم لوگ اُنیسویں صدی میں برطانیہ کی سیاسی تہذیبی اور ذہنی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ ہمارے ہاں آٹھ سو سال قبل بابِ اجتہاد بند کیا جا چکا تھا۔ حالاں کہ عالم اسلام ہی ذہنی اقتصادی، اشتراکی تصوّرات و نظریات کا اوّلین گہوارہ رہ چکا تھا۔ یورپ کے سیاسی اور ذہنی انقلابات سے صدیوں قبل عراق و ایران میں وہ حیرت انگیز اشتراکی اور علمی تحریکیں ابھریں جن کو ''مزدکی'' اور زندیقی اور ''مرتدانہ'' قرار دے کر کچلا گیا۔ صوفیائے کرام نے ایک طرف Establishment کے خلاف آواز بلند کی دوسری طرف انھوں نے فرائیڈ اور ینگ سے سینکڑوں برس قبل نفسیات کے رموز آشکار کیے۔

فارسی شاعری میں ''رند و میخانہ'' آزادی افکار اور ''شیخ و محتسب'' ینگ نظری کے سمبل بنے لیکن ینگ نظری کے خلاف اصل اور دور رس جیت اہل یورپ کی ہوئی۔

آج ہم بار بار دہراتے ہیں کہ یورپین نشاۃ ثانیہ مسلمانوں کی علمیت کا مرہونِ منت ہے۔ لیکن خود اس کشادہ مشربی اور وسیع النظری کی مخالفت پر کمربستہ ہیں جس نے میڈیول مسلمانوں کو یورپین نشاۃ ثانیہ کا جنم داتا اور پیش رو بنایا تھا۔ تثلیث کے فرزند سیراب خلیل کیوں نہ

لے جاتے جبکہ مغرب میں اب اجتہاد ہی اجتہاد تھا؟

ہندستان میں 1857 عیسوی کے بعد اچانک ہماری آنکھیں کھلیں۔ تو گھٹا ادبار کی چھائی ہوئی تھی۔ اُمت پر عجب وقت آن پڑا تھا۔ اُمت کے ادب کا یہ حال تھا کہ مولانا محمد حسین آزاد کو نیرنگ خیال میں لکھنا پڑا:

''اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی طوطا مینا
کی زبانی سنائیں ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بٹھائیں یا پریاں
اڑائیں اور دیو بنائیں اور ساری رات ان باتوں میں گنوائیں۔''

مگر یہ چار فقیر بھی لنگوٹ بندھوا کر فورٹ ولیم کے ''صاحبانِ عالیشان'' ہی نے بٹھلائے تھے۔ شکر ادا کیجیے کہ پرتگالیوں، ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کے مقابلے میں ڈاکٹر گلکرسٹ، کرنل ہالرائیڈ اور پروفیسر تھیوڈور مورِیسن کی قوم جیتی ورنہ تعلیمی اور ادبی لحاظ سے ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو اُن اقوام کی نوآبادیوں کا ہوا۔

مراقش میں پہلا ناول A Life Full of Holes آج سے محض بیس سال قبل لکھا گیا ہے!

لیڈی برٹن اور ان کے ہم قوم احساسِ برتری اور نسلی تفاخر کے نشے میں چور بد دماغ وکٹورین تھے لیکن برطانوی لبرل ازم، روشن خیال امپریلزم مشنریوں کی پھیلائی ہوئی انگریزی تعلیم اور برطانوی اور یورپین مستشرقین کی تحقیقات کی بدولت ہی سماجی اصلاحات اور قومی و تہذیبی احیا کا دور شروع ہوا۔ مغرب کی لبرل ہیومنزم کی اقدار نے ہماری سیاسی جدوجہد کی رہبری کی۔ اور سارا ہندستانی ادب تقلید فرنگ کے بل بوتے پر ہی ''جدید'' کہلانے کے لائق ہوا۔ اگر درڈزورتھ شیلے اور کیٹس نہ ہوتے تو رابندر ناتھ ٹیگور بھی نہ ہوتے۔ بات پھر وہیں قوموں کے عروج وزوال تک پہنچتی ہے۔ شیکسپیئر کو انگلستان کا کالیداس کیوں نہ کہا گیا۔ شیکسپیئرین ڈراموں کو دیسی جامہ پہنانے والے آغا حشر کاشمیری نہایت فخر سے ''انڈین شیکسپیئر'' کیوں کہلائے۔ سنسکرت ناٹک کی جنم بھومی میں آج ڈرامہ نگاری اس قدر کمزور اور پھسپھسی کیوں ہے؟ مہا بھارت، جاتک، پرانوں، الف لیلیٰ، فارسی حکایات داستانوں اور ''گنجی کی کہانی'' وغیرہ وغیرہ کی

سرزمین مشرق میں "ناول" اور "افسانہ" مغرب سے کیوں آیا۔ یہیں سے کیوں نہ اُگا؟ جبکہ اطالوی نوویلا کے اصل جنم داتا موئرش اسپین کے قصے تھے؟

اب ایک مختصر اور محدود موضوع کی طرف آیئے جس کا تعلق اس کتاب یعنی "انتخاب یلدرم" سے ہے۔ رومانیت کے یورپین ادبی اسلوب کے ترکی ورژن کو اُردو تک پہنچانے کے لیے چند اختتام صدی ترک ادیبوں نے مڈل مین یا بروکر کا رول ادا کیا۔ اور وہ بھی ایک برطانوی کولونیل مدرسے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے راستے سے؟

اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اردو ادب ایک ایسا مغل By-product تھا جو دہلی کالج کے تعلیم یافتہ بزرگوں کے ذریعے اور کولونیل تعلیم و تربیت کے نئے مراکز علی گڑھ اور لاہور میں بار آور ہو رہا تھا۔

اب قصہ یہ تھا کہ علی گڑھ اور لاہور کو کلکتہ سے Catch-up کرنا تھا۔ 1857 عیسوی کے وائرشیڈ کے اُدھر یعنی اوائل اُنیسویں صدی میں کلکتہ کا نیٹو شاعر ولایتی رومانیت میں ڈبکیاں لگاتی انگریزی شاعری کر رہا تھا۔ اس وقت لکھنؤ اور دلّی اور پٹنہ کا اردو شاعر لارڈ بایرن کے نام سے ناواقف تھا اور مرزا ابوطالب اصفہانی، تفضل حسین کاشمیری اور عبدالرحیم گورکھپوری "دہریہ" جیسے نوگ محبوبِ روزگار سمجھے جا رہے تھے۔

ہم عصر جین آسٹن اور ڈکنز کے بجائے اٹھارھویں صدی کے چند انگریزی ناول اردو میں ترجمہ کیے گئے۔

مشنریوں نے 1746 عیسوی میں عہد نامہ قدیم کے چند ابواب اُردو میں ترجمہ کر کے شایع کیے تھے۔ اوائل اُنیسویں صدی میں آگرہ چرچ مشنری ایسوسی ایشن نے تالیف و ترجمہ کا کام شروع کیا۔ سکندرہ میسنجر، اُردو کا پندرہ روزہ خیر خواہ خلق اور ہندی ماہنامہ لوک متر جس میں مختصر اخلاقی قصے بھی شایع کیے جاتے۔ 1839 عیسوی میں آگرہ اسکول بک سوسائٹی نے ڈاکٹر سیموئل جانسن کے واحد ناول "ریزیلاس" (1759 عیسوی) کا اُردو میں ترجمہ کروا کر شایع کیا۔ اس اخلاقی ناول میں شہزادہ حبشہ ریزیلاس (راس الیاس؟) مع اپنی بہن اور مصاحب صحیح اور

بہترین طرز حیات اور اطمینان بخش فلسفہ حیات کی تلاش میں قاہرہ پہنچتا ہے۔ وہاں مختلف عاقل و دانا لوگوں سے شہزادے اور اس کی بہن کے طویل مکالمے اور پند و نصائح اٹھارھویں صدی کی عقلیت پرستی پر مبنی ہے۔

مسیحی مبلغین یقیناً ہندستانی بچوں کی صحیح و صالح تعلیم و تربیت کے متمنی تھے مگر اس ناول کے انتخاب میں چند اور نکات بھی مضمر تھے۔ یعنی پیارے بچو! برطانوی حکومت کی برکات کے مقابلے میں مشرقی ظلم و بربریت کا حال بھی پڑھو۔ جن دنوں شہزادہ حبشہ قاہرہ میں مقیم ہے مصر کا ظالم باسا (پاشا) پابہ زنجیر قسطنطنیہ لے جایا جاتا ہے "جہاں وہ قتل کر دیا گیا ہوگا۔" عرب سردار لوٹ مار کرتے ہیں۔ شاعر املاک شہزادے کو بتلاتا ہے کہ وہ فلسطین میں شمالی اور مغربی یورپین لوگوں سے ملا، "یہ اقوام آج ساری طاقت اور سارے علم کی مالک ہیں۔"

"ان کی افواج ناقابل تسخیر اور ان کے بحری بیڑے کشور کشائی میں مصروف ہیں۔ جب میں نے ان کا مقابلہ اپنے نیٹو لوگوں سے کیا تو وہ بالکل ایک جداگانہ مخلوق معلوم ہوئے۔ ہزاروں علوم و فنون جن کا ہم نے نام بھی نہیں سنا ان کے تابع ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

شہزادے نے پوچھا۔ "یورپینوں کے اقتدار کا سبب کیا ہے؟ وہ تجارت یا سیاسی تسلط کے لیے اتنی آسانی سے ایشیا اور افریقہ کیسے آجاتے ہیں؟ ہم ایشیائی اور افریقی ان کے ساحلوں پر حملے کیوں نہیں کرتے؟ ان کی بندرگاہوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کر کے ان کے حکمرانوں پر اپنے قوانین نافذ کیوں نہیں کرتے؟ وہی سمندری ہوائیں جو اُن کو یہاں لاتی ہیں ہمیں وہاں کیوں نہیں لے جاتیں؟"

املاک نے جواب دیا "حضور۔ وہ لوگ ہم سے زیادہ طاقت ور ہیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ عاقل ہیں۔ جس طرح انسان جانوروں کو مطیع کرتا ہے اسی طرح علم ہمیشہ جہالت پر غلبہ پائے گا۔ لیکن ان کا علم سے زیادہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ سوائے اس کے بیان نہیں کی جا سکتی کہ یہ مشیت ایزدی ہے۔"

یہ آخری جملہ یورپین اور برطانوی سامراج کے فلسفے کا نچوڑ تھا۔ ڈاکٹر جانسن نے یہ ناول

1759 عیسوی میں لکھا تھا۔

دو سال قبل 1757 عیسوی میں انگریز پلاسی میں بے چارے سراج الدولہ کو شکست و فاش دے کر ہندستان میں اپنی ایمپائر کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ وکٹورین انگریز بھی یہی سمجھتے تھے کہ ہندستان پر ان کا تسلط عین رضائے خداوندی کے مطابق ہے۔ لہٰذا آگرے کے انگریز مشنریوں نے یہ ناول بطور ٹیکسٹ بک اُردو میں ترجمہ کروایا اور اس میں جو اعلیٰ درجے کی اخلاقیات اور مسائلِ حیات کے متعلق بصیرت افروز خیالات پیش کیے گئے تھے انھوں نے غدر کے بعد منشی کریم الدین مصنف ''خطِ تقدیر'' اور ڈپٹی نذیر احمد دونوں کی تصانیف کو متاثر کیا۔

پادریوں کے تبلیغی اور اصلاحی مشن نے بنگال میں 1857 عیسوی سے قبل جو ذہنی انقلاب بپا کیا اسی نوع کے محرکات کی ایک جھلک ہمیں ''توبۃ النصوح'' میں نظر آتی ہے۔ مشنریوں کی تبلیغ کے تدارک کے لیے ہمارے مصلحین نے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نعیم اپنے باپ نصوح کو یہ بھی بتاتا ہے کہ آگرے کے ایک پادری صاحب دلّی کے چاندنی چوک میں مناظرے کرتے تھے اور لوگوں کو کتابیں تقسیم کرتے تھے۔ وہ ان سے ایک کتاب مانگ لایا جس میں ''سلیس اُردو میں کسی خدا پرست اور پارسا آدمی کے خیالات تھے'' اس کے مطالعے کے بعد نعیم نے بیہودہ کتاب ''بہارِ دانش'' جو وہ مکتب میں پڑھتا تھا پھاڑ کر پھینک دی۔ یاد رہے کہ اپنی کتابوں اور انجیل مقدس کے ترجمے کے ذریعے مشنری سلیس اُردو بھی رائج کر رہے تھے۔

نصوح بیٹے سے کہتا ہے ''اہل اسلام اور عیسائیوں کے متعلقات میں کچھ اختلاف ہے مگر پھر بھی جتنا عیسائیوں کا مذہب اسلام سے ملتا ہوا ہے اتنا کوئی دوسرا مذہب نہیں۔ قرآن میں کئی جگہ عیسائیوں اور ان کے بزرگان دین قسیسوں اور راہبوں کی تعریف آئی ہے۔ عیسائیوں کے ساتھ موا کلت درست، مناکحت روا، غرض اس قدر مغائیرت کہ اہل اسلام عیسائیوں کے ساتھ برتتے ہیں میں اسے ٹھیک نہیں سمجھتا۔ یہ اس ملک کے ہندوؤں کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔''

سرسید کی بھی یہی کوشش رہی کہ شکست خوردہ برافروختہ پسماندہ مسلمانوں کا دل انگریزوں اور عیسائیوں کی طرف سے صاف کریں تاکہ وہ انگریزی تعلیم کی طرف بھی متوجہ ہوں

انگلستان میں پادری جان بنین، ڈینیل ڈیفو اور سیموئیل رچرڈسن نئے بورژوا پیوریٹین ادیبوں نے عہدِ جدید میں داخل ہونے والی نسلوں کے لیے اخلاقی ناول لکھے تھے۔ ڈیڑھ دو سو سال بعد اُردو میں یہی رول ہمارے ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نے انھی جان بنین اور ڈیفو وغیرہ کے ناولوں سے متاثر ہو کر ادا کیا۔

ہمارے مصلحین نے پروٹسٹنٹ ورک ایتھک کی طرح ہمارے لیے بھی ایک انڈو اسلامک ورک ایتھک پیش کی۔ (گورمائن لوتھر اور شاہ ولی اللہ میں نہ صرف چند صدیوں کا فرق تھا بلکہ یورپ میں اس تحریک نے عہدِ جدید کا آغاز کیا۔ ہمارے ریفارمیشن اور اس کے محرکات کی نوعیت قطعاً مختلف تھی۔ سرسید نے جس قسم کے لوگوں کو "عقل کے دشمن" کہا تھا آج سو سال بعد ان کی تعداد بہت زیادہ ہو چکی ہے۔

1857 ہمارے لیے ہر لحاظ سے ایک زبردست واٹرشیڈ ہے۔ اس ہنگامے کے متعلق ڈپٹی نذیر احمد گواہ ہیں کہ جنگِ آزادی کے ایک قائد نواب بہادر خاں "ہیروں زیورات سے لدے دولہا بنے گھوڑے پر سوار دلّی کی دوکانیں لُوٹتے پھر رہے تھے۔

ہم سرسید کی بے پناہ وفاداری اور انگریز پرستی سے ذرا جھینپتے ہیں مگر ایامِ غدر میں "باغیوں" کی افراتفری، نفاق، پسماندگی، خودغرضی اور جہالت کے جو نظارے انھوں نے دیکھے تھے ان کے مقابلے میں صف آرا صاحبانِ فرنگ کی فتح سے سرسید کا متاثر ہونا لازمی تھا۔

1224 میں فریڈرک دوئم نے یونیورسٹی آف نیپلز اس لیے قائم کی تھی کہ عرب سائنس و فلسفہ اطالیہ میں پھیل سکے۔

1877 میں سرسید احمد خاں نے اوکسفرڈ کے نمونے پر (جہاں سے طلبا چھ سو سال قبل بغرض اعلیٰ تعلیم اندلس جایا کرتے تھے) ایم اے او کالج قائم کیا تا کہ مغربی سائنس و فلسفہ ہندی مسلمانوں میں پھیل سکے، انگلش لینگویج اینڈ لٹریچر کے نمونے پر سلیس اُردو، اور "نیچرل" شاعری، توہمات اور بدعتوں میں مبتلا قوم کے لیے اسلام کی نئی سائنٹیفک توجیہہ اور نئی مسلم مڈل کلاس کے لیے اخلاقی و اصلاحی "ناول" "آرٹیکل" اور "ایسے" (لفظ "شارٹ اسٹوری" ابھی مستعمل

نہ ہوا تھا۔)

اب مرزا غالب کی عظمت یہ ہے کہ انگریزی سے نابلد ہوتے ہوئے بھی وہ ہمارے پہلے Modern man ہیں اور سرسید ہمارے Renaissance man، مصلح، صحافی، ادیب، عالم دین، انسان دوست کرم یوگی۔

جب سلطنت اٹھارھویں صدی میں ازدتی تا پالم رہ گئی تھی پایۂ تخت سے اسّی میل دور شہر کول کے نزدیک روہیلہ سرداروں نے ایک قلعہ بنوا کر نام اس کا علی گڑھ رکھا تھا امید تھی کہ مولا خیبر شکنؑ کے نام کی برکت سے سکھ، فرنگی، مرہٹے سب بھاگ جائیں گے۔ لیکن مشیت ایزدی یہ تھی کہ اسی علی گڑھ پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا۔ اور اپنی فوج تعینات کی۔ بے چارے سودا نوحہ زن رہے کہ جو ایک شخص تھا بائیس صوبوں کا خاوند رہی نہ اس کے تصرف میں فوج داری کول۔

مرہٹہ لشکر کے فرانسیسی جنرل پیرون اور اس کے فرنچ افسروں کے لیے قلعے سے میل بھر دور پرتگالی کولونیل وضع کے چھپر پوش بنگلے بنوائے گئے۔ ان صاحب لوگوں کا رہائشی علاقہ صاحب باغ کہلایا۔ کول یا علی گڑھ غدر سے بہت قبل برطانوی عمل داری میں شامل ہوا۔ وہ چھپر پوش بنگلے 1875 عیسوی میں سرکار نے سرسید کو مدرسۃ العلوم کے اسٹاف کے لیے عنایت کیے۔ اس سابقہ چھاؤنی کی "کچی" اور "پکی" بارکیں طلبا کے ہوسٹلوں میں تبدیل کی گئیں۔ مسلمان مفلس اور نادار قوم تھی۔ یہ سارا انتظام بہت غریبانہ اور Heart breaking تھا۔ سرسید کی اَن تھک کوششیں اور بے پناہ لگن ان کے بے حد سویٹ اور Endearing شخصیت کی نمائندگی کرتی تھیں۔

اب سرسید کے بنوائے ہوئے انگریز امپیریلسٹ پروفیسر سولاٹو پیاں اوڑھ کر نئی نویلی سوئیز (جو ایک فرانسیسی سامراجی انجینئر خدیو مصر کو لاکھوں پاؤنڈ کا دھوکا دے کر 1869 عیسوی جاری کر چکا تھا) کے راستے نیٹو محمڈن لڑکوں کو پڑھانے علی گڑھ پہنچے۔ ان سے پہلے بھی ہندستان میں انگریز استادوں اور مشنریوں کی ریل پیل تھی۔ پوری ہندستانی قوم بپتسمہ حاصل کر لے گی اس امید سے تو وہ دستبردار ہو چکے تھے مگر غلامی کا بپتسمہ کہیں زیادہ اہم تھا۔ سارا پر اسرار مشرق غلاموں کی بڑی منڈی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ترکی آزاد تھا۔ گو وہ اسے بھی تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ اور اس میں کامیاب ہو رہے تھے۔ ''پراسرار مشرق'' یورپین رومانیت کا ایک اہم عنصر تھا۔ اواخر اٹھارھویں صدی میں لوگ باگ ''اسپننگ جینی'' سے گھبرا کر وینس کے متلاشی ہوئے تھے۔ اور ہنٹ آرکیڈیا کے پڑوس ہی میں آباد تھا۔ Near east یعنی ''مشرقِ قریب'' برطانوی کولونیل آفس کی اصطلاح تھی جو سلطنت ترکی کے لیے استعمال کی جاتی تھی (اس میں یونان بھی شامل تھا۔) ترکی مشرقی رومان کا ایک سمبل تھا۔ سلطان، حرم سرا، پاشا، خواجہ سرا، کنیزیں۔

''اوٹومن'' اور ''دیوان'' فرنیچر میں شامل ہو چکے تھے۔ لیکن ترکی اہلِ یورپ کے لیے جور و استبداد و پسماندگی اور انحطاط کا دوسرا بھی نام تھا۔

''ترک'' اور ''ظالم'' ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ یہ گہرا تعصب صلیبی جنگوں کے زمانے سے اس اسٹریوٹائپ کا خالق تھا۔

تعصب کا عالم یہ تھا کہ مغربی کتابوں میں ہسپانیہ کی تاریخ ہمیشہ مسیحی فتح غرناطہ سے شروع کی جاتی تھی۔

انگریز سارے ایشیائیوں سارے مسلمانوں کو وحشی اور کم تر سمجھتا تھا۔ اب دیکھیے کہ سرسید کس شدید جذباتی اور ذہنی کشمکش سے دوچار رہے ہوں گے۔ وہی انگریز جس کے وہ اتنے مداح ہیں وہ اُٹھتے بیٹھتے ہندستانیوں کی تحقیر کرتا ہے۔ انگریز مشنری اور مورخ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف زہر افشانی میں مصروف ہے۔ سرسید لندن سے اپنے گھر خط لکھتے ہیں میرے برتن فروخت کر کے روپیہ بھیجو تا کہ لندن میں مزید قیام کر کے ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھ سکوں۔

اس وقت ساری دُنیا میں محض ایک مسلم قوم باقی رہ گئی ہے۔ سربلند آزاد۔ ایک وسیع سلطنت کی مالک۔ جو پانچ سو سال سے ان کمینی گوری اقوام پر حکومت کر رہی ہے۔ عثمانی ترک!

چناں چہ سرسید کے سامنے اب دو آئیڈیل ہیں۔ برطانیہ اور ترکی۔

اب سنئے کہ انگریز بھی ایک ہی کائیاں۔ اپنے سب سے خوفناک حریف زار شاہی روس کے خلاف جنگ کریمیا (1856ء) میں ترکی انگلستان کا حلیف کیا بنا انگریزوں نے عارضی طور پر

ترکوں کو فوراً ہیرو مان لیا۔ لندن میں کچھ دنوں کے لیے ترکی ٹوپی اوڑھنے کا فیشن چل پڑا۔ پھر خلافت کا قصہ شروع ہوا جس کے نتائج دور رس تھے۔

یورپ میں خلیفہ[2] ترکی کو پوپ کا مماثل سمجھا جاتا تھا۔ اسی مماثلت کا سہارا لے کر اُنیسویں صدی میں ترکیہ کی گرتی ہوئی ساکھ بڑھانے کے لیے سلاطین نے اپنے آپ کو خلیفہ کہلوانا شروع کیا۔

سلطان عبدالمجید ثانی (1875-1909 عیسوی) نے اپنی خلافت کے پرچار کے لیے اپنے نمائندے مصر، تیونس، ہندستان، انڈونیزیا اور چین روانہ کیے اس زمانے میں ترکی پھر روس سے نبرد آزما ہوا۔ زار شاہی سلطنت سرحد افغانستان تک پھیل چکی تھی۔ برطانوی ہند روسی ریچھ کی زد میں تھا۔ ترکی اور ایران کے مقابلے میں سینٹ پیٹرز برگ کی متواتر اور زبردست فتوحات نے برطانیہ کو متوحش کر رکھا تھا۔ ادھر 1857 عیسوی کے بعد سے اسلامیانِ ہند انگریز سرکار کے شدید مخالف تھے۔ اب ان کو روس سے متنفر کر کے خود کو ان کا ہمدرد اور خیر خواہ ثابت کرنے کے پروجیکٹ پر برطانیہ نے عمل شروع کیا۔ منطق یہ تھی: روس ترکی کا روایتی دشمن ہے۔ ترکی مسلمان سلطنت ہے۔ برطانیہ اس کا حلیف ہے۔ لہٰذا برطانیہ مسلمانوں کا دوست ہے۔

اب وائٹ ہال نے سلطانِ ترکی کو ہندی مسلمانوں کا خلیفہ بنانے کا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ یہ انگریز کی لاجواب حکمت عملی کی ایک کرامت تھی۔ مسلمان جو 1857 عیسوی سے کوئن وکٹوریہ کی دنیاوی رعایا تھے، سلطانِ ترکی کی روحانی رعیت بنا دیے گئے۔ ہندی مسلمان بے حد خوش ہوا۔ اپنا مغل بادشاہ معزول ہوا تو کیا غم ہے۔ اپنا سلطانِ اعظم، خادمِ حرمین، نائب الرسولؐ، جنت کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں، قسطنطنیہ میں موجود ہے۔

1875 عیسوی کی جنگ روس و ترکی نے اسلامیانِ ہند کو نئے ہیرو عطا کیے۔ سرشار نے اس جنگ میں اپنے ہیرو آزاد کو روسیوں کے خلاف لڑنے بھیجا۔

''معارف'' جنوری 1900 عیسوی میں حاجی اسماعیل خاں کا ایک مضمون شایع ہوا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان ترکی کو اسلامیان ہند کا خلیفہ مقرر کرنے کی برطانوی پالیسی ذرا

Boomerang کر گئی کیوں کہ اب ترکی سے جذباتی وابستگی کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں غالباً پان اسلام ازم اور قومی آزادی کے خیالات پیدا ہونے لگے تھے۔ چناں چہ شاید ایم اے او کالج کے انگریز پرنسپل کی ایما پر حاجی صاحب لکھتے ہیں کہ مسلمان ہلال اور تارا اپنا سمبل نہ بنائیں۔ یہ ترکوں کا سمبل ہے۔ ''ہم کو حضور ملکۂ معظمہ قیصرۂ ہند کی فرمانبرداری اور اطاعت صادقہ کرنا چاہیے۔ بارہا یہ بحث کی جا چکی ہے کہ سلطان خلیفہ ہیں یا نہیں۔ اگر سلطان خود اپنے ملک کے دینی رہنما ہوتے تو ان کو شیخ الاسلام کے عہدے کی کیا ضرورت تھی۔ اور ان مسلمانوں کو جو اُن کی رعیت نہیں ہیں ان کی اطاعت قطعی لازم نہیں۔''

اس کے باوجود غلام ہندی مسلمانوں کے لیے ترکی نفسیاتی طور پر کس قدر اہم ہو چکا تھا اس کا اندازہ اس دلدوز واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ 1892 عیسوی میں شبلی مصر جانے والے جہاز پر سوار ہیں، کیبن میں ایک گورا ہم سفر ہے ہر مرتبہ اوپر کی برتھ سے چھلانگ لگتے ہوئے وہ ان کو دانستہ ٹھوکر لگاتا ہوا نیچے اترتا ہے۔ بے چارے سولانا دم بخود۔ اس بے عزتی کا انتقام یوں لیتے ہیں کہ استنبول پہنچ کر ایک راہ چلتے یورپین کو دھکا دے دیتے ہیں۔

لہٰذا علی گڑھ کے صاحب باغ میں مقیم سرسید کو اوکسفرڈ کے علاوہ استنبول سے بھی ٹھنڈی ہوائیں آتی محسوس ہوئیں۔

نومبر 1894 کے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں کالج کے مجوزہ یونیفارم کا اعلان ''ڈارک بلو ٹرکش کوٹ[3] کالر پر مدرسۃ العلوم کا ڑھا جائے گا۔ ترکی یا رومی ٹوپی۔''[4]

رومی ٹوپی لندن میں بنائی جا رہی تھی۔ ترک طلبا پیرس جاتے تھے اور ہندی مسلمان طلبا قرض لے لے کر لندن جا رہے تھے۔ بنگالی بابو انگریز کا نقال تھا اور ترک ادیب مغربی اسالیب اختیار کر رہے تھے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ مغربی یورپ کے نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لیے استنبول آیا کرتے جس طرح عہد وسطیٰ کے مغربی یورپین اعلیٰ تعلیم کے لیے قرطبہ جاتے تھے؟ اُنیسویں صدی کے یورپین ادب نے ترکی اسالیب کیوں نہ اختیار کیے؟ ساری اُپج، اجتہاد، نئی تحریکیں، جدید رجحانات یورپ ہی میں کیوں شروع ہوئے؟ اس کا جواب میں پہلے دے چکی ہوں۔

ترکی زبان اور طرزِ معاشرت مشرقی یورپ پر اثر انداز ہوئی مگر چھ سو سال تک بہ طور حکمراں قوم ترک یورپین دھارے میں شامل نہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو ایک بے حد برتر نسل و قوم سمجھا کیے۔ تحریک اصلاحِ دین کے پرآشوب اور انقلاب آفریں دور میں سیاسی حکمت عملی کے طور پر ترکوں نے پروٹسٹنٹوں کی حمایت کی مگر خود اپنے معاشرے میں اس قسم کی ریفارمیشن کی ضرورت نہ سمجھی اور یورپین احیائے علوم سے بے نیاز اور بے پرواہ اپنی ملٹری سوسائٹی میں اپنی بری اور بحری طاقت کے زور پر بزعم خود محفوظ بیٹھے رہے۔

وہ تقدیر پرستی اور روایت پسندی جو زوالِ بغداد کے بعد سے عالم اسلام کی خصوصیت اور مہلک ترین کمزوری بن چکی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترک جواب تک یورپ کے طاقتور ترین بحری بیڑے کے مالک تھے بادبان پھڑپھڑایا کیے اور دُخانی جہاز رانی ہرگز اختیار نہ کی اور اپنے پیش رو عربوں اور ہم عصر ہندستانی مغلوں کی طرح فوجی اور تجارتی بحری راستوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ 1664 عیسوی میں لپانٹو کی بحری جنگ میں شکستِ فاش کے بعد سے دولت عثمانیہ کا شیرازہ تیزی سے بکھرنے لگا۔

عہدِ سرسید میں وہ باقی یورپ کے مقابلے میں پس ماندہ[5] لیکن ہندی مسلمانوں کے مقابلے میں بدرجہا ترقی یافتہ اور نسلاً نیم یورپین قوم تھے جو روس کے پیٹر اعظم کی طرح (گو اس کے سو سال بعد) یہ نکتہ پہچان گئے کہ بقا اب تقلیدِ مغرب ہی میں مضمر ہے۔

1803 عیسوی میں ترک طلبا بغرض اعلیٰ تعلیم مغربی یورپ بھیجے گئے۔ اسی سال یعنی 1803 عیسوی میں شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنے فتوے کے ذریعے انگریزوں کے خلاف ہندستان کو دارالحرب قرار دیا۔ دولت مند مسلمان بٹیر بازی میں مصروف رہے۔ مفلس مجاہدین نے فرنگی کے خلاف ہتھیار باندھے۔ مغربی تعلیم کون حاصل کرتا۔ اگر جبھی سے پڑھ لکھ لیے ہوتے تو 1857 عیسوی میں اس بری طرح نہ ہارتے۔ ممکن ہے جیت ہی جاتے یا کم از کم سیروں زیور پہن کر انگریز سے لڑنے نہ جاتے۔

ترکی میں سلطان محمود ثانی کے عہد (1808 عیسوی) سے بہت تبدیلیاں ہوئیں۔ فرانسیسی

قوانین اپنائے گئے۔ پریس مقبول ہوا۔ یورپین زبانوں خصوصاً فرنچ سے ترجمے کیے گئے۔

جیسا پہلے کہا جا چکا ہے ترک نسلاً ایک نیم مغربی[6] قوم تھے۔ بلقانی صوبوں کی آبادی کا بڑا حصہ اہلِ اسلام پر مشتمل تھا۔ مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاحِ دین سے متاثر ہو کر بے شمار بلقانی کیتھولک پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کرنے کے بجائے مسلمان ہو گئے تھے۔

اٹھارھویں صدی سے بابِ عالی کے سرکاری افسروں یعنی قلمی اور آفندی طبقے نے یورپین طرزِ معاشرت اختیار کیا۔

سلطان سلیم (1884-1806) کی بہن خدیجہ سلطان (کوسم سلطان) نے تعلیمِ نسواں کا بیڑا اٹھایا۔ اونچے طبقے کی لڑکیوں نے فرانسیسی تعلیم حاصل کی۔ ترک خواتین سلاطین (اصلاحات) کے دور میں نئے ترک ادیبوں نے ادب اور شاعری[7] کی فرسودگی کے خلاف جہاد شروع کیا۔ آزادی جمہوریت، حریت اور آئینی حکومت پیرس کے تعلیم یافتہ اُن نئے ترک ادیبوں کا نعرہ تھا۔

نامق کمال (1840-1880 عیسوی) ابراہیم شناسی (1826-1871 عیسوی) ضیا پاشا (1825-1880 عیسوی) سرسید احمد خان معاصرین تھے۔ انھوں نے مغربی فارم اختیار کیے اور ترکی زبان کو اس قابل بنایا کہ وہ جدید خیالات کا اظہار کر سکے (یہی کارنامہ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اردو کے لیے انجام دیا)

یورپ میں اس وقت رومانیت کا چرچا تھا۔ چناں چہ جدید ترک ادیبوں نے رومانی اسالیب کی پیروی کی۔

یہ رومانیت جس کا بہت غلغلہ اُردو میں بھی ہوا آخر تھی کیا بلا؟ حسن و عشق؟ گل و بلبل؟ یہ تو ہمارے اپنے فارسی ترکی اُردو ادب میں پہلے ہی سے بافراط موجود تھا۔ اسے مغرب سے درآمد کیوں کیا گیا؟

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا راست اثر ان کے ادب پر پڑتا ہے۔

زوالِ غرناطہ کے بعد سے یورپ میں فرزندانِ تثلیث کا بول بالا ہوا۔ یورپین اور انگریزی ادبیات کی مفصل تواریخ مغرب کے تہذیبی اور نسلی فوقیت کے نظریے سے لکھی گئیں۔ لہٰذا اس عرب قصہ معراج نبویؐ کا ذکر مفقود جسے عین ممکن ہے کہ طربیہ خداوندی رقم کرنے سے پہلے بھائی دانتے نے پڑھا ہو۔ اندلسی مسلم کوچہ گرد مطرب، کسی بلند مرتبت مسلم اندلسی حسینہ سے پاکیزہ محبت کا دم بھرنے والے اور اس کی موجودگی میں ایک دوسرے سے ٹورنامنٹ لڑنے والے مسلم اندلسی نائٹ، جھروکے میں کھڑی حسینہ اور بالکنی کے نیچے ساز پر عشقیہ غزلیں گاتا جانباز عاشق، یہ خالص مسلم اندلسی روایات تھیں۔ جن کو مسیحی ہسپانیہ نے ترکے میں حاصل کیا۔ یہ Cult of Love بھی اندلس کی دین تھی۔ مگر یہ ساری رومینٹک ایجری مسیحی اسپین کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے!

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال!

اور ان کوچہ گرد اندلسی مطربوں کے نغمے براہِ جنوبی فرانس سارے یورپ میں پھیل کر اس ''رومانیت'' کا ایک سرچشمہ بنے جو وسط اٹھارھویں صدی سے مغربی ادب کے ایک دبستان کی صورت میں نمودار ہوئی۔ دسویں گیارہویں صدی عیسوی کے عرب اندلسی قصائد جدید یورپین شاعری کے باوا آدم ہیں ان کا تذکرہ بھی مغرب میں شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے۔

وجہ ظاہر ہے۔ مسلمان سیاسی و تہذیبی لحاظ سے مغروب ہو چکے تھے۔ لہٰذا ان کے کارناموں کو بھی فراموش کر دیا گیا۔ محض ایک مثال کافی ہے سب سے پہلے تاریخ کا جدلیاتی تصور ابنِ خلدون نے پیش کیا۔ ابنِ خلدون سے مغرب میں کتنے اہلِ دانش واقف ہیں؟

عام طور پر عہد وسطیٰ کے متعلق انگریز مصنف ہوریس وال پول کے ناول ''کاسل آف اڈمرانٹو'' (1764 عیسوی) کو رومانی تحریک کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ یورپ اور انگلستان کے ادیب اپنی اٹھارویں صدی کی نوکلاسیکیت اور خشک عقلیت پسندی سے بور ہو چلے تھے۔ فرانس میں انقلاب آیا۔ آزادی، مساوات، حریت، فرد کی اہمیت، جمہوریت، رومانی ادیبوں کو متاثر و مسحور کرنے کے لیے کچھ کم محرکات تھے۔

سماجی منظر تیزی سے بدل رہا تھا۔ کارخانے کھلے۔ فضا آلودہ ہوئی۔ گاؤں اُجڑے۔ صنعتی شہر اور سلم آباد ہوئے۔ زندگی پیچیدہ ہوتی گئی۔ دھوئیں اور کارخانوں سے گھرے لوگوں کو فطرت اچانک بہت دل فریب معلوم ہوئی۔ پرانے سادہ صاف ستھرے دنوں کا نوسٹلجیا بڑھا۔ یعنی ہیلیڈ اور اس کے سرچشمے کی تلاش۔ آزادی افکار کے نتیجے میں نت نئے ادبی تجربے مشرق کا فسوں۔ سنہرے ماضی کی بازیافت۔ (اس ماضی میں ''بلیک ڈیتھ'' اور بھیانک جنگیں تھیں، یہ سب رومان پرست کہاں دیکھتا ہے۔) آزادی تخیل، وجدان، تحیر، رمزیت، شدت احساس، تعقل کے بجائے وفور جذبات، رومانیت کی اساس تھی۔ گوئٹے نے کہا کلاسکیت فرزانگی ہے اور رومانیت دیوانگی لیکن یہ دیوانگی ادب کو بہت راس آئی کیونکہ اس نے ان گنت دریچے وا کیے۔ بہت سے دفینے کھود نکالے۔ جرمنی رومان اور موسیقی کا گڑھ تھا۔ ٹیوٹن اساطیر، پرتن سورمائی، پریوں کی کہانیاں، گھنے جنگلوں میں چھپے میڈیول قلعے رومانیت کی اوّلین لہر وہیں پیدا ہوئی۔ اوائل اُنیسویں صدی میں ہوف مین نے اسرار و دہشت کی کہانیاں لکھیں گرم برادران نے پریوں کے جرمن قصے اور لوک کہانیاں جمع کیں۔ ذہنی سطح پر جرمن مابعد الطبیعات اور رومینٹک فلسفے، جیک بوہیم کے تصوّف، جرمن گوتھک پر اسراریت اور دہشت، کرب اور اُداسی (جس نے آگے چل کر مصوّری میں اظہاریت Expressions کی صورت اختیار کی) رومانی تحریک جرمنی کی دین تھیں۔ انگلستان میں سر والٹر اسکاٹ، کیٹس، شیلے، بائرن، جرمنی میں شلر، فرانس میں روسو، شاطو بریان، ڈیوما کبیر اور وکٹر ہیوگو رومانیت کے علمبردار تھے۔ شوپاں، شومیں، واگنر نے رومانی موسیقی کمپوز کی۔ انگلستان میں کانسٹبل وغیرہ رومانی مصوّر کہلائے۔ لارڈ بائرن مجسم رومینٹک ہیرو تھے۔ وہ ترکی کے خلاف یونان کی جنگِ آزادی میں شرکت کے لیے گئے۔ ترکی عمامہ اور قبا پہنے اور خنجر پٹکے میں اُڑسے، جارج گورڈن لارڈ بائرن ترکی ٹوپیاں اور شلواریں پہنوانے والی یونانی قوم کو آزاد کرانے کے لیے اس وقت جزائر یونان پہنچے جب عین اسی زمانے میں ان کے ہم وطن ہندستان کو غلامی کے شکنجے میں کسنے میں مصروف تھے۔ لیکن سارا برطانیہ پرستارِ آزادی لارڈ بائرن کے گن گا رہا تھا!

یونان چار سو سال تک ترکی کے زیر نگیں رہا۔ ایک سولھویں صدی کا یونانی بیلیڈ لوگ گاتے تھے، ''میں چار دن کا دولہا تھا جب ترکوں نے مجھے قید کیا۔ میں دس سال باربری میں رہا میں نے اخروٹ کے دس درخت لگا کر قید میں ان کے پھل کھائے مگر آزادی نہ ملی۔'' جزیرۂ کریٹ کے ایک پادری کی لڑکی کے متعلق بیلیڈ تھا، ''مجھے ترک ملاح اُڑا کر لے گئے۔ اب میں قیمتی قالینوں پر سوتی ہوں اور طلائی کرسی پر بیٹھ کر زرتار رومال سے اپنے آنسو پونچھتی ہوں۔''

ہندستان میں فرنگی کے خلاف جو عوامی گیت بنے انھیں یورپ کیوں پہنچاتا۔

برطانوی فاتحین ہند بھی انگلستان میں رومینٹک ہیرو تصور کیے جا رہے تھے۔ امپریل ترک اپنے آپ کو ایک نہایت اعلیٰ وارفع اور اپنی محکوم اقوام سے برتر قوم سمجھتے تھے۔ یہی رویہ اب امپیریل برطانیہ اور زار شاہی روس نے اپنی مشرقی رعایا کے لیے اختیار کیا۔ ایک وکٹورین تاریخ عالم میرے پاس موجود ہے جو شاید ایم، اے او کالج کے نصاب میں بھی شامل تھی اس میں مرقوم ہے کہ 480 ق۔م کی جنگ ایران و یونان کی شکست نے ہمیشہ کے لیے ثابت کر دیا کہ یورپ ایشیا سے برتر ہے اور ہمیشہ برتر رہے گا!

چناں چہ مشرق کمزور تھا اور ایکزوٹک۔ گوئٹے اور پشکن اور مستشرقین کی ادبی و علمی دلچسپی کے علاوہ عام مغربی پبلک کے لیے قبلا خاں (کولرج) لالہ رخ (طامس مُور) سہراب و رستم (متھیو آرنلڈ) رباعیات (فٹز جیرلڈ) الف لیلیٰ (سر رچرڈ برٹن) لوعیناں (وکٹر ہیوگو) وغیرہ وغیرہ نے مشرق کی طرف طلسمی دریچے وا کیے۔

رومانی آزاد خیالی کے پہلو بہ پہلو وکٹورین خود پرستی اور Smugness بھی بڑھی۔ ناول نے اس عہد کی خاص ادبی صنف کی حیثیت اختیار کی۔ مقبول و ضخیم وکٹورین ناول برطانوی امپریل خود اعتمادی، غرور اور احساس استحکام کا آئینہ دار تھا۔ وکٹورین ازم روس و امریکہ سے لے کر آسٹریلیا تک پورے عہد کا مزاج بن چکی تھی۔ اور اب اس سے انحراف بھی قدرتی بات تھی۔ لوئیس کیرل کا ''ایلس ان ونڈر لینڈ'' (1856ء) انگریزی زبان کے اوّلین علامتی ناولوں میں شامل ہے۔ معاشرے کی بے انصافیوں اور حکمراں طبقے کی بے حسی نے اہل دانش کو نالاں

کیا۔فرانس میں بودلیئر اپنے در یچے کے باہر تجارتی اشتہاروں کے بورڈ دیکھ دیکھ کر عاجز آ گیا۔ ریمبو کو دنیا "بینوں سے پر" نظر آئی۔

آئرلینڈ پر برطانوی تسلط اور آئرش افلاس کے خلاف ایٹس نے آواز بلند کی۔اس نے 1885 عیسوی کے لگ بھگ شاعری شروع کی۔اسی زمانے میں فرانس اور انگلستان میں رومانیت کی دوسری لہر پھیل رہی تھی۔آئرش قوم پرستی کے تحت اپنی نسلی اور قومی Myth کی بازیافت کے علاوہ ایٹس نے آرکیڈین اور ہندو موضوع تلاش کیے۔اور ہندستان کے نوجوان رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کی ہم نوائی کی۔ٹیگور اسی نوع کی قوم پرست بنگالی رومانیت کا اجرا کر رہے تھے۔

انگلستان میں چھ شلنگ کی قیمت والے ناولوں کی اشاعت کی وجہ سے ناول نگاری گویا قومی مشغلہ بنتا جا رہا تھا۔فتح میسور اور 1857 عیسوی کے متعلق ایسے ناولوں کا سیلاب آ گیا تھا جس میں برطانوی مرد اور عورتیں ہیرو تھے اور ہندستانی بالخصوص "محمڈن نیٹو" ولین!1857 عیسوی بھی ایمپائر کی رومینٹک Myth میں شامل ہو چکا تھا۔کرنل میڈوز ٹیلر، فلورا اپنی اسٹیل، ماڈ ڈائیر اور کپلنگ کے ناول ایمپائر کی اس Mystique کے ترجمان تھے۔

اُردو میں سراج الدولہ یا ٹیپو یا حافظ رحمت خاں یا نواب حضرت محل یا بہادر شاہ ظفر کے متعلق ناول لکھنے کی کس میں ہمت تھی۔چناں چہ شرر نے ایسے اسلامی تاریخی ناول لکھے جن کا اپنے عہد کی تاریخ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

رومینٹک آئیڈیلزم قومی احیا کا ایک لازمی عنصر ہے۔کولونیل مشرق میں یہ رومانیت آئرش نیشنلزم کی طرح قوم پرستی محرکات میں شامل ہوئی۔

لیکن ادب میں بھی ہندو اور مسلم احیا کا باہم تصادم ناگزیر تھا۔چناں چہ ایک طرف شرر کے ناول تھے دوسری طرف بنکم چندر چٹرجی کا آنند مٹھ جو بنگالی قوم پرستوں کی بائبل بنا مسلمان اس سے اتنے ہی خفا ہوئے۔[9]

سرکار انگلیشیہ سے وفاداری کی صورت حال یہ تھی کہ سرشار کے ہیرو آزاد پاشا ترکوں کی حمایت میں روسیوں سے لڑ کر آتے ہیں تو بہ طور ایک "لائل" جانباز افغانوں سے لڑنے چل دیتے

ہیں۔ آنند مٹھ کے خالق بنگال میں ڈپٹی مجسٹریٹ کا عہدہ سنبھالے رہے۔

اسی دور میں محمد حسین آزاد، شرر، ریاض خیر آبادی اور میر ناصر علی نے رنگین نثر اور تخیلی انشا پردازی کو فروغ دیا۔

سرسید احمد خاں نے ''اسباب سرکشی بجنور'' اپنے نقطۂ نظر سے بیان کیے تھے یہ ان ''باغی'' زمین داروں اور فوجی سرداروں کا نقطۂ نظر نہیں تھا جنھوں نے انگریز کے خلاف جنگ کی تھی۔ اسی سرکشی کی سزا میں ضلع بجنور کی زمین دار اشرافیہ جو 1858 میں بے دخل[10] کی گئی تھی اس کے ایک گھرانے کے چند بچے 1892 عیسوی میں سید کے مدرسے بھیجے گئے۔ ان چار بھائیوں میں نمبر 2 بھائی سجاد حیدر نے اپنی قابلیت کی وجہ سے کالج میں بہت نام پایا۔ ان کے منجھلے بھائی سید نصیر الدین حیدر بھی امتحانوں میں فرسٹ آئے۔ گویا سرسید کے اس نصب العین پر بھی پورے اترے کہ کالج سے نکل کر ہندو بنگالیوں اور کایستھوں کی طرح اچھی سرکاری ملازمتیں حاصل کر سکیں۔

سرسید نے کالج کے لیے علی گڑھ اس وجہ سے بھی منتخب کیا تھا کہ اس ضلع اور اس اطراف میں مسلمان اور راجپوت جاگیردار (جو غدر میں انگریزوں کے وفادار رہے تھے) بہت بڑی تعداد میں بستے تھے۔ یہ وفادار مسلم اشرافیہ کالج کی پشت پناہی کر سکتا تھا۔

حاجی اسماعیل خاں شیروانی رئیس وتعلقہ دار بھی انھی رؤسا میں سے تھے۔ لیکن والد ہجرت کر کے ٹرکش عربیہ چلے گئے تھے جہاں حاجی صاحب نے ترکی سیکھی تھی۔ حاجی صاحب مصنف اور ادیب بھی تھے۔ موڈرن روشن خیال اور ترکی کے دلدادہ بہت صاحب آدمی تھے۔ سوٹ بوٹ پہنتے تھے مگر انگریزی سے ناواقف تھے۔ سجاد حیدر اس وقت پروفیسر آرنلڈ اور شبلی[11] دونوں کے نامور ترین شاگرد تھے۔ 98-1897 عیسوی میں حاجی اسماعیل خاں نے نوعمر سجاد حیدر سے انگریزی پڑھی۔ بدلے میں ان کو ترکی پڑھائی۔ اور اپنا لٹریری اسسٹنٹ مقرر کیا[12]۔ حاجی صاحب سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ تھے۔ اس طرح سال بھر تک سجاد حیدر سرسید کے ''اندرونی حلقے'' کے قریب رہے۔

مولانا شبلی نعمانی 1892 عیسوی میں بلادِ عثمانیہ کی سیاحت کر آئے تھے اور ترکی اخباروں اور رسالوں بالخصوص معارف کے اعلیٰ معیار سے بے حد متاثر ہو کر لوٹے تھے۔

1898 عیسوی میں حاجی اسماعیل خاں اور مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے علی گڑھ سے رسالہ معارف کا اجرا کیا۔ اس کے اوّلین صفحے پر لکھا گیا ''معارف ایک ماہوار رسالہ ہے جو بلادِ عثمانیہ کے نامور ترکی رسالوں کے نمونے پر ہر مہینے کی آخری تاریخ کو علی گڑھ سے شائع ہوتا ہے اس میں علمی، فلسفی، مذہبی، ملکی، تمدنی، تاریخی اور ادبی مضامین لکھے جاتے ہیں اور مشرقی طرز کی عمدہ اور پاکیزہ نظمیں درج کی جاتی ہیں۔''

زور ''پاکیزہ'' اور ''نظموں'' پر تھا۔

اشتہار: ''معارف شمالی ہند میں اعلیٰ درجے کا لٹریری رسالہ ہے جو زیادہ تر اُونچی سوسائٹی کے ہائی ایجوکیٹیڈ مسلمانوں کے ہاتھوں میں جاتا ہے اور اسی گروہ کے مضامین چھاپتا ہے۔''

واضح ہو کہ جاگیردار طبقے کے وہ روشن خیال افراد جو سرسید کے معاون بن چکے تھے اور نئی ملازمت پیشہ مڈل کلاس اور ''اونچی سوسائٹی کے ہائی ایجوکیٹیڈ مسلمان'' اب ہندی مسلم معاشرے کی قیادت کر رہے تھے اور ایک Elitist ادب تخلیق کرنے میں مصروف تھے۔

انگلستان میں یہ رومانیت کی دوسری لہر اور Gay Nineties کا رنگین اور ولولہ خیز زمانہ تھا۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ رومانیت کی دوسری لہر صدی کے عشرۂ ششم انگلستان میں وکٹورین اخلاقیات اور Smugness کے ردِّعمل کے طور پر نمودار ہو چکی تھی۔ رومانیت سیاسی لبرل ازم اور اشتراکیت کی ہمنوا تھی۔

''بورژوا بے حسی سے نفرت کرنے والے تخلیقی فن کار کی مڈل کلاس سوسائٹی سے بغاوت'' اس عہد کی خصوصیت بنی۔ فن برائے فن کے نظریے کے پیرو والٹر پیٹر، روزیٹی۔

اوسکر وایلڈ جمال پرستی کے نقیب تھے۔ 1880 عیسوی کے بعد انگلستان کے جمال پرستوں پر فرانسیسی رمزیت پسندوں کا گہرا اثر پڑا۔ فرانس کے ان رمزیت پسند جمال پرستوں کو

بودلیئر جن کا بادا آدم تھا بورژوا نقادوں نے ''ڈیکیڈنٹ'' کا خطاب دیا تھا۔ وہ لوگ سماج کو چونکانا اور شوک پہچانا چاہتے تھے۔ کسی نے بودلیئر کو دیکھ کر کہا تھا، ''وہ بودلیئر صاحب جا رہے ہیں یقیناً یہ آج پلنگ کے اوپر سونے کے بجائے اس کے نیچے سوئیں گے تاکہ محض اس لیے کہ لوگ بھنیں۔'' زولا وغیرہ کی شدید حقیقت پسندی اور ہیروں بنی سے بغاوت کر کے فرانسیسی رمزنگار ملارمے، رامبو ورلیس وغیرہ شدید علائم پرستی، غنایت ''جذبات اور جبلوں کے پراسرار دھندلکے، علائم، یادوں اور تلازموں کے جنگل'' اور اندرون ذات کی بھول بھلیاں میں اتر گئے تھے۔ انگلستان میں بھی جمال پرستوں کے زیر اثر ادبی مزاج اور ذوق بالکل بدل گئے۔ رومانیت کی پہلی لہر نے رومینٹک ہیرو کا پیکر تراشا تھا۔

اب اوسکر وائیلڈ، جان رسکن وغیرہ کا ''آرٹسٹ فلسفی'' نیا ہیرو بنا۔ اوسکر وائیلڈ وغیرہ نے بھی ''ڈیکڈنٹ'' کے خطاب کو بخوشی قبول کیا۔ ولیم یارک ٹنڈل کا کہنا ہے کہ ''ان کے نزدیک ان کی شدید خوش پوشی اور خوش مذاقی ان کے اندرونی مکمل پن کی مظہر تھی۔'' اس طرح یہ لوگ عہد واجد علی شاہ کے خوش ذوق چھیلوں کی مانند محض نفاسیت جذبات، پرتکلف تمدن اور ادراک حسن کے لیے زندہ تھے۔ یہ نوجوان Prose-Fancy اور ''ارغوانی نثر'' اور تاثراتی تنقید لکھ رہے تھے اور شدت جذبات کے ساتھ احمریں لمحوں میں زندہ رہنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ ادب اور فیشن کے ''ڈینڈی'' کہلائے۔ ان کے رویے پر تکلف ''پوز''۔ چناں چہ ''پوزیئر'' اور ''ڈینڈی'' اصطلاحات رائج ہوئیں۔

ہندستان کے خوش حال تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ملبوسات کی حد تک یہ ڈینڈی پن اختیار کیا جس کی ایک جھلک ستیہ جیت رے کی فلم ''چارولتا'' اور ایم او کالج کے طلبا کے گروپ فوٹو گرافوں میں نظر آتی ہے۔

انگلستان کے جمال پرستوں کے یہ ارفع رویے پیٹ بھرے کی باتیں تھیں۔ اسی زمانے میں اینٹی رومینٹک برنارڈ شا نے سوشلزم اور ایچ جی ویلز نے اپنے سماجی خیالات کا پرچار کیا سڈنی ویب نے لندن کی ورکنگ کلاس کے متعلق تحقیقی کتابیں لکھیں۔ ادب اور فن کے لیے لفظ

''پروگریسیو'' استعمال کیا گیا۔ چنانچہ یہ ''زوال پرستی'' کے ساتھ ساتھ احیا کا پرجوش عہد بھی تھا۔ لفظ ''نیا'' پر بہت زور دیا جارہا تھا۔ ''نئی عورت'' ''نئی حقیقت نگاری'' ''نیا مزاح'' ''نیا ڈرامہ''۔ سیفٹی بائیسکل کی ایجاد اس نئے دور کا ایک اور سمبل تھی۔ (لہٰذا ایلدرم کا بائیسکل سوار قیصی) انگلستان میں ''نئی عورت'' بائیسکل چلا رہی تھی (چنانچہ پشاور چھاؤنی میں فوجی بنگلے کے صحن کے اندر مس نذر الباقر اور ان کی چھوٹی بہن بھی بائیسکل چلا رہی تھیں۔ اور صحبت ناجنس میں سلما کی لڑکیاں بھی بائیسکل سواری سیکھ رہی تھیں۔)

انگلستان میں یہ اختتام صدی یعنی ''فین دی سی اے کل'' ادب اور مصوری کا نشاۃ ثانیہ ثابت ہوا۔ سوئین برن، ہارڈی، فرائیڈ، ہیولاک ایلس، جارج میریڈتھ، کرسٹینا روزیٹی، ایڈمنڈ گوس، رابرٹ لوئی اسٹیونسن، رابرٹ برجز، جوزف کونریڈ اور جیروم کے جیروم خواص میں مقبول اور ماری کوریلی، سر آرتھر کانن ڈائل اور رائیڈر ہیگرڈ عوامی ناولسٹ تھے۔ اُردو میں رینالڈز کی طرح مؤخرالذکر ہی کے ترجمے کیے گئے۔ اسی زمانے میں کپلنگ اور دوسرے ادیبوں نے مختصر افسانے لکھے۔ اوائل اُنیسویں صدی میں رومانیت کی پہلی لہر نے ''کہانی'' کو جنم دیا تھا۔ جرمنی میں ہوف مین، گرم برادران اور ٹیک کے اسرار و دہشت فینٹسی اور پریوں کے قصے۔ پہلے پہل یہ صف محض Tales آرنیٹل یا اسکیچ کہلائی (ساٹھ ستر سال بعد اودھ پنچ اور دلگداز میں جو انشائیے چھپے وہ بھی اسی طرح افسانہ نما مضامین تھے) امریکہ مختصر افسانے کی اصل جنم بھومی ہے۔ واشنگٹن ارونگ کی ''اسکیچ بک'' 1820 عیسوی میں شایع ہوئی۔ 1832 عیسوی سے ایڈگر ایلن پو اور تھیوفیل ہاتھورن کے افسانے چھپنے لگے۔ ماہانہ رسالوں اور کرسمس کے تحفوں کے طور پر دی جانے والی کتابوں کی مانگ نے افسانہ نویسی مقبول کی۔ ہرمین ملول، موپساں، چیخوف، جیک لندن، او ہنری، برٹ ہارٹ، کپلنگ، اوسکر وایلڈ اور یلو بک کے دوسرے افسانہ نگاروں نے اس نئی صنف کو چار چاند لگائے۔ برطانوی جمال پرستوں کے رسالے یلو بک اور سوائے میں فرانسیسی رمزنگاروں کے تراجم شایع ہو رہے تھے۔ میرے پاس یلو بک کا ایک انتخاب موجود ہے جو 1949 عیسوی میں لندن سے چھپا تھا۔ اس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محض ''کاسنی نثر'' کے علاوہ اس گروپ

کے پاس اور بہت کچھ بھی تھا۔ نظمیں افسانے۔ انشائیے۔ طنز و مزاح۔ جدید خیالات، یہ بڑا Vibrant ادب تھا۔

ادھر میکس بیربھوم نے اپنی مضمون نگاری کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ مصوّری، موسیقی ادب تنقید ہر میدان میں برطانیہ کے نوجوان ادیب پیورٹین وکٹورین اقدار سے انحراف کر کے ایک دل پذیر انقلاب لا چکے تھے۔

ایم اے او کالج میں انگریزی کی تعلیم پر بہت زور دیا جا رہا تھا۔ 1876 عیسوی میں طے کیا گیا کہ مدرسۃ العلوم کے "پہلے درجے کی حیثیت بالفعل ایک ہائی اسکول کی ہوگی اس میں تعلیم انگریزی اس درجے سے کسی قدر زیادہ ہوگی جو یونیورسیٹی کے انٹرنس امتحان کے لیے مقرر تھے۔ جماعت میں پہلے یعنی دسویں درجے میں Southey's Life of Napoleon بائرن کا Prisoner of Chillon اور کولیرج کی "ہسٹری آف برٹش ایمپائر" پڑھائی جا رہی تھی۔ ایف اے اور بی اے کا معیار بھی اسی طرح بہت اونچا رہا ہوگا۔ انگریزی کے پروفیسر اور رومانیت کے دلدادہ طامس آرنلڈ کیالٹن لائبریری میں "نائنٹیتھ سنچری" کے علاوہ یلو بک اور سوائے بھی منگواتے ہوں گے؟

یلدرم کے ایک ہم سبق مشتاق احمد زاہدی کا بیان ہے کہ 1901 عیسوی میں کالج چھوڑنے کے بعد "ہم لوگوں کو اصلاحِ قوم اور طبقہ نسواں کی ترقی کے علاوہ اور کوئی فکر دامن گیر نہ تھی۔"

اُردو لٹریچر کی اصلاح بھی ریفارمیشن کے اس پروگرام میں شامل تھی۔ سرسید اور ان کے ساتھی ان نوجوانوں کو صبح شام "اصلاحِ قوم" پر لیکچر پلا چکے تھے اور علی گڑھ بہر حال "اصلاح و ترقی" کا دوسرا نام تھا۔ اُردو میں اس وقت بھانت بھانت کے ناولوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اصلاحی، معاشرتی، تاریخی، عاشقانہ، اچھے بنگالی اور بُرے انگریزی ناولوں کے تراجم۔

طوائفوں کے مجرے، پارسی تھیٹر اور عشقیہ ناول قوم کے ذرائع تفریح تھے۔ ترکی سے ہندی مسلمانوں کی بے پناہ دلچسپی کی بنا پر سلطنت عثمانیہ کے متعلق گھٹیا اور سنسنی خیز برطانوی ناولوں کے اُردو تراجم کا انبار لگ گیا۔ ''عمر پاشا فاتح کریمیا''[13] از رینالڈز وغیرہ وغیرہ۔ جنگ کریمیا (1856 عیسوی) کے وقت سے ''یورپ کا مرد بیمار'' اور ''ایسٹرن کوئسچن'' انگلستان میں بھی ایک گرما گرم موضوع تھا۔ ''سجاد حیدر متعلم بی اے کلاس'' معارف اکتوبر 1898 عیسوی میں اُردو ناول کی ناگفتہ حالت پر طویل مضمون لکھ چکے تھے۔ معارف اکتوبر 1900 عیسوی میں نئی کتابوں پر تبصرہ:

''ایک کتاب ہمارے پاس پہنچی ہے جس کے مصنف وہی رینالڈز[14] صاحب ہیں جن کے ناول اُردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ رینالڈز صاحب کے سوا انگلستان کے اور مصنفوں کے ناول بہت کم ترجمہ کیے گئے ہیں۔ رینالڈز صاحب ناول نویسی کے لحاظ سے ادنیٰ درجے پر ہیں۔ ان ناولوں کو شاذ و نادر ہی کوئی انگریز پڑھتا ہوگا۔ یورپ کے جن ناول نویسوں نے انسان کی سائیکولوجی کا غور سے مطالعہ کیا ہے وہ کبھی ایسے ناول نہ لکھتے۔ یہ اُردو زبان کی بدقسمتی ہے کہ اب تک عمدہ ناولوں کا اس میں ترجمہ نہیں ہوا۔''

ان برے ناولوں کے سیلاب کی روک تھام کے لیے معارف میں ہر ماہ ایک عدد ''پاکیزہ'' یعنی ترکی ناول بالاقساط پیش کیا گیا۔ دسمبر تا جنوری 1901 عیسوی ''بہشت شداد'' نام مترجم ندارد لیکن ترجمہ حاجی اسماعیل خان نے کیا تھا۔ دسمبر تا جنوری 1901 عیسوی ''مرقع سرکیشیا'' ترکی کے مقبول اور کثیر الاشاعت مصنف احمد مدحت کا ناول۔ نام مترجم ندارد مگر اسٹائل سو فیصدی سجاد حیدر کا۔ یعنی وہی جو اس کے اگلے سال چھپنے والے ''ثالث بالخیر''، ''زہرا'' اور ''مطلوب حسیناں'' میں ملتا ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد کا ارشاد ہے کہ ''اگر مولانا محمد حسین آزاد پہلے نہ پیدا ہو گئے ہوتے تو یلدرم یقیناً اُردو کے پہلے صاحب طرز انشا پرداز قرار دیے جاتے۔ مخزن کے اوّلین دور میں انھوں نے اپنے پارہ ہائے نثر پیش کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ میں انھیں عہد آفریں اس

لحاظ سے بھی کہتا ہوں کہ ان کی نمود کے ساتھ ہی ہماری ادبیات ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئیں جس کے برتے پر ہی ہم عورت سے دوچار ہوئے ہیں۔''

اواخر اُنیسویں صدی سے ''ایسے'' اور ''اسکیچ'' اُردو میں مقبول ہو چکے تھے۔ منشی سجاد حسین، منشی جوالا پرشاد برق، مرزا مچھو بیگ ظریف، نواب سید محمد آزاد اور علی محمود شمسی کے خاکوں نے مختصر افسانے کا بیج بو دیا تھا۔ اُردوئے معلیٰ 1903 عیسوی میں ''سلسلہ افسانہ ہائے مختصر و مکمل'' از ''شاہد'' ''حرماں نصیب'' از ''شاہد'' اور ''غریب الوطن'' از ''مانی'' موجود ہیں۔ نہ معلوم یہ کون صاحبان تھے۔

مخزن دسمبر 1903 عیسوی میں راشد الخیری (جو اس وقت تک ''منازل السائرہ'' لکھ چکے تھے) کا ''نصیر اور خدیجہ'' شایع ہوا جس میں دِلّی کی بیگماتی زبان میں خدیجہ اپنے بھائی نصیر سے ایک بے ساختہ سے خط کے ذریعے بھائی کی کنبے کی طرف سے لاپروائی کا گلہ شکوہ کرتی ہے۔ ''نصیر اور خدیجہ'' میں یقیناً مختصر افسانے کی جھلک موجود ہے۔

اب تک افسانہ ناول کے معنی میں استعمال کیا جا رہا تھا گو Short Story کا ترجمہ ''مختصر افسانہ'' کر لیا گیا تھا۔ بقول ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ یلدرم کی کہانیاں پہلی بار ''قصہ'' کے بجائے ''افسانہ'' کہلائیں۔[15]

ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں: ''اُردو مضمون نگاری کا یہ پہلو تعجب خیز ہے کہ ابتدا میں اس فن کو علی گڑھ تحریک کی منطقی اور کلاسیکی روح سے نقصان پہنچا۔ آگے چل کر اسی علی گڑھ کے نئے ماحول اور پُرمسرت زندگی اور رومان پرور فضاؤں[16] نے اسے بڑھنے اور پھولنے کا موقع دیا چنانچہ اُردو کا اوّلین اور غالباً عظیم ترین مضمون نگار بھی علی گڑھ کی خاک سے پیدا ہوا۔ اور وہ سجاد حیدر یلدرم تھا۔ اب وقت آ گیا تھا جب علی گڑھ کے قلم کاروں کے سامنے صرف سرسید کے نمونے ہی نہ تھے بلکہ مشرقی اور خصوصاً انگریزی Essay کے بڑے بڑے نادر شاہکار نظر افروز اور دلفریب ثابت ہو رہے تھے۔ یلدرم، نہ صرف انگریزی ادب سے بہرہ ور تھے انھیں ترکی ادب سے بھی واقفیت اور دلچسپی تھی۔ ان سب باغوں سے انھوں نے پھول چُنے اور خیالستان کے گل و

گلزار کھلائے۔ یہ پھول اگر چہ دوسرے دیس کا رنگ ڈھنگ رکھتے ہیں مگر ان کا مالی سرسید کے گھرانے کا فرد ہے اس لیے ان گلدستوں کے لیے بھی اُردو والے اسی باغبان اعظم کے مرہونِ منت ہیں۔''[17]

اردو والے Superlatives استعمال کرنے کے بے حد عادی ہیں۔ یلدرم یا کسی اور قابلِ ذکر ادیب کو اُردو کا ''عظیم ترین مضمون نگار'' یا کسی افسانہ نگار کو ''عظیم ترین افسانہ نگار'' یا ناول نویس قرار دینے میں مجھے تامل ہوگا لیکن یقیناً سرسید کے خشک عقلیت پرستی کے ردِعمل کے طور پر ہی رومانیت ظہور پذیر ہوئی۔

''نشے کی پہلی ترنگ'' (معارف اکتوبر 1900ء) کو ڈاکٹر معین الرحمن نے ''اُردو کا پہلا باقاعدہ افسانہ'' قرار دیا ہے۔ جو صحیح نہیں کیونکہ یہ ایک ترکی افسانے کا ترجمہ تھا۔ مترجم سید سجاد حیدر۔ فٹ نوٹ: ''حتی الوسع ترکی کے طرزِ بیان اور ترکیبِ عبارت کا خیال رکھا گیا ہے۔'' اسی شمارے میں ناطق کمال کے متعلق مضمون'': ''ترکی ادب کے نئے دور کے بانی۔ انھوں نے مشرق اور مغرب کے اسلوب کو ملا کر نیا اسٹائل ایجاد کیا۔'' (ناطق کمال بھی فرانسیسی رومینٹک ناولسٹ شاعر اور ڈرامہ نگار وکٹر ہیوگو سے متاثر تھے) ترکی مضامین کے عربی تراجم مغربی اخباروں سے مولوی عبدالعلی خان ہیڈ مولوی، گورنمنٹ ہائی اسکول الٰہ آباد اور مولوی عزیز الرحمن عزیز بھاولپوری ''معارف'' کے لیے اُردو میں منتقل کرنے میں مصروف تھے۔ ترکی سے بلاواسطہ تراجم حاجی اسماعیل خاں رئیس وتاولی اور ان کے شاگرد سجاد حیدر کر رہے تھے۔

ناطق کمال اور ان کے ساتھی سلطان کی مطلق العنانی کی مخالفت ''ینگ اوٹومن سوسائٹی'' سے منسلک رہے تھے۔ اُنیسویں صدی کے عشرۂ آخر میں سرکاری سنسر شپ زیادہ شدید ہوئی اور ناولسٹ ضیا پاشا توفیق فکرے اور نبی زادہ ناظم وغیرہ نے مل کر ایک ادبی دبستان کی بنیاد ڈالی۔ جس کا تعلق رسالہ ثروت وفنون سے تھا۔ یہ لوگ 1891 عیسوی سے لے کر 1901 عیسوی تک لکھتے رہے۔ عین یہی زمانہ انگلستان کا Gay Nineties کہلایا۔ یہ برطانوی Prose Fancy جمال پرستوں اور فرانسیسی زوال پسند مزنگاروں کا دور تھا۔ ثروت وفنون گروپ نے اس دور کا ادبی رنگ

شدّت سے قبول کیا۔

رسالہ معارف کا موڈل ثروت وفنون تھا لہٰذا انھی ادیبوں کی نگارشات نوعمر سجاد حیدر نے اس ماہنامے کے ذریعے اُردو میں متعارف کیں۔ اور اپنے مقالے ''ناول نویسی'' (معارف اکتوبر 1898ء) میں طنزاً یہ بھی لکھا ''شمس العلما مولوی نذیر احمد کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اُردو کے پہلے قصہ نویس ہیں جن کی غائر نظر اس نقطہ پر پہنچ گئی کہ ہندستان سوسائٹی (یا زیادہ صحیح طور پر ہندستان کی اسلامی سوسائٹی) میں شادی سے پہلے جائز عشق معدوم ہے اور اس لیے انھوں نے عشق کا حصہ اپنے قصّوں میں رکھا ہی نہیں۔ ہمارے اور ناول نویس اس تہہ کو نہیں پہنچے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھیں اپنا پلاٹ ہندستان کے باہر رکھنا پڑتا ہے یا عشق کو اس ترکیب سے داخل کرنا پڑتا ہے جو معمولی شریف آدمی کے ہاں ہرگز نہیں ہوتا۔''

اس کے برعکس ترک معاشرے میں معاملہ مختلف تھا۔ چنانچہ معارف میں دوسرا ترکی افسانہ ''جواب'' از خلیل رشیدی ترجمہ از یلدرم جولائی 1901 عیسوی میں شائع ہوا جس میں ''ایک لڑکی استنبول کے بنگلر بے محلّہ میں رہنے والے ''ایک کشیدہ قامت فوجی نوجوان کو جس کے قرمزی بانات کے کوٹ پر نہایت خوبی سے زرد فیتا لگا ہے جس سے آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہوتی ہے'' نہایت رومینٹک جذباتی الفاظ میں یاد کرتی ہے جو اس وقت کی انگریزی Purple یا ارغوانی نثر سے مشابہ ہیں۔ اسی شمارے میں پہلی مرتبہ سجاد حیدر کے بجائے سرورق پر پہلا نام یلدرم چھپا ہوا ملتا ہے۔

ثروت وفنون گروپ نے مغربی جمال پرستوں کی طرح جذبات نگاری، نزاکت خیال، نثری مرصّع سازی اور خالص رومان اور اسلوب کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی کوشش کی لفظ برائے لفظ اور فن برائے فن کے دھندلکے میں پناہ لینے کی ایک سیاسی وجہ بھی تھی سنسر شپ اور سرکاری زبان بندی کے دور میں ادیب اور شاعر عموماً رمزیت اور علائم کا سہارا لیتے ہیں۔ یا بالکل اندرون ذات میں اتر جاتے ہیں۔ دبستانِ ثروت وفنون کے ادیبوں نے بھی خالص جمال پرستی میں راہ فرار تلاش کی۔ شدید سنسر شپ کی وجہ سے انھوں نے قلمی نام اختیار کیے۔ غالباً انھی کی تقلید

میں سجاد حیدر نے اپنا قلمی نام یلدرم رکھا جس کی وجہ سے بقول پطرس اردو میں قلمی نام رکھنے کا رواج ہوا۔

سیاسی استبداد اور زبان بندی کی وجہ سے دبستان ثروت وفنون دانوں کی تحریروں میں یاسیت نے غلبہ پایا۔ چناں چہ یہ عصبی یاس پرست احساساتی ادب جس میں آہ۔اوہ۔! اُف۔اور اے کاش! کی فراوانی تھی جو بوساطت یلدرم اُردو prose fancy ادب لطیف کا باوا آدم بنا۔ پروگریسو ترک ادیبوں کا یہ مصور رسالہ ثروت وفنون 1901 عیسوی حکماً بند کر دیا گیا۔

اختتام صدی فین ڈی سی ایکل Finn de Siecle رومانیت کا شفق آلود دُھندلکا مغرب سے جلد غائب ہو گیا۔ 1913 عیسوی میں ہولبروک جیکسن کی کتاب برطانوی جمال پرستوں کے متعلق شایع ہوئی اس وقت تک وہ ایک ادبی ''پیریڈ'' میں تبدیل ہو کر صفحۂ ہستی ہی سے غائب ہو چکے تھے۔(ان میں سے چند جواں سال مرے۔ چند ایک نے خودکشی کر لی۔ وغیرہ) ترکی میں بھی یہ ادبی رنگ جلد معدوم ہو گیا (چند سال بعد ''ملی ادبیات'' کا جوشیلا دور شروع ہوا۔ خالدہ ادیب خانم اس نئے دور کی نامور مجاہد ادیبہ تھیں) لیکن اُردو میں آگے چل کر اس رومان پرستی میں ''ٹیگوریت'' بھی شامل ہوئی اور بقول پروفیسر وقار عظیم یہ اسٹائل ''جذبات کی دلدل'' میں تبدیل ہو گیا۔

1902 عیسوی میں یلدرم نے تین ترکی ناولٹ زہرا، ثالث بالخیر اور مطلوب حسیناں ترجمہ کیے جن کو کالج بک ڈپو علی گڑھ نے شایع کیا۔ زہرا، ثروت وفنون گروپ کے جواں مرگ ادیب بنی زادہ ناظم کا مختصر ناول تھا۔ اس کے متعلق مخزن جنوری 1903 عیسوی میں ایک مختصر نوٹ چھپا ''سید سجاد حیدر بی اے (علی گڑھ کالج) نے جو کوشش اُردو لٹریچر کو ترقی دینے کی بذریعہ ترکی کتابوں کے ترجموں کے شروع کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس ناول میں ترکی محاورات کو ایک حد تک قائم رکھنے کا التزام کیا گیا ہے تا کہ ترکوں کا انداز تحریر معلوم ہو جائے۔'' مارچ 1903 عیسوی کے مخزن میں غلام بھیک نیرنگ کا تنقیدی مضمون اسی ناولٹ کے متعلق بعنوان ''اُردو زبان اور افسانہ نگاری'' شایع ہوا۔ تینوں ناولٹ خالص رومان کے بجائے سماجی حقیقت نگاری اور رومانی

طرزِ بیان کے امتزاج کے نمونے تھے۔ مطلوب حسیناں درسعادت یعنی استنبول کے Frenchified بالائی ترک طبقے کے ایک نوجوان احمد پر تو بک اور ایک فرانسیسی لڑکی کے معاشقے کا قصہ تھا۔ ثالث بالخیر اور زہرا میں بیوی کو بلاوجہ طلاق دینے اور نکاح ثانی کی بدعتوں کو پیش کیا گیا تھا۔ یہ مسائل ہندی مسلم معاشرے میں موجود تھے یا بقول مترجم اس معاشرے کو پیش آنے والے تھے۔ لیکن 1903 عیسوی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندی مسلمانوں کے لیے یہ ترک معاشرہ بھی قطعی اجنبی تھا! چنانچہ امبالے کے ایڈووکیٹ اور ادیب میر غلام بھک نیرنگ اپنے تبصرے میں فرماتے ہیں "ایک مسلمان زہرا اور ثالث بالخیر پڑھ کر یہ ضرور کہے گا کہ ترکوں کی زندگی اگر یہی ہے تو خدا جانے یہ کس مذہب و ملت کے لوگ ہیں۔ ان میں اسلامیت تو خصوصیت سے موجود ہی نہیں۔" لیکن مضمون کے آخر میں انھوں نے لکھا "مگر یہ چھوٹا سا افسانہ اکثر صفات سے بالکل ایک نمونہ ہے۔ اہل تصنیف و تالیف کو اس کی مثال سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

ان تینوں مختصر ناولوں میں ادبی لحاظ سے زہرا بہتر تھا اور اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بعد لکھے جانے والے اُردو ناولوں کا اسٹائل (علاوہ پریم چند کے) ان تینوں ناولوں سے کس قدر متاثر ہوا۔ گو تعجب کی بات یہ ہے کہ ناول میں ڈرامے کی طرز کی مکالمہ نویسی کا دقیانوسی طریقہ ان جدید تر کی ناولوں میں بھی موجود تھا۔ نذیر احمد، سرشار، رسوا کے ہاں تو خیر تھا ہی اور پریم چند اور ان کے معاصرین کے ناولوں اور افسانوں میں آخر تک باقی رہا۔

ڈریگومین (عربی: ترجمان) دولت عثمانیہ میں متعین یورپین سفارتخانوں کا ایک اہم عہدہ تھا جس کی بنیاد خود حکومت ترکی نے ڈالی تھی۔ ترک حکمراں غیر ملکی سفیر سے یورپین زبانوں میں گفتگو کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔

چنانچہ انھوں نے سفارتی مقاصد کے لیے اپنی یورپین رعایا کے قابل افراد بطور ڈریگومین یا ترجمان مقرر کیے تھے۔ جو اہم عثمانی عہدے بن گئے۔ سترھویں صدی کے دو چیف ڈریگومین

مکوسیا اور ماورد کوداتوس یونانی تھے۔ موخرالذکر باب عالی کا سیکریٹری آف اسٹیٹ بھی مقرر رہوا۔ اس نے حکومت عثمانیہ کی طرف سے پولینڈ کے ساتھ اہم معاہدے کیے۔ اس طرح یورپین حکومتوں نے قسطنطنیہ میں متعین اپنے سفارت خانوں میں ترکی داں یونانی، ارمنی، سیرین اور لبنانی ڈریگومین مقرر کیے جو سفیروں اور باب عالی کے مابین Confidential Intermediaries کے فرائض انجام دیتے تھے۔ 1699 عیسوی میں فرانس نے فرنچ افسروں کے لیے استنبول میں ترکی سیکھنے کا مدرسہ قائم کیا بعد میں یہ کام مدرسہ الئسہ شرفیہ پیرس کے سپرد ہوا۔ 1877 عیسوی میں حکومت انگلستان نے برطانوی شہریت رکھنے والے افراد بطور ڈریگومین منتخب کرنے شروع کیے، سوائے امریکہ کے دوسری مغربی حکومتوں نے بھی یہی کیا۔ چیف ڈریگومین باب عالی کے ساتھ اہم مذاکرات کرتا تھا۔ صوبہ جات میں تعینات برطانوی قونصل خانوں کے ڈریگومین سلطنت ترکیہ میں مقیم برطانوی شہریوں کے حقوق اور معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ فرانسیسی ڈریگومین کا عہدہ Plenipotentiary Ministers کا ہوتا تھا۔

بی اے کرنے کے بعد یلدرم اپنے احباب کے ساتھ علی گڑھ کی ایک کوٹھی میں جس کا نام انھوں نے بچلیرز لاج رکھا تھا۔ بقول زاہدی "صاحبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔" ان ہی دنوں مشتاق احمد زاہدی کے الفاظ میں:

> "بغداد کے قونصل خانے کے لیے ڈریگومین کی مانگ آئی، بہت سے طالب علموں نے درخواستیں دیں۔ جن میں سے بعض ایسے بھی تھے جن کا کام روزانہ پرنسپل کو سلام کرنا تھا اور جو عربی میں ایم اے بھی تھے۔ سجاد نے بھی درخواست دی۔ گو سجاد صاحب بی اے تھے اور پرنسپل موریسن سے کبھی ملتے بھی نہ تھے مگر موریسن نے سب سے زیادہ انھی کی سفارش کی۔ نیز ان کو ترکی بھی آتی تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں کے خیال میں غیر متوقع اچانک طور پر ان کا تقرر ہو گیا۔"

علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مع تہذیب الاخلاق: 28 مارچ 1904 عیسوی (صفحہ: 17)

> "ہمارے کالج کے لائق اور ہر دلعزیز طالب علم مسٹر سجاد حیدر بی

اے ایک پولیٹیکل[18] خدمت پر مامور ہو کر بغداد کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کا تعلق بالفعل بغداد میں برٹش کونسل سے رہے گا۔ ان کے اس تقرر سے خوشی بھی ہے اور افسوس بھی۔ وہ ایک معزز اور ذمے دار خدمت پر جا رہے ہیں۔ اور ان کی اعلیٰ لیاقت سے امید ہے کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے نہایت مفید عہدیدار ثابت ہوں گے۔ اور کالج کا نام ہندستان سے باہر مشہور کریں گے۔ ان کی دیرینہ آرزو تھی کہ ترکی کی سلطنت میں رہیں اور وہاں کی زندگی اور پالی ٹکس میں حصہ لیں۔ اسی شوق میں انھوں نے ترکی زبان میں دستگاہ حاصل کی۔ ہمیں امید ہے کہ قدیم اسلامی خانہ تہذیب میں بیٹھ کر وہ ہمارے قومی لٹریچر کو ضرور فائدہ پہنچائیں گے۔ اور وہاں گمشدہ اسلامی روح اور شان کی تلاش اور تحقیق شروع کریں گے۔"

"سفیر بغداد" اسی سال شایع ہوا۔ بغداد میں جو مضامین "ہندی مسافر" نے لکھے وہ بقول سید سلیمان ندوی مخزن کے خوان ادب میں شہر بہ شہر ہاتھوں ہاتھ بٹے۔ مخزن میں اب انگریزی افسانوں کے تراجم چھپنے شروع ہوئے۔ امریکہ کے اوّلین افسانہ نگار واشنگٹن ارونگ کی رومانی کہانیاں ہی منتخب کی گئیں۔ اور بل لیتر Belles Lettres والے نثر پارے میاں بشیر احمد وغیرہ نے لندن سے ترجمہ کر کے بھیجے۔

اب ذرا اندرون محل سرائے اور کولونیل کوٹھیوں کی چلمنوں کے پیچھے بھی جھانک لیجیے۔ سر سید تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔ لیکن ان کے چند ساتھیوں اور مریدوں نے حقوق نسواں کے لیے عملی جدوجہد شروع کی۔ زنانہ اخبار اور رسالے نکالے۔ عورتیں خود مضمون اور ناول لکھنے لگیں۔ (نہ بھولیے کہ شدید ہمت شکن حالات میں ایک خاتون رشیدۃ النسا بیگم نے بہار جیسی قدامت پرست جگہ میں رہتے ہوئے ایک اصلاحی ناول 1869 عیسوی میں لکھا تھا۔ جو 1880 عیسوی میں شایع ہوا۔

علامہ اقبالؒ کے کشمیری پنڈت اجداد تو صدیوں قبل مسلمان ہوئے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ خود ایک کشمیری برہمن نوجوان تھے جو بعد قبول اسلام علی گڑھ پڑھنے آ گئے تھے۔ 1904 عیسوی

میں ایک زنانہ رسالہ جاری کیا جس کا نام ان کے خیال میں شاید سجاد حیدر یا ابومحمد صاحب نے ''خاتون'' رکھا۔ اس وقت ترک خانم اور برہمو اور پارسی لیڈیاں بہ لحاظ ترقی آئیڈیل سمجھی جارہی تھیں۔ مس نذر الباقر شیخ عبداللہ کے رسالے (فروری مارچ 1905 عیسوی) میں لکھتی ہیں، ''دیکھو انگلینڈ کی لیڈیاں کیسی عزت پارہی ہیں۔ اب وہ زمانہ گزر گیا کہ ڈھائی سو کا جوڑا اور ہزار کا زیور پہن کر ہر عورت بیگم کہلاتی تھی۔ ڈیر سسٹرز کیا یہ شرم کی بات نہیں کہ ہماری قوم ''نیم وحشی'' کے برے خطاب سے یاد کی جائے؟ ایک زروزیوردار بیوی سے ایک پھٹے کپڑوں مگر اچھی تعلیم یافتہ عورت ہزار درجہ اچھی۔ پارسی اور بنگالی خواتین کیسی عزت پارہی ہیں''۔ یاد رہے کہ انگریزی پریس اور انگریز عموماً ہندستانیوں کو نیم وحشی Semi-Barbarian کے لقب سے یاد کرتے تھے!

مسلم عمائدین قوم تعلیم نسواں کے خلاف تھے۔ ان کے اس دل شکن رویے کے باوجود نئی خواتین نے بھی اپنی ساری امیدیں علی گڑھ سے وابستہ کر رکھی تھی۔ 1905 عیسوی میں شیخ عبداللہ کے مدرسہ نسواں کے قیام پر مس نذر الباقر خاتون میں لکھتی ہیں ''اب تو ہمارے لیے جو کچھ ہوگا علی گڑھ ہی سے ہوگا!''

بسلسلہ اصلاحِ لباس و معاشرت مس نذر الباقر اپنے مضمون بعنوان ''مکالمہ'' (خاتون ستمبر 1906 عیسوی) میں بطور ایک درخشندہ مثال اپنے ہی گھر کا نقشہ کھینچتی ہیں اور اپنے والد چھوٹی بہن اور بھائی کو ان کے اصلی ناموں کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔[19]

''پچھلے دنوں ہمارے یہاں بچوں کی تربیت پر ایک لیکچر تھا۔ کئی معزز بیبیاں آئی تھیں۔ ایک کلرک صاحب کی بیوی نہ آسکیں۔ تین چار دن بعد وہ آئیں۔ صبح دس بجے کا وقت تھا ڈرائنگ روم میں میری چھوٹی بہن ثروت آرا اپنے ننھے بھائی نذر المصطفےٰ کو کھلا رہی تھیں۔ (بطریق کنڈر گارٹن اسکول کی تعلیم) کہ اتنے میں معلوم ہوا کہ ایک بیگم صاحبہ تشریف لائی ہیں۔ ہماری ملازمہ ان کو لے کر ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ میری بہن نے اٹھ کر شیک ہینڈ کیا۔ چند سکنڈ خاموشی کے بعد بیگم صاحبہ یوں مخاطب ہوئیں۔

بیگم۔ میں جن سے ملنے آئی ہوں ملی نہیں۔ میر صاحب کی بیوی اور لڑکیاں کہاں ہیں؟

ثروت۔ میری والدہ تو آج پاپا کے ساتھ کسی شادی میں پشاور گئی ہوئی ہیں۔ باجی جان دوسرے کمرے میں میم صاحبہ سے کچھ بحث کر رہی ہیں۔ ٹھہریے میں بلواتی ہوں۔ مفلارے (یہ ایک آفریدی عورت ہے ان کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں) باجی جان اور مسز ویلز کو بلالاؤ۔"

(اس کے بعد مصطفیٰ مع اپنی انگریز گورنس مسز ویلز کمرے میں آتی ہیں)

بیگم صاحبہ: "میں تو حیران ہوں کہاں آ گئی۔ شاید کوچبان میر صاحب کا گھر نہ جانتا ہوگا اس لیے یہاں لا اُتارا۔ میں نے سنا تھا کہ میر صاحب ہندستانی ہیں یہاں تو کچھ اور ہی نکلا۔ شاید یہ کابلی میر صاحب کے ہاں آ گئی ہوں۔ سنا ہے ان کی لڑکیاں انگریزی کپڑے پہنتی ہیں۔ آپ برائے مہربانی مجھے سیدنذر الباقر کے گھر پہنچا دیں۔ میں یہاں فرنگی کھیل میں ہرگز نہ ٹھیروں گی۔"

مسز ویلز تو اس جھگڑے سے اکتا کر چلی گئیں۔ مگر بیگم صاحب نے کہا افسوس نئی روشنی نے اپنا اثر کر دیا ورنہ ہم کجا اور یہ موا لباس کجا۔ لڑکیوں نے پوچھا بے ادبی معاف، ہمارے لباس میں کیا مواپن دیکھا۔

بیگم۔ یہی کہ فرنگیوں کا ہے۔

(اس کے بعد لباس پر بحث ہوتی ہے۔ لڑکیاں کہتی ہیں لباس سے تین فوائد ہیں ستر پوشی۔ دوئم سردی گرمی کا آرام۔ سوئم زینت۔ آپ کی چھوٹی سی کرتی جالی کی نہ ستر پوشی کرتی ہے۔ پاجامہ خوب صورت ہے مگر چلتے پھرتے پنڈلیاں کھلتی ہیں۔ گوٹے ٹھپے کی فضول خرچی علاحدہ وغیرہ "ستر پوشی کے واسطے ہم دو دو کپڑے پہنتے ہیں۔ نیچے لمبی قمیص۔ نیکر۔ لانگ جراب زنانہ بنیان"۔

"جب ہم کھانا کھا رہے تھے گراموفون بج رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کی لڑکی جو چھ سال کی تھی ڈر گئی اور کہنے لگی اماں اس میں بھوت بند ہے۔ بھوت پریت تعویز گنڈے کی قائل بیگم صاحبہ بھی حیران ہوئیں۔ کھانے کے بعد چھوٹے بھائی مصطفیٰ باقر نے کہا باجی جان گاموں پھون بجایئے گا۔ لڑکی بولی اماں باجہ نہ بجے بھوت نکل کر مجھے کھا جائے گا۔ مصطفیٰ باقر حیران ہو کر بولا باجی جان بھوت کیا ہوتا ہے؟ ہمیں بھی کھول کر دکھایئے۔

بیگم۔ نا بچے نہ کھلواؤ، میری بچی بیمار ہے ڈر جائے گی۔ اس کی ماں تو چلی گئی یہ کیوں رہ گیا۔ یہ کیسی آزادی ہے ایک انگریز کا بچہ مسلمان لڑکیوں کو باجی کہے۔

''یہ سن کر ہمیں بہت ہی غصہ آیا کچھ نہ بولے۔ ملازمہ جو پنکھا جھل رہی تھی برآمدے سے بولی بیگم صاحبہ یہ ہمارا صاحبزادہ ہے میم کا بچہ نہیں ہے۔ خوب صورتی چستی وصفائی کے خیال سے انگریزی کپڑے پہنتا ہے۔ اس وقت تو یہ ننگے سر ہے۔ دھوپ میں جب باہر نکلتا ہے تو انگریزی ٹوپی پہن لیتا ہے۔'' پردہ نشین لڑکیاں مسز ویلز سے انگریزی پڑھتی ہیں۔ پردہ دار وکٹورین ایڈورڈین لباس پہنتی ہیں لیکن ہیں پابند صوم وصلوٰۃ۔ ننھا مصطفےٰ باقر ''انگریز کا بچہ'' معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ترکی ٹوپی بھی اوڑھتا ہے۔ پسماندہ صوبہ سرحد میں دور جدید کے نمائندے ایک بنگالی بابو ہیں (غالباً ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں ملازم یا فوجی ڈاکٹر) جن کی لڑکیاں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ (اور یہ لڑکیاں آئندہ متھ کی شیدائی ہوں گی)

نئے جذباتی اسٹائل آہ! اور اوہ! اور اے کاش! کا دور شروع ہو چکا تھا۔ محمدی بیگم ایڈیٹر تہذیب نسواں (اہلیہ شمس العلما سید ممتاز علی) کو جواں مرگی پر بنت نذر الباقر اسی نئے اسٹائل میں بعنوان ''غم جاں کاہ'' خاتون نومبر 1908 عیسوی میں لکھتی ہیں، ''اے موت۔! یوں تو تیرا نام ہی ڈراؤنا ہے اور تیرا عمل ہر جان دار کے لیے سخت۔'' وغیرہ وغیرہ۔

ثالث بالخیر میں ہیروئن کو جرمن گورنسوں نے پڑھایا تھا۔ زہرا کا طرز معاشرت نیم یورپین تھا۔ ادھر برطانوی ہند میں اسی نئی مخلوط طرز معاشرت کی پروردہ مس نذر الباقر کے اوّلین اور مشہور ترین ناول ''اختر النسا بیگم'' (1910 عیسوی) کی ہیروئن پیانو بجاتی ہے۔ شام کو مرد اسٹراہیٹ پہنتے ہیں۔ ہیروئن کی خالہ ترکی لباس پر دوپٹہ اوڑھتی ہیں۔

وہی بات جو پطرس نے یلدرم کے لیے بہت بعد میں لکھی کہ یہ نیا ادبی اسٹائل ترکی لیبل کے ساتھ زیادہ قابل قبول ہو سکتا تھا۔ جس طرح یورپین لباس اگر مسلم خواتین کو قبول نہیں اسی کو ترکی پوشاک کہہ دو شاید پہن لیں۔ مس نذر الباقر نے خود بھی گاؤن کی وضع کا غرارہ اور ترکی وضع کا برقع اختراع کیا جو سارے ملک میں بے حد مقبول ہوا اور ان کی پھوپی والدہ افضل علی نے اپنے

ناول ''گودڑ کا لال'' (1911 عیسوی) میں اس کا تذکرہ کیا۔ غرض یہ کہ ترکی اسلامیانِ ہند کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ ترک خواتین ہر لحاظ سے مشعلِ راہ ثابت ہو رہی تھیں۔ کیوں کہ 1908 عیسوی کے انقلاب میں بھی انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

وکٹورین انگلستان اور امریکہ میں ''ینگ لیڈیز'' مہمانوں کو پیانو بجا کر محظوظ کرتی تھیں۔ انگلستان میں اس طرزِ زندگی کے متعلق ناول طنزاً ''ڈرائنگ روم بیلیڈ'' کہلاتے تھے۔ ہر خوش حال ترک گھر میں پیانو موجود تھا۔ ترکی اب بیرل آرگن، سنیما ٹوگراف اور سکنڈ ریٹ فرنچ اوپرا کی دنیا تھی۔

بنگالی بابو نے فوراً ہارمونیم اور مختصر آرگن رائج کر لیا۔ جسے بجا کر ہلکی پھلکی رابندر سنگیت پیش کرنا خواتین کے کلچرڈ ہونے کی نشانی تصور کی گئی (''صحبت ناجنس'' کی عذرا نے بھی اسکول میں پیانو پر انگریزی گیت گانا سیکھا) اب ہر اُردو ناول اور بالخصوص نذر سجاد حیدر کے ناولوں کی ہیروئنوں نے بے حد پیانو اور ہارمونیم بجا بجا کر بہ چشم پرنم حسب حال غزلیں گائیں۔

چنانچہ وکٹورین انگلستان، عثمانی ترکی، برطانوی کولونیل ہندستان اور علی گڑھ۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان۔

ثالث بالخیر، مطلوب حسنیاں، زہرا، پرانا خوان اور جنگ جدال امپیریل ترکی کے اپر کلاس معاشرے کے عکاس ہیں اور ان کا ماحول امپیریل روس کے اپر کلاس معاشرے سے ملتا جلتا ہے۔ اس ماحول میں فینٹسی نہیں تھی۔ سراسر حقیقی تھا۔ لیکن مقلدین یلدرم میں حجاب امتیاز علی (جو اس وجہ سے قابلِ ذکر ہیں کہ ان کی چند تصانیف آج بھی پڑھی جا سکتی ہیں) نے یلدرم کی پیش کردہ ترکی افسانوی کائنات کی بنیاد پر ایک حد سے زیادہ طلسماتی دنیا تخلیق کی۔ حجاب نے اس صدی کے عشرہ سوئم میں لکھنا شروع کیا۔ رومانی کرب، خواب اور یاس پرستی (والدہ کی موت کے بعد عرصے تک خود کو دلفگار حجاب لکھا کیں) خالص ہلکی پھلکی ہوائی غیر ذہنی رومانیت ان کی خصوصیات

تھیں وہ بھی اپنی پیش رو مس نذر الباقر (بعد میں نذر سجاد حیدر) کی طرح اس لحاظ سے خوش قسمت تھیں کہ ایک روشن خیال باپ نے ان کی پرورش کی تھی۔ لیکن وہ بنتِ نذر الباقر سے اگلی نسل سے تعلق رکھتی تھیں چنانچہ گھر پر انگریز گورنس سے پڑھنے کے بجائے اسکول گئی تھیں۔ پردہ نشین مس نذر الباقر ایڈورڈین پوشاک پہنتی تھیں۔ مس حجاب اسماعیل عشرہ سوئم یعنی Roaring Twenties کے عصری فیشن کے فراک پہن کر بے پردہ باہر نکلتی تھیں۔ 1906 عیسوی میں اگر ایک قدامت پرست بیگم صاحبہ نے مس نذر الباقر اور ان کی چھوٹی بہن کو عجوبہ روزگار تصور کیا تھا۔ (1920 عیسوی میں نذر سجاد حیدر نے پردہ ترک کیا) تو 1928 عیسوی میں بھی مس حجاب اسماعیل جیسی مسلمان لڑکیاں خال خال ہی نظر آتی تھیں۔ اور اس وقت ان لڑکیوں میں یلدرم کی کانونٹ کی تعلیم یافتہ بھتیجیاں بھی شامل تھیں۔ مگر وہ بھتیجیاں جس آزادی کا تصور بھی نہ کر سکتی تھیں وہ Improbable مس حجاب اسماعیل نے کر دکھائی تھی۔ یعنی وہ پچیس تیس سال قبل کے دبستانِ ثروت وفنون کی ترک ادیبہ شفیقہ عالیہ کے ''قطراتِ موسیقی'' قسم کی کاسنی نثر میں عشقیہ افسانے لکھ رہی تھیں۔ انھوں نے مدراس میں بیٹھے بیٹھے (جہاں کی وہ باشندہ تھیں) انگلش کنٹری ہاؤس، ترکی اور مصری محل سرا اور فرانسیسی شاطو کی معجونِ مرکب فضا سازی شروع کی۔ سر ہارلی، مادام زبیدہ خاتون روبی، کاؤنٹ الیاس، بوڑھی حبشن خادمہ زوناش، اپنے ناول ''میری ناتمام محبت'' (1932ء) کے دیباچے میں انھوں نے لکھا کہ انھوں نے ''ایک خیالستان بسایا ہے۔'' حجاب کے اسٹاک کردار آج تک بار بار سامنے آتے رہے ہیں اور اس تخیلی دنیا میں رہتے ہیں جس پر یلدرم کے پیش کردہ معاشرے کی چھاپ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ دادی زبیدہ سگریٹ پیتی ہیں۔ ''سلطان کے خاندان سے ان کی قریبی رشتے داری تھی۔'' شادی سے پہلے ان کے والد بغداد میں رہتے تھے۔ انھوں نے قسطنطنیہ میں تعلیم حاصل کی اور فرانسیسی اور عرب گورنسوں نے انھیں پڑھایا۔ اعلیٰ درجے کی مصور تھیں۔ ''کوچ پر وہ لیٹ کر'' پیر لوتی کے ترکی ناول پڑھتی ہیں[20]۔ خاتون روحی کے ''سنہرے بال ترکی رومال میں چھپے ہوتے ہیں'' وہ ''تفریحی یا بحری'' لباس، پہن کر باہر جاتی ہیں ''گلستانی چھتری'' اور سنگار بکس ان کی مراکشی کنیزیں تھامے رہتی ہیں۔ مادام

زبیدہ ''میری ناتمام محبت'' میں سوئٹزر لینڈ جا بستی ہیں۔ ایک اور افسانے میں نارنگی کی نوشگفتہ کلیوں سے آراستہ دلہن کہتی ہے۔ او میرے خدا۔ ! او بلند آسمان یعنی O' My God! Heavens!! محض عیسائی اور مغربی دلہن نارنگی کی کلیوں سے سجتی ہیں۔ مگر حجاب کے ہاں سب چلتا تھا۔ ہیرو ''دھوپ کی ٹوپی'' چھو کر کہتا تھا ''میری غریب بچی۔! یعنی My Poor Child یہ سب اردو والوں کے لیے انتہائی انوکھی اور مسحور کن چیزیں تھیں تا آں کہ عصمت چغتائی نے نہایت استہزا کے ساتھ حجاب کا طلسم توڑا۔

رفتہ رفتہ ہندی مسلمانوں کے ذہنوں پر سے ترکی طلسم بھی زائل ہونے لگا۔ لیکن یلدرم کے ذہن پر سے نہیں۔ 3 مارچ 1924 عیسوی کے روز خلافت عثمانیہ ختم کر دی گئی۔ اسی سال مئی میں یلدرم انگلستان یورپ اور ترکی کی سیاحت کے لیے گئے۔ ایک نجی خط میں سوئٹزر لینڈ سے لکھا: ''بے چارہ سلطان جسے مصطفٰے کمال پاشا نے نظر بند کر دیا ہے سوئٹزر لینڈ میں آ کر پناہ گزیں ہوا ہے۔ Mantraux میں رہتا ہے اسے بھی جا کر دیکھا۔ مفصل حال زبانی بتاؤں گا۔ اسے دیکھ کر بہت ترس آتا تھا۔''

ترکیہ کی تاریخ Full circle آ چکی تھی! مگر یلدرم اپنے مضمون ''قسطنطنیہ۔ مقام جمہوریت'' میں تحریر کرتے ہیں:

''پھر مجھے لے چلا وہیں دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں''

دیارِ مغرب کی سیاحت ختم ہوئی۔ آنکھوں نے سب کچھ دیکھا آثارِ قدیمہ، تحریکات جدیدہ، سکون نا آشنائی، کام زنی شبانہ روز ساتھ ہی پرستش زر و غرور، مدنیت، امتیاز و تحکم نسل و قوم۔ ان سب نے دل پر گہرے اثر چھوڑے۔ ہاں اے یورپ۔

گفتگو آئین درویشی بنود
ورنہ باتو ماجراہا داشتیم

اب اپنے محبوب شرق قریب کی کشش مجھے مغرب کی طلسماتی سیمابی زندگی سے چھڑا رہی

ہے۔ افق پر ہلال باسفورس کی یاد دلا رہا ہے۔ اوکھنہ شہر بائز نائین! تیری جاذبیت ناقابل مقاومت ہے۔ بارہ سال قبل تو نے مجھے بلایا اور میں اقتاں وخیزاں لبیک لبیک یا جیبی یا محبوبی کہتا ہوا پہنچا۔ مشروطیت، خلافت، جمہوریت، تیری ہر ادا بانکی ہے۔ من انداز قدت رامی شناسم۔"

ترکی سے اس غیر معمولی لگاؤ کی وجہ ایک اور بھی تھی۔ بدقسمتی سے یلدرم کا نام انتہائی رقت خیز قسم کے ادب سے وابستہ ہو گیا جبکہ ذاتی طور پر وہ جذباتیت کے مخالف تھے۔ ترک بھی شرق اوسط کی دوسری اقوام کے برعکس جذبات تو وہ اور ہیجانی نہیں۔ 1908 عیسوی میں ایک برطانوی مصنف نے لکھا تھا کہ باغات اور فواروں کے عاشق ترک ایک رومان پرست قوم ہیں ان کے میلوں ٹھیلوں کھیل تماشوں اور تہواروں میں بھی ان کا رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی غیر ملکیوں کو متاثر کرتی ہے۔

ترکوں کے قومی مزاج میں وہ توازن، شائستگی نفاست اور اعتدال موجود تھا جو یلدرم کے اپنے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ اس وجہ سے انھوں نے خود کو ہمیشہ اس ملک میں بے حد "ایٹ ہوم" محسوس کیا۔

خیالستان کا سب سے گہرا اثر نیاز کے ہاں نمایاں ہے۔ نگارستان، جمالستان، بہارستان، سمنستان وغیرہ ناموں کا رواج بھی خیالستان کے تتبع میں چل پڑا۔

سلطان حیدر جوش، ل۔ احمد اکبر آبادی، سجاد انصاری، مجنوں گورکھپوری، سدرشن، میاں بشیر احمد، میاں عبدالعزیز فلک پیما، اختر شیرانی، قاضی عبدالغفار، امتیاز علی تاج، خلیق دہلوی اور قوی رہنما آصف علی سمیت ادب لطیف لکھنے والوں کی فہرست بے حد طویل ہے۔ لیکن آج سوائے فلک پیما کے ان نثر پاروں کو پڑھنا بہت صبر آزما ہے۔

استنبول کے دبستانِ ثروت وفنون کی نیم یورپین نیم ترکی رومانیت کا فوری Impact یلدرم کی وساطت سے اردو پر پڑا۔ لیکن اس کے فوراً بعد مغرب میں بہ اعتبار تکنیک وموضوع فکشن کی جو کایا پلٹی اس کی اطلاع اُردو میں بہت ہی دیر میں پہنچی۔ نیاز کا ہیرو مدتوں تک "آرٹ پر آسکر وائیلڈ کے خیالات کا مطالعہ" کرتا رہا۔

1929 عیسوی کے لاہور کے ایک ادبی رسالے میں اشتہار:

''اخلاق آموز کتابیں جو ہر مسلمان لڑکے اور لڑکی کو پڑھنی لازمی ہیں چونکہ فی زمانہ مختصر افسانہ نویسی کو اُردو ادب کی جان تسلیم کرلیا گیا ہے اس لیے اس مذاق سلیم کو فروغ دینے کی خاطر ہم نے کتاب شمع شبستان صرف کثیر سے شایع کی ہے۔ جس میں ملک کے بہترین افسانہ نگاروں کے 14 مختصر افسانے درج ہیں: اس مجموعے میں مندرجہ ذیل افسانہ نگاروں کا ایک ایک شاہکار درج ہے۔ جناب سجاد حیدر یلدرم، مسٹر سلطان حیدر جوش، منشی پریم چند، خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری، مولانا عبدالمجید سالک، مسٹر محمد دین تاثیر، مسٹر عابد علی، میاں محمد اسلم، مولانا نیاز فتح پوری، عبداللطیف وغیرہ وغیرہ اگر حسن و عشق اور جذبات کی سحر طرازیاں دیکھنی ہوں تو شمع شبستان منگایئے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''حسن و عشق اور جذبات کی سحر طرازیاں'' ''اخلاق آموز کتابیں کس طرح تھیں، جو ہر مسلمان لڑکے اور لڑکی کو پڑھنی لازمی تھیں؟ اسی رسالے میں مندرجہ ذیل کتابوں کا فل پیج اشتہار: الہامی افسانے، خیالستان، حکایات و احساسات، ثالث بالخیر، خواب و خیال، خواب ہستی، شاہین، ۔ سیر گل۔ ہیبت ناک افسانے، تائیس۔''[21]

وکٹر ہیوگو کو بھی اردو میں خوب ترجمہ ہوئے۔

ادھر ٹیگور اور سروجنی نائیڈو کی رومانیت نے اودھم مچا رکھی تھی۔ بنگال اسکول کے مصوّروں کی غنائی رومانیت اور چغتائی آرٹ دونوں گویا اس ادبی 'لطافت و نزاکت'' کا تصویری ترجمہ تھے جس نے اُردو کو خیالستان (1910ء) اور گیتا نجلی (1913ء) سترجمہ نیاز کے وقت سے اُردو کو شرابور کر رکھا تھا۔ آرٹ کی حد تک چغتائی، موبھا سنگھ، استاد اللہ بخش، راجہ روی ورما اور ملو بک والے آبرے بیرڈزلے کے پرنٹ اُردو سالناموں میں چھپ جاتے تھے۔ پریم چند کے علاوہ ترقی پسندوں کے دور سے قبل تک کا بیش تر طبع زاد افسانوی ادب خاصا نحیف ہے۔ جذبات نگاری بالعموم مریضانہ رنگ اختیار کر چکی تھی۔ چند Freak تخلیقات اچانک سامنے آجاتی تھیں۔

''انارکلی'' از امتیاز علی تاج (1922ء) پطرس کے مضامین، آسیب الفت، ''لیلیٰ کے خطوط'' وغیرہ کو، منٹو اور ''انگارے'' اور ''لندن کی ایک رات'' (1938ء) کو اس تذکرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کے ساتھ اُردو فکشن کی نئی داستان شروع ہوتی ہے۔

ہندستان کی جدوجہد آزادی اور بائیں بازو کی تحریکوں اور دوسری جنگ عظیم کے پیدا کردہ مسائل نے ادبی محرکات یکسر تبدیل کر دیے۔ رومانیت لایعنی اور مضحکہ خیز معلوم ہونے لگی۔ مجاب امتیاز علی کا دوسرا ناول ''ظالم محبت'' یلدرم کے دیباچے کے ساتھ 1940 عیسوی میں شائع ہوا لیکن اس کی وہ پذیرائی نہ ہو سکی جو 1932 عیسوی میں ''میری ناتمام محبت'' کی ہوئی تھی۔

دور اوّل کے کرشن چندر، مرزا ادیب (صحرا نورد کے خطوط) شفیق الرحمان، اے حمید وغیرہ کے رومانی افسانوں میں بھی منظر کشی اور جذبات نگاری کا انداز بدل گیا اور دوسری طرف کرشن چندر مع اپنی رومانی غنائی حقیقت نگاری ترقی پسندوں کے میر کارواں بنے۔

انگارے کے چند مصنفین انگلستان کی Pink Decade یا اس صدی کی چوتھی دہائی 40-1930 عیسوی کے ''گلابی'' یا بائیں بازو کے ادب سے بہرہ ور ہو کر ہندستان واپس آئے تھے۔ انگلستان میں عشرہ چہارم بھی تیسری دہائی یعنی Roaring Twenties اور اس سے قبل کے Gay Nineties کے مانند سیاسی اور سماجی نظریات ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں بے حد انقلابی اور فکر انگیز ثابت ہوئی تھی۔

ہندستان میں علامہ اقبالؒ، ٹیگور اور پریم چند تینوں کو انقلاب روس نے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ چنانچہ ''کلاسکیت اور ''نیچرل شاعری'' اور رومانیت کی طرح ''سوشلسٹ ازم'' بھی اردو میں مغرب ہی سے امپورٹ ہوئی جس طرح تیس پینتیس سال قبل نوعمر پریم چند کو ٹالسٹائی نے متاثر کیا تھا۔

رومانیت اس صدی کے پہلے چالیس بیالیس برس تک اُردو میں چلی اور یہ کافی طویل مدت ہے۔ ترقی پسند ادب کا دور زرّیں محض پندرہ بیس سال ہے۔ پچھلے بیس بائیس سال سے رومانی الاصل جدید ادبی رجحانات بھی مغرب ہی سے گو حسب معمول بہت دیر بعد در

آمد کیے گئے ہیں۔

اردو والے رپ وان ونکل ہیں۔ مدّت مدید کے بعد اچانک جاگتے ہیں یا اصحاب کہف کی طرح شاہ دقیانوس کے زمانے کے سکے دکھلا کر کہتے ہیں۔ ''دیکھو ہم کتنے جدید اور ''عصری آگہی'' سے کس قدر مالا مال ہیں۔''

یورپ میں جدیدیت کے بانی چارلس بودلیئر کا ''بدی کے پھول'' 1857 عیسوی میں شایع ہوا تھا۔ ہمارے ہاں اس کا تذکرہ تقریباً سو سال بعد ہوا۔ چیخوف کو پہلی بار بشیرالدین صاحب (بعد میں نامور لائبریرین) نے 1923 عیسوی میں علی گڑھ میگزین میں پیش کیا۔ سررئیلزم 1924 عیسوی میں شروع ہوئی۔ اُردو والے کوئی تیس سال بعد کرشن چندر کی ''ایک سررئیلی تصویر'' کے ذریعہ اس اصطلاح سے واقف ہوئے۔ ایلیٹ کے ویسٹ لینڈ (1922 عیسوی) کا ترجمہ عزیز احمد نے غالباً 1935 عیسوی میں بعنوان ''خراب آباد'' کیا تھا۔ اس وقت اسے نظر انداز کیا گیا۔ لیکن ایک معمولی رومینٹک شاعر طامس مور کی ''لالہ رُخ'' (1839 عیسوی) کا ترجمہ ل۔ احمد اکبرآبادی نے تقریباً سو سال بعد کیا، بے حد مقبول ہوا۔ منٹو نے موپساں اور گور کی کو 1930 عیسوی میں اُردو میں منتقل کیا۔ روسی نژاد مصوّر کینڈنسکی کی تجریدیت 1908 عیسوی میں منظر عام پر آئی اور اس نے اپنی تصاویر کے نام ''کمپوزیشن نمبر 1'' ''کمپوزیشن نمبر 2'' وغیرہ رکھے۔ ہمارے ہاں مصوّری اور ادب میں تجریدیت کا چرچا آج جدید ترین ہونے کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ کافکا کو انتظار حسین اور خالدہ اصغر سے پہلے ایران کے صادق ہدایت ڈیسکور کر چکے تھے۔

خیر یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ انتظار حسین اور خالدہ اصغر صادق ہدایت کے بہت بعد میں پیدا ہوئے مگر صادق ہدایت کے ہندستانی معاصرین ''آہ! پیاری مالتی تمھاری یہ حسین آنکھیں'' اور ''اُف، دور۔ بہت دُور۔ اُفق کے اس پار'' قسم کے افسانے کیوں لکھتے رہے؟

وہی بات کہ فورٹ ولیم کالج کے منشی صاحبان نے حسن شاہ کے ''نشتر'' جیسا کوئی ناول کیوں نہ لکھا؟

نئی اُردو تنقید آزاد والے ''چار لنگوٹ بند فقیروں'' اور دوسرے مسائل کی جدید روّیوں کے ساتھ توضیح کر رہی ہے اور تنقیدی اصطلاحات، نظریات، روّیے اور Value Judgement کے بیشتر معیار بھی مغرب سے حاصل کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر سموئل جانسن نے آج سے سوا سو (142) سال قبل اپنے ناول ریزیلاس میں حبشی شاعر املاک سے کہلوایا تھا ان کا علم ہمارے علم سے افضل تر کیوں؟ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ بیان نہیں کی جا سکتی کہ یہ مشیّت ایزدی ہے۔''

اگر وہ آج کی صورت حال دیکھتے تو بے حد خوش ہو کر بوزویل سے کہتے، ''دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا۔ I told you so''

اب آخر میں چند باتیں یلدرم کی ذاتی زندگی کے متعلق۔ مشتاق احمد زاہدی نے لکھا تھا ''ان کی ایک خصوصیت کا ذکر کروں گا جو یہ ہے کہ ان کے مضامین یا افسانوں میں آپ کو مصنّف کی ذاتی زندگی کا ذرا سا حال بھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ ان کی قوت تخیل ایسی قوی تھی اور جدّت طبع کا یہ زور تھا کہ ان کو اپنے ذاتی ماحول کو کام میں لانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔''

یلدرم کی ابتدائی زندگی بڑی امید افزا تھی۔ کالج میں انگریزی اُردو فارسی کی قابلیت اور ''قوت تخیل'' کی دھوم، کالج یونین کے سیکریٹری، رائیڈنگ کلب کے بہترین شہسوار، بطور بہترین انگریزی مقرر ہیرلڈ کاکس کیمبرج انعام یافتہ، اخوان الصفا کے رکن۔ انجمن اُردوئے معلّٰی کے بانی۔ بیس بائیس سال کی عمر میں بطور ادب و مصنّف غیر معمولی شہرت۔ بہ عمر 24 سال ایک جونیئر سفارت کار وغیرہ وغیرہ۔ ایسے لڑکوں کو امریکن اصطلاح میں Most likely to succeed کہا جاتا ہے۔ مگر زندگی کے چند Preverse اصولوں کے تحت سجاد حیدر یلدرم کے نسبتاً بہت معمولی ذہنوں کے ساتھ بہ لحاظ Career دنیاوی ترقی کی دوڑ میں ان سے کہیں آگے نکل گئے۔ اور اُردو افسانہ نگاری میں بھی یلدرم وہ مقام نہ حاصل کر سکے جس کے وہ اہل تھے۔ میرے کام کچھ نہ آیا یہ

کمال نے نوازی۔" چاکری کے لق ودق صحرا میں سجاد کے کاروان ادب کا لٹ جانا ہماری زبان و تاریخ کے بڑے واقعات نہیں حادثات ہیں جن سے انقلابی ہندستان کا مورخ عبرت حاصل کرے گا۔" اپنے دوست کی وفات پر قاضی عبدالغفار نے لکھا تھا۔

بقول سر رضا علی" کالج چھوڑنے کے بعد یلدرم انگریزی کے جونیئر لیکچرر مقرر کر دیے جاتے تو انگریزی ادب میں بھی بہت نام پیدا کرتے مگر اس وقت ہندستانیوں کو انگریزی پڑھانے کا اہل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔"

جیسے انگریزی کی لیکچررشپ اس زمانے میں ہندستانیوں کو نہیں ملتی تھی مگر جو شخص نوعمری میں کونسلر سروس اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں سات آٹھ سال تک افسر رہے اس کو اسی محکمے میں کہیں سے کہیں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مگر بقول زاہدی" اس کام میں ہم وطنوں کے گلے کاٹنے پڑتے تھے اور یہ کام سجاد نے کبھی نہیں کیا۔ لہٰذا ان کو نہ خطاب ملا نہ ترقی۔" یلدرم کی قوم پرستی اور قناعت پسندی ہمیشہ ان کی ترقی میں مانع رہی۔

تو یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ سرکاری ملازمت کے بجائے اپنے ساتھیوں مولانا محمد علی اور حسرت موہانی کی طرح عملی سیاست میں حصہ کیوں نہ لیا؟ مولانا محمد علی کا بیان ہے کہ انھوں نے اخبار ہمدرد کی ادارت پیش کی جو یلدرم نے قبول نہ کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یلدرم بنیادی طور پر غیر عملی اور تخیل پرست[22] انسان تھے اور میدان سیاست وصحافت کی تگ ودو دوڑ بھاگ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن بقول خواجہ غلام السیدین مرحوم" سرکاری ملازمت کے ناسازگار ماحول کے باوجود یلدرم کا اپنی ذہنی اور اخلاقی دیانت اپنی گرم جوش انسانیت اور اپنے ذوق ظرافت اور طباعی کو قائم رکھنا" قابل ذکر ہے۔" وہ ہونہار نوجوانوں، ادیبوں اور شاعروں کی بہت ہمت افزائی کرتے تھے۔ جوہر قابل کو ڈھونڈ نکالتے تھے اور اس رشتے میں افسری ماتحتی کا خیال کبھی پر نہ مار سکتا تھا۔ ان کی گفتگو ایک طرف علم وادب کے شوق کو اکساتی ان کی نئی جہتوں میں دلچسپی پیدا کرتی اور دوسری طرف ایسی مخصوص ظرافت اور شوخی سے سننے والوں کے دلوں میں یہ کیفیت پیدا کرتی کہ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔" لکھنے پڑھنے کی حد تک یلدرم نے سیاست میں پس پردہ

آخر وقت تک حصہ لیا۔ زاہدی فرماتے ہیں "یلدرم کی لکھی ہوئی تقاریر بارہا کرسی صدارت سے نشر کی گئیں اور اخبارات میں تعریف کے ساتھ شایع ہوئیں۔ مگر بڑے بڑے جلسوں میں جب جناب صدر اپنی تقریر پڑھتے تھے تو کسی کو کانوں کان یہ نہ معلوم ہوتا کہ اس تصنیف کا مصنف یہ نحیف الجثہ شخص ہے جو ایک گمنام آدمی کی طرح اس مجلس کے ایک کونے میں بیٹھا اس طرح ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے جیسے اس تقریر سے اس کا کچھ واسطہ ہی نہیں۔ اپنے آپ کو گمنامی میں رکھنا۔ "بڑا آدمی" کہلانے سے بھاگنا۔ بڑے آدمیوں کی صحبت چھوڑ کر بے تکلف گمنام دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا ان کے ساتھ خوش طبعی میں خاموشی سے حصہ لینا سجاد حیدر کی ایسی خصوصیت تھی جو بہت کم انسانوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔"

یلدرم کی شدید منکسر المزاجی کے ان کے احباب و معاصرین معترف تھے مگر اسی افتادِ طبع کی وجہ سے مرحوم نے کبھی اشارۃً بھی تحریر یا تقریر یا نجی گفتگو میں اپنی Pioneering ادبی خدمات کا تذکرہ نہیں کیا۔ آج کل کی Hardsell ادبی پبلسٹی اور ادبی تعلقاتِ عامہ کے دور میں یہ چیز بہت ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے۔

یلدرم کی جدت پسندی میں نوعمری کی سیفٹی بائیسکل، اسلامی ممالک میں ریلوے لائن، اُردو ٹائپ وغیرہ سے لے کر واشنگ مشین تک سب چیزیں شامل تھیں۔ مستان خیری فرماتے ہیں "کچھ عرصہ ہوا میرے پرانے مہربان اور مشفق سید سجاد حیدر نے لندن سے ہندستان جاتے ہوئے (برلن میں) غریب خانے کو شرف بخشا۔ اتفاق سے ان کے دوران قیام میں میرے گھر پر کپڑے دھلنے کا دن آیا۔ میں نے ان کو واشنگ مشین دکھلائی۔ دیکھ کر پھڑک گئے کہنے لگے۔ یہ ایک مشین ضرور لے جاؤں گا جس کا ہندستان میں رواج دینا بہت مفید ہوگا۔" (عصمت۔ جولائی 1927 عیسوی)

جب ترکی نے عربی رسم الخط ترک کر کے لاطینی اسکرپٹ اختیار کیا یلدرم نے فوراً نقرہ سے کتابیں منگوا کر خود ہی وہ اسکرپٹ سیکھ لیا اور سارے نئے اخبار اور رسالے وہاں سے منگوانے لگے۔ مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے ایک مسٹر سائمن بوڑھے عیسائی ستار نواز آشیانہ، دہرہ دون

میں نذر سجاد حیدر کو ستار سکھلانے آتے تھے۔ (اس سے قبل مرحومہ نے ایک رامپوری استاد سے ستار بجانا سیکھا تھا جو سماجی لحاظ سے ایک انقلابی اقدام تھا۔ 1906 عیسوی کے ''گراموفون'' کی جگہ ''وائرلیس سیٹ'' لے چکا تھا۔ اور جناب امتیاز علی نے ہوائی جہاز اڑانا سیکھ لیا تھا۔ یعنی یہ پائنیرز پیش قدم لوگ جنھوں نے نئی صدی کے مختلف النوع چیلنج نہایت ولولے سے قبول کیے تھے، اس صدی کے عشرہ چہارم تک دنیا کو ایلیٹ کا خراب آباد تصور کرنے کے بجائے امید پرست تھے) تو مسٹر سائمن ایک دن برآمدے میں میز پر پڑے تازہ اودیانش کو اُٹھا کر دیکھنے لگے۔ آنکھوں کے قریب لے گئے۔ دوڑے گئے اخبار کو الٹا کر کے پڑھنے کی کوشش کی۔ کچھ پلے نہ پڑا تو خاموشی سے اسے میز پر واپس رکھ دیا۔ سوچتے ہوں گے نہ جرمن نہ فرنچ نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی یہ زبان ہے کسی لڑکی۔ ان کو علم نہ تھا کہ ترکی ڈیڑھ سو سال کی ذہنی کشمکش کے بعد اب بالآخر اپنا ناتہ قطعی طور پر مغرب سے جوڑ چکا ہے۔

دوسری جنگ عظیم نے جس طرح ہندستان سمیت ساری دنیا کے منظر نامے کو تہہ و بالا کر دیا اس کے پورے اثرات کا نتیجہ دیکھنے کے لیے یلدرم زندہ نہ رہے۔ قاضی عبدالغفار فرماتے ہیں ''اپریل 1943 عیسوی کی وہ آخری ملاقات مجھے یاد آتی ہے۔ ایک دن کہنے لگے کیوں بھائی یہ کیا بات ہے کہ اُردو زبان میں کوئی دوسرا پریم چند پیدا نہ ہوا۔ میں نے کہا کہ کوئی پریم چند ہو یا ٹیگور یا اقبال۔ یہ نوع تو صرف ایک بار پیدا ہوتی ہے۔ قدرت اپنے شاہکاروں کے پیدا کرنے میں کبھی فیاض نہ تھی۔ ایک غمگین اور تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے۔ ''اے کاش۔'' اور ''اے کاش۔'' کہہ کر رک گئے۔ میں جانتا تھا اس کے بعد وہ کیا کہتے اس لیے گفتگو کا رخ موڑ دیا اور آج مجھے وہ آخری ملاقات یاد آئی تو ان کے وہی الفاظ یاد آئے جو انھوں نے سیل زمانہ کو مخاطب کر کے کہے تھے: ''بہے جا۔ بہائے جا۔ نہ تجھ میں سلامتی۔ نہ تیرے کناروں میں سلامتی۔ مٹے ہوؤں کے نشان مٹائے جا۔ تیرا کوں کو ڈبا۔ غواصوں کو غرق کر۔ یہی تیرا کام ہے۔ بہتر یہی ہے کہ لاتعداد خس و خاشاک کی طرح جو مجھ سے پہلے آئے اور جو بعد میں آئیں گے بہے جاؤں۔!

پر اے سیل زمانہ بہے جا۔ بہائے لے جا۔ اس بحر ناپیدا کنار میں، اس عمان عظیم الشان

میں۔اس اوقیانوس ابد میں،اب، جب، تیرا دل چاہے مجھے گرادے۔"

حواشی:

1. منشی پریم چند سے بھی پہلے سے محترمہ نذر سجاد حیدر مختصر افسانے لکھ رہی تھیں۔عورتوں میں افسانوی ادب کی ابتدا انھوں ہی نے کی ہے ان کے افسانے اکثر وبیش تر حقوق نسواں کی حفاظت اور آزادی نسواں کی حمایت میں لکھے گئے۔ان کے درجنوں افسانوں میں سے جو مختلف رسائل میں شایع ہوئے نصف درجن کے قریب مجموعے شایع ہو سکتے تھے۔لیکن آج تک ایک مجموعہ بھی کتابی صورت میں نہیں چھپا حالاں کہ ان کے ناول بار بار چھپتے اور ہاتھوں ہاتھ نکلتے ہیں" (مولانا نارازق الخیری، ساقی کراچی۔جوبلی نمبر)
2. (زوال بغداد کے بعد مصر کے مملوک حکمرانوں نے ایک پناہ گزین عباسی شہزادے کو برائے نام خلیفہ تسلیم کرلیا تھا۔ 1517 عیسوی میں سلطان سلیم نے مصر پر قبضہ کر کے آخری "عباسی خلیفہ" المتوکل ثالث کو معزول کیا اور خود کو خلافت کا وارث قرار دیا اس وقت سے خلافت قسطنطنیہ منتقل ہوگئی۔
3. جو دراصل یورپین فراک کوٹ تھا۔
4. یہ روی ٹوپی لندن سے امپورٹ کی گئی۔1910 عیسوی کے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ایک شمارے میں اشتہار: کرسٹی۔لندن قیمت مع پھندنا چار روپے آٹھ آنے اسی شمارے میں ایک اور دل دوز اشتہار۔"قرض حسنہ۔بالغرض تعلیم انگلستان آٹھ ہزار روپے کی رقم درکار ہے۔پتہ الف معرفت منیجر انسٹیٹیوٹ گزٹ۔
5. البانیہ تو سے فیصد مسلم لہٰذا یورپ کا پس ماندہ ترین ملک تھا۔
6. 1365 عیسوی میں ینی چیری (نئے عساکر) کے قیام کے بعد آل عثمان میں یورپین خون کی آمیزش شروع ہوئی۔ 1672 عیسوی سے محکوم یورپین اقوام کے منتخب نوعمر لڑکوں کو

مسلمان کر کے بیک تاشی درویشوں کے سلسلے میں بھی شامل کر لیا جاتا تھا۔ پھر وہ ترک لڑکیوں سے شادی کرتے تھے۔ اس وجہ سے ترکی فوک لور میں ان کے آبائی وطن سینٹرل ایشیا کی جھلک کہیں نہیں ملتی۔ مغربی ترکوں میں سے بہت سوں کی مائیں، جارجین، جرکسی، بازنطینی یونانی، ارمنی، سلاو اور اطالوی تھیں جو اپنی روایات ساتھ لائیں۔ عثمانی سلاطین کی مائیں اور بیویاں بھی اطالوی، روسی اور جرکسی تھیں۔ ''والدۂ سلطان'' ہمیشہ ایک نہایت مدبر اور سیاسی معاملات میں دخیل خاتون ہوتی تھیں۔ تیرھویں صدی عیسوی سے ترک شاعرات مقبول تھیں۔

7. سارے اسلامی مشرق کی طرح ترکی میں بھی شاعری تہذیب کا ایک حصہ تھی۔ چونتیس سلاطین ترکیہ میں اکیس اہل قلم اور گیارہ بلند پایہ شاعر گزرے تھے۔ بقول ایک مغربی مبصر یورپ کے کسی شاہی خاندان میں ایسی مثال نہیں ملے گی مگر یہ شعر و ادب دورِ جدید کے لیے بالکل ناکارہ تھا۔

8. یہ قصہ الفانسو دہم نے عرب سے ہسپانوی (Old eastilian) میں منتقل کر دیا اور اولڈ فرنچ اور سلاطینی تراجم کے ذریعے اٹلی پہنچا۔

9. رسالہ ادیب الٰہ آباد (اڈیٹر نوبت رائے نظر) نے 1910 عیسوی کے ایک شمارے میں لکھا ''اردو ناولوں میں مسلمان ہیرو اور ہندو ہیروئن دکھائی جاتی ہے۔ سوائے سرشار کے سارے ناولسٹ مسلمان ہیں۔ انھوں نے اس ہندو جذبے کی بالکل پرواہ نہ کی جو مسلمان ہیرو اور ہندو ہیروئین کے عشق سے پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ مسلمانوں کو یہ اعتراض تھا کہ بنگالی ناولوں میں ہندو ہیرو اور مسلمان ہیروئین کو پڑھ کر مسلمانوں کا خون جوش میں آجاتا ہے۔''

10. اس بے دخل اشرافیہ میں زمین داران چاند پور بھی شامل تھے جن کا ضبط شدہ تعلقہ دار سید احمد خان کو پیش کیا جو انھوں نے قبول نہیں کیا۔

11. شیخ عبدالقادر اڈیٹر مخزن سے سجاد حیدر کی پہلی ملاقات اسی کوٹھی میں ہوئی تھی جہاں

انھوں نے اڈیٹر مخزن کو ''شبلی غمزدہ کو مشق سخن'' کرتے دکھلائے تھے۔ فروری یا مارچ 1898 عیسوی میں سرسید اپنے فرزند سید محمود سے چپقلش کی بنا پر حاجی صاحب کی ''بی بی والی کوٹھی'' منتقل ہوئے اور وہیں 27 مارچ کے روز رحلت فرمائی۔

12. دو مطلوب حسینا کا پہلا صفحہ..... معنون

اپنے محترم استاد اور مربی

جناب آنریبل حاجی اسماعیل خاں صاحب رئیس وتاولی کے نام پر۔ جن کے طفیل سے میں ترکی زبان سیکھنے کی تمنا پوری کر سکا کیونکہ جناب ممدوح نے اپنا حرج اوقات کر کے مجھے سبق دیے۔ میں بہ کمال ادب اس ترجمے کو ڈیڈیکیٹ کرتا ہوں۔

13. رسالہ افسانہ حیدرآباد دکن (مدیر ظفر علی خان) 1902 عیسوی سے شایع ہونا شروع ہوا جو رینالڈز کے قسط وار تراجم پیش کرتا تھا۔ منشی پریم چند نے بھی رینالڈز بہت پڑھا: 1906 عیسوی تک بقول ڈاکٹر قمر رئیس ''رینالڈز کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔'' عبدالحلیم شرر بھی رینالڈز کے شایق تھے۔ ریاض خیرآبادی رینالڈز کے مترجم تھے اور تیرتھ رام فیروز پوری کا ''فسانہ لندن'' از رینالڈز (سترہ جلدیں) بے حد مقبول ہوا۔

14. ایک ترکی ناول 'ہاجرہ' کا بالواسطہ ترجمہ غالباً 1907 عیسوی میں منشی احمد حسین نے کیا تھا جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم نے ترکی کے متعلق ناولوں کے تراجم کا ڈھیر لگا دیا۔ رسالہ افسانہ (لاہور) 1912 عیسوی کی ایک اشاعت میں اطلاع دیتا ہے۔ ''جنگ طرابلس کے پہلے سے زیادہ دردناک منظر اصغر وصبیحہ کی پر درد داستان کا دل خراش حصہ اس شمارے میں سنایا جائے گا۔ اور جنگ ترکی وائٹلی بہ طور ناول سلسلہ وار'' وغیرہ وغیرہ۔ ترکی کے متعلق جاسوسی اور عشقیہ عامیانہ قسم کے ناول اور انگریزی تراجم اُردو میں عرصہ دراز تک مقبول رہے۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ کی فہرست کتب 1940 عیسوی ملاحظہ ہو: مرغ حرم، جلال نوری بے کا ترجمہ۔ جنگ سمرنا از آغا بہار مغوی جہاد ترکی یا محبوبہ انگورہ از احمد

حسین ''اسرارِ حرم یعنی قسطنطنیہ کے خوف ناک خون'' از منشی احمد الدین۔ ''اندرونِ حرم سرائے سلطان۔ قسطنطنیہ کے حالات'' از منشی امیر حسن۔ ''ترکی خاتون۔ ترکی کے متعلق ایک جنگی ناول۔'' سلطان عبدالحمید کے حرم کے اسرار۔ لال کپتان۔ اسماعیل پاشا اور وادی جبل اموہ کی لڑائیوں کے قصے اور عشقیہ کارنامے''۔ از جے نرائن ورما۔ ''مصطفےٰ پاشا اور قریشہ خاتون کے حسرت ناک مصائب'' از مرزا فدا علی خنجر وغیرہ وغیرہ۔

15. (1) A CRITICAL SURVEY OF THE DEVELOPMENT OF URDU NOVEL AND SHORT STORY: LONGMANS, LONDON - 1939

16. مولانا محمد علی جوہر ''خودنوشت'' میں اس دور کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں'' کالج میں البتہ آخری سال میں سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم شعرائے باکمال نے حاجی اسمٰعیل خاں (تربیت الدجاج اور یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریے میں تیار کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ خاکسار، ایک سجاد حیدر، سید وزیر حسن، (تازہ آنریبل اور آزمودہ کار سیکریٹری مسلم لیگ) کے برادر خورد سید اصغر حسن) خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے بعد میں حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔'' (الناظر لکھنؤ، مارچ 191 عیسوی، ص 3)

17. ڈاکٹر سید عبداللہ ''سرسید کا اثر ادبیات اردو پر'' علی گڑھ میگزین، شمارہ خصوصی علی گڑھ نمبر 55-1953 عیسوی۔ 55-1954 عیسوی ص 73

18. پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ سرحدی علاقوں، دیسی ریاستوں اور بیرونی برطانوی مقبوضات کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

19. مصنفہ کا اسی قسم کا ''مکالمہ'' زنانہ ادبی رسالوں کی ضرورت کے متعلق عصمت دہلی شمار اوّل جنوری 1908 عیسوی میں شایع ہوا۔

20. پیر لوتی (1850.....1923 عیسوی) فرانسیسی ادیب جو فرنچ حقیقت نگاری کا مخالف تھا

اس نے مشرق کی سیاحت کی تھی اور مراقش، ٹیونس، عربستان، فلسطین اور ترکی وغیرہ کے متعلق بے حد رومینٹک ناول لکھا تھا۔ ترکی کا وہ بالخصوص بے حد دل دادہ تھا۔ وہ مشرق کی تیز گرم دھوپ کا بے انتہا شایق تھا جو ایک سرد یورپین ملک کے باشندے کے لیے قدرتی بات تھی۔ لیکن حجاب نے بھی اپنے تمام افسانوں، ناولوں اور مضامین میں ''گرم ایشیائی ممالک کی تیز دھوپ اور چمکیلی دوپہروں'' سے اپنی والہانہ شیفتگی کا مسلسل تذکرہ کیا۔

21 اناطول فرانس (1833-1923 عیسوی) کے اس ناول کا ترجمہ امتیاز علی تاج اور مولوی عنایت اللہ دہلوی دونوں نے کیا تھا۔ ہندی ادیب بھگوتی چرن ورما نے بغیر حوالہ اپنے مشہور ناول ''چترلیکھا'' میں ''تائیس'' کا چربہ اتارا۔

22. ایک مرتبہ نذر سجاد حیدر نے جل کر کہا تھا۔ ''اگر آپ کا بس چلے تو ایک ویرانے میں درخت کے نیچے کرسی بچھائے بیٹھے رہیں اور اوپر الو بول رہا ہو۔''

تخلیق کی جمہوریت

(THE DEMOCRACY OF CREATION)

اسلامی ادب کی بحث کو نظر انداز کرتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم ایک ایسے ملک کے شہری ہیں جہاں کی مجلس آئین ساز ریاست کا دستور ایک مخصوص مذہب کے تصورات کے ماتحت تیار کرنے میں مصروف ہے۔ مذہب یا مابعد الطبیعات کی نظریاتی قیل وقال اب محض کتابوں اور خیال آرائیوں تک محدود نہیں رہی بلکہ اسے ایک پورے نظام حیات پر منطبق کیا جارہا ہے۔ اس نظام حیات میں ہمیں اسلام کے اصولوں کے مطابق محض قانون اور تجارت اور اخلاقیات ہی کا تعین نہیں کرنا بلکہ ایک پوری قوم کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز، اس کا فن وادب بھی اسلام کے اس وسیع تصور کے احاطے میں آجاتا ہے اور ہمیں اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔

قیام پاکستان کی بنیادی وجوہات جو بھی رہی ہوں، اس وقت مجھے ان سے بحث نہیں۔ اب ہمیں ایک نئی تہذیب اور ایک نئی ذہنیت کی تشکیل کرنی ہے۔ اس نئے پن کے سلسلے میں چند لازمی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ ان چھ سات کروڑ مسلمانوں نے اپنا ملک علاحدہ

بنایا ہے جن کی اپنی روایات اور اپنا علاحدہ تہذیبی سرمایہ تھا۔ (اس کے ساتھ ہی ساتھ 'پاکستان کی پانچ ہزار سالہ تہذیب' کا قصہ بھی ہے۔ یعنی یہ کہ پاکستان کی تاریخ 1947 یا محمد بن قاسم سے نہیں بلکہ موہن جوڈارو اور ٹیکسلا وغیرہ سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں پر یہ تضاد بھی قابل غور ہے کہ پاکستان کی قومیت کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہے یا جغرافیہ پر) بہرحال۔ تو سوال ہمارے اس تہذیبی سرمائے کا ہے جس کی بنا پر برصغیر کے مسلمانوں نے ایک علاحدہ ملک کا مطالبہ کیا اور جس کی بنیادوں پر ہمیں یہ نیا محل تعمیر کرنا ہے۔

ہمیں یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ اس ''تہذیبی سرمائے'' سے ہماری کیا مراد ہے اور کن عناصر نے اس کی تخلیق میں حصہ لیا۔

تاریخ کی معاشی ترقی کے مختلف ادوار اور مختلف ممالک کا جغرافیہ جس طرح انسان کے گروہوں پر اثر انداز ہوئے ان کے علاوہ جو چیز ایک گروہ کی ذہنی تشکیل کرتی ہے وہ انسان کے گروہ کا خدا کا تصور بھی ہے اور جس طرح انسان مسلسل ایک دَور سے دوسرے دور ترقی کی طرف بڑھتے رہے، تمدنی اور ارتقا کی ان مختلف Stages میں خدا کا تصور بھی لازمی طور پر کارفرما رہا۔ اس تصور کا مادی یا تخیلاتی یا روحانی پس منظر کیا تھا۔ کس طرح مختلف مذاہب کے فلسفوں نے جنم لیا ایک الگ اور بہت طویل داستان ہے۔ ہمیں اس وقت غرض اس بات سے ہے کہ ادب نقاشی سنگ تراشی، موسیقی ان سب چیزوں پر مختلف قوموں کے مذاہب کا تصور طرح طرح سے اثر انداز ہوتا رہا۔ مغربی یورپ میں یہ کیتھولک کلیسا تھا۔ انگلستان کے ادب میں ریفریشن کی تحریک کی صورت میں اس کا اظہار ہوا۔ اسی طرح ہندستان میں فنون لطیفہ اور مذہب ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ بنگال میں چنڈی دیوی کے پرستاروں نے ادب کی تخلیق کی۔ دوآبے کی سرزمین میں بھگتی کی تحریک سامنے آئی۔ ہندستان کے دوسرے خطوں میں مسلمان صوفیائے کرام نے ملک کے باشندوں کی ذہنی کلچر کی تربیت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ایک نظریہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے فرقوں کے درمیان پائدار اور نظری اتحاد خصوصاً اس لیے ناممکن تھا کیونکہ دونوں فرقوں کا نظریۂ کائنات (WELTANSCHAUUN) ایک

دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ اس نظریے کے متعلق بحث کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ یہ سب بہت بعد کی ہیں۔ اب جبکہ پاکستان اور ہند تہذیبی اور مذہبی حیثیت سے دو جداگانہ حقیقتیں قرار دیے جا چکے ہیں ہم کو اسی موجودہ صورت میں حالات کا تجزیہ کرنا ہے۔

اب خدا اور مذہب کے ایک مخصوص تصور کا اطلاق ایک پوری ادبی روایت پر کیا جا رہا ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کی یہ روایت اُردو روایت ہے۔ (مشرقی پاکستان اور بنگالی ادب کا معاملہ ایک اور بحث طلب مسئلہ ہے) اور یہ اُردو روایت جس شکل میں پاکستان تک پہنچی اس کے پس منظر میں ایک پوری سماجی تاریخ موجود ہے۔ اس روایت میں میرؔ و غالبؔ کے علاوہ نظیرؔ اکبر آبادی بھی ہیں اور امانتؔ بھی اور سرشارؔ اور پریم چندؔ بھی۔ سرشارؔ اور پریم چندؔ کے نام پر خیال آیا کہ میں یہاں ہندو شاعروں اور ادیبوں کی فہرست گنوا کر ان کا اُردو پر یا اُردو کا ان پر احسان جتانا نہیں چاہتی۔ یہ ایک بے حد خیر سائنٹیفک رویہ ہے۔ اسلام، اور ہند کی مقامی تہذیب کے رضا کارانہ اشتراک اور پُر امن امتزاج نے جس طرح ایک نئے تمدن، ایک نئی روایت اور سب سے بڑھ کر ایک نئی زبان کو جنم دیا وہ تہذیب اور لسانیات کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد اور عظیم الشان واقعہ ہے۔

اس کے علاوہ، ہماری موجودہ ادبی روایت کے اندر جغرافیائی اور سماجی وجوہات کی بنا پر، وہ سارے عناصر موجود ہیں جو شمالی ہند اور خصوصاً دوآبے کے ایک مخصوص ماحول کی وجہ سے اس میں داخل ہوئے۔ ورنہ یہ ایک اور تضاد ہوگا کہ ہم ہیں تو اب بلوچستان اور سندھ کے باشندے اور ادب اور زبان کے معاملے میں پیروی کرتے پھریں لکھنؤ اور دہلی کی۔ یا امانت کی ''اندر سبھا'' کا جو ذہنی اور جذباتی پس منظر ہے وہ دوآبے والوں کے لیے تو ایک خاصے کی اور مقامی دلچسپی کی چیز ہو سکتا ہے لیکن وہ اسلامی اور پاکستانی ادب کس طرح ہو گیا۔

چنانچہ اب ہمارے سامنے یہ راستہ آیا کہ ہم اُردو ادب کو ایڈیٹ کریں اور اس سرمائے کو موجودہ تقاضوں اور تصورات کے لحاظ سے اسلامی بنائیں۔

اور اگر آپ اسلام کے ثقافتی ورثے ہی کو لیتے ہیں تو اس میں صرف ہندستانی مسلمانوں

کی خالص اسلامی تمدنی روایت کی تخصیص کیوں۔ ساری دنیا کے اسلام کا ثقافتی ورثہ ہمارے لیے موجود ہے اور اپنی نئی تہذیب کی تشکیل کے لیے برصغیر کی سرحدوں سے پار اُس طرف مشرق وسطیٰ اور ادھر یورپ میں انڈونیشیا وغیرہ کی طرف بھی ہمیں نظریں اٹھانی لازمی ہیں تاکہ اپنی موسیقی، اپنے آرٹ اور اپنے ادب کے لیے ہم اسلامی تمدن کی وسیع تر برادری سے خوشہ چینی کریں۔

لیکن یہاں پر ایک اور بنیادی تضاد ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ان سارے اسلامی ممالک کے آرٹ وغیرہ کا تصور تو اسلامی رہا لیکن فارم پر جغرافیہ اور قومیت کا اثر پڑا۔ یعنی تصور اسلامی رہا لیکن فارم قومی ہو گیا اور اس کی تشکیل ان کے اپنے اپنے قومی مزاج اور روایت نے کی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندستان کے مسلمانوں کی روایت کا فارم اور مزاج خالص عجمی نہیں رہا تھا بلکہ ہندی ہو گیا تھا۔

یہاں پر خواہ مخواہ مجھے اسرائیل کا خیال آ گیا۔ دنیا کے کونوں میں بھٹکتے پھرنے والے یہودی جو ہر ملک میں صدیوں تک ایک انتہائی تکلیف دہ ذہن اور جذباتی الجھن میں مبتلا رہے۔ ان کے سامنے ہمیشہ یہ DIVIED LOYALTIES کا مسئلہ تھا۔ آیا وہ یہودی پہلے ہیں اور جرمن اور فرنچ اور انگریز بعد میں۔ یا وہ جرمن اور فرنچ اور انگریز پہلے ہیں اور یہودی بعد میں۔ انھوں نے یورپ کے ہر ملک میں رس بس کے ان ملکوں کی تہذیب کو اپنی ذہنی کاوشوں سے مالا مال کر دیا۔ وہ یہودی کہلاتے رہے لیکن ان کی تخلیق کی ہوئی موسیقی اور آرٹ اور ادب جرمن موسیقی اور فرنچ آرٹ اور اطالوی ادب کہلایا۔ پھر انھوں نے اسرائیل قائم کیا تاکہ وہ جائز اسرائیلی موسیقی اور جائز اسرائیلی آرٹ اور جائز اسرائیلی ادب کی خالص یہودی تعمیر کر سکیں۔ وہ پچھلے چند سال سے اس تعمیر میں مصروف ہیں۔ لیکن اس خالص اسرائیلی تہذیب کے بجائے پھر جرمن اور فرنچ اور اطالوی یا برطانوی وفاداریاں ان کے لاشعور میں کسی چور دروازے سے دوبارہ داخل ہو رہی ہیں۔

یہ تو خیر ایک برسبیل تذکرہ قسم کی بات تھی جس کا اصل مضمون سے کوئی تعلق نہیں، میں ذکر دراصل کرنا چاہتی تھی ادیبوں کی ذہنی وفاداری اور ادب کی اسلامی اور غیر اسلامی تخصیص کا۔

ہمارے یہاں اسلام اور مشرق کے عظیم ترین شاعر، علامہ اقبالؒ کے ساتھ ساتھ قاضی نذرالاسلام کو بھی پاکستان کے ذہن و دماغ کا سمبل سمجھا جاتا ہے۔ نذرلؔ دابہت عظیم شاعر اور فن کار ہیں۔ وہ کالی دیوی یعنی شکتی کے جوشیلے اور عقیدت مند پجاری رہ چکے ہیں اور ساتھ ہی انھوں نے رسولؐ اللہ کی شان میں نعتیں بھی لکھی ہیں۔

تو مطلب کہنے کا یہ ہے کہ اسلامی ادب کی روایت کو کہاں سے شروع کیا جائے گا اور اس کی کیسی حدیں مقرر ہوں گی؟

ہمیں مصوری و موسیقی پر بھی ان نئے اصولوں کا اطلاق کرنا ہوگا۔ جمالیات اور اسلام کے درمیان جو رشتہ ہے اس کا مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ مسلمان یعنی وہ قومیں جو مذہباً مسلمان تھیں اور جو اسپین، شمالی افریقہ، ایشیائے کوچک، مشرق وسطیٰ، ہندستان اور انڈونیشیا میں بستی تھیں ان کی AESTHETICS کی روایت اور اسلام کی AESTHETICS میں کون کون سے اقدار مشترک تھیں۔ کہیں وہ ایرانی صورت گر جنھوں نے اطالوی مصوروں کی طرح ان گنت تصویریں رسولوں پیغمبروں اور اماموں کی بنا ڈالیں وہ امیہ اور عباسی خلفا جن کے حکم سے فقط امراؤ اور سارا میں بازنطینی روایت والے فریسکوز تیار کیے گئے کہیں یہ مسلمان 'کفر کے پرستاروں' کے اس زمرے میں تو نہیں آتے جن کا ذکر آفتاب احمد صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس لحاظ سے تو اسلامی روایت بے حد روادار ہے۔ پھر ہمیں کس بات کا خوف ہے۔ ہم ادب میں ملا ازم تھوڑا ہی چاہتے ہیں، اسلام چاہتے ہیں..... یعنی یہ کہ جب مسلمانان عالم کا تہذیبی پس منظر ایسی آفاقی اور کیتھولک روایات کا حامل رہا ہے تو پھر ہمیں محض لفظ اسلامی پر کیا اعتراض ہے—؟؟

پھر یہ بھی تو آپ کہتے ہیں کہ صاحب اگر ہم نے ادب اور مذہب کا ذکر ایک ساتھ کر دیا تو مخالفین ہماری جان کو آجاتے ہیں۔ آخر دیکھیے ادھر مغربی یورپ میں ادیبوں کے امام اور انٹیلکچوئلز کے سپہ سالار مہارشی ایلیٹ اور مہاگرو ایذرا پاؤنڈ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ بھی تو اپنی ہر نئی تصنیف میں ادب میں مذہب کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا تفصیل سے تذکرہ کرتے ہیں۔

تو صاحب بات یہ ہے کہ یہاں ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ وغیرہ کے متعلق مجھے بھی کچھ عرض کرنے کی اجازت دیجیے۔

آج کل یہ طے شدہ امر ہے کہ جہاں اسلامی ادب کی بات چلی فوراً ایلیٹ کا حوالہ دے دیا جاتا ہے کہ دیکھیے صاحب ہم آپ کس گنتی میں ہیں۔ اس آسمانی صحیفے میں جس کا نام ''تہذیب کی تشریح'' ہے ایلیٹ نے فرمایا ہے۔ چونکہ ہمیشہ کی طرح آج بھی (اور بالخصوص آج کل) مغربی یورپ اور انگلستان کے ایک مخصوص مدرسہ فکر کے نقاد اور فلسفی ہمارے ذہنی اور روحانی رہنما رہے ہیں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ ان گروؤں کا تذکرہ کرتی چلوں۔

انگلستان میں اس وقت ادب کی کیا حالت ہے۔ جس کا اہم اتنا ذکر کرتے ہیں۔ وہاں نثر اور شاعری میں جدیدیت کی تحریک اب نصف صدی سے زیادہ پرانی ہو چکی ہے۔ فرانس میں انیسویں صدی کے آخری بیس سالوں میں سمبلوم کی تحریک شروع ہوئی جس پر جرمن فلسفیوں کا گہرا اثر تھا۔ انھوں نے آرٹ کو سوسائٹی کے دیگر علوم اور تخلیقی عمل سے بالکل الگ کر کے ایک علاحدہ شاخ بنا دیا جس طرح بودیلیئر نے ان سے ذرا قبل آرٹ کو اخلاقیات سے بے نیاز کر دیا تھا۔

لیکن ادب میں ایک دور میں بھی دو مختلف دھارے ساتھ ساتھ بہتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی حقیقت پسندوں نے جن میں M. TAINE اور نفسیات، سوسیولوجی، ارتقائی حیاتیات اور تاریخ کے طالب علم ان کے دوسرے ساتھی شامل تھے، سوسیولوجی کے نقطۂ نظر سے آرٹ کا جائزہ لیا۔ سمبلوم کے علم برداروں کے یہاں، جو کائٹ، شیلنگ، ہیگل پنہار اور واگنر سے متاثر تھے۔ ان کے یہاں سارا معاملہ وجدان، جذباتی تجربوں اور الہامی کیفیتوں پر آن کر ٹھہر گیا تھا۔

اس تحریک نے انگلستان کے ادب کو ایک نئے موڑ پر ڈالا۔ یہ خالص شاعری کا دوسرا دور تھا۔ پہلے رومانی دور کے علمبردار ورڈزورتھ کورج شیلے اور کیٹس تھے۔ اس دوسرے دور میں ہم کو یورپ میں ملارمے، رلکے اور انگریزی ادب میں ایلیٹ اور ایٹس کے نام نظر آتے ہیں۔ ایڈگر ایلن پو اس تحریک کے پیش رو تھے۔ جرمن رومان پرست اس کے فلسفی اور والٹر پیٹر اس کے نقاد۔ اسی خالص شاعری کی تشریح میں بودیلیئر نے کہا تھا:

"ALL THE ARTS ASPIRE TO A CONDITION OF MUSIC"

(ایلیٹ کی شاعری اس ضمن میں خصوصیت سے قابلِ مطالعہ ہے) اور یہاں سے انگلستان میں جدید شاعری کی روایت شروع ہوئی لیکن یہ دھارا ایک لخت سطح پر نہیں آ گیا تھا۔ اس کے پس منظر میں جان ڈون اور سترھویں صدی کے دوسرے میٹافزیکل شاعر شامل ہیں۔ انیسویں صدی کے جی ایم ہوپکنز ہیں۔ پھر ایمس سامنے آئے۔ اس صدی کے شروع کے چند برسوں میں IMAGIST شاعری کا زور ہوا جبکہ 1912 سے 1922 میں ایک ہزار شاعروں نے دو ہزار مجموعے اپنے اپنے کلام کے شایع کروائے۔ ایمس، ایلیٹ، ایذرا پاؤنڈ اور ڈاکٹر ایڈسٹ ڈیل نے انگریزی شاعری کی جدید روایت کو ایک منظم اور باقاعدہ تحریک بنا دیا۔ ایلیٹ کا ویسٹ لینڈ ایک پورے دَور ایک پوری تہذیب کا مرثیہ ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کی دنیا تھی جس کی اقدار نے خودکشی کر لی تھی اور جن کے سارے پرانے چراغ ایک ایک کر کے گُل ہوتے جا رہے تھے۔ (آج بھی مغرب میں اسی ذہنی بے اطمینانی اور مایوسی کا دَور دَورہ ہے اور ایلیٹ آج بھی اسی طرح اپنا فرض ادا کر رہے ہیں جو مغرب کی تاریخ کے اس دَور نے ان کو سونپا ہے)

پھر 1929-1930 کے دَور میں جدید تر شاعروں کا گروہ پیدا ہوا جو واضح طور پر ایک آئیڈیولوجی کے گرد جمع ہوئے۔ یہ جدید انگریزی شاعری کا خوبصورت ترین زمانہ ہے۔ لیکن آج کل خود اس دَور کے شعرا اسے اپنے ''ایام جہالت'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پھر دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں چند سپاہی شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے ریوپرٹ بروک کی یاد تازہ کی۔ یہ سب بہت دل فریب اور سکون بخش باتیں تھیں۔ ان لوگوں نے اسپین کی خانہ جنگی میں بین الاقوامی دستے کا ساتھ دیا تھا۔ انھوں نے مغربی یورپی ذہنی بے اطمینانی، خوف اور بے چارگی کے دَور کی عکاسی کی تھی۔ لیکن زیادہ تر ان شاعروں کا رویہ جذباتی تھا۔ چنانچہ اب وہ یوگا، نروان اور کیتھولک مذہب کے چکر میں جا پڑے ہیں۔ جنگ کے دوران ہی میں حقیقت پسندی کی جگہ رومانیت کی تجدید شروع کر دی گئی تھی۔ ان نوجوان شاعروں کے مختلف گروہوں نے اپنے آپ کو طرح طرح کے نئے اور انوکھے ناموں سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ ان لوگوں میں ڈائلن ٹامس

تھے۔ ٹیرنس ٹلر تھے، ایل یوٹیس اور جان ہیتھ اسٹبس تھے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد انھوں نے ان وجوہات کی طرف سے آنکھیں موند لیں جن کے سبب عالم گیر امپریلزم کے دور کی یہ ہولناک لڑائی دنیا کے سارے محاذوں پر لڑی گئی تھی۔ انھوں نے کہا جو آدرش ہم نے اپنے ذہنی انڈر گریجویٹ قسم کے زمانے میں اپنایا تھا وہ تو اپنی موت ہی مر گیا۔ ہمارے سارے دیوتاؤں کے پاؤں مٹی کے نکلے۔ کتابیں لکھی گئیں جن میں اسٹیفن اسپینڈر وغیرہ نے پرائیویٹ کے طور پر اعتراف کیا کہ اب تک انھوں نے جھک ماری تھی۔ ان کی آنکھیں تو اب جا کر کھلی ہیں۔ سرد جنگ کے محاذ پر یہ سب باقاعدہ اور باضابطہ طور پر ایک طرف کو آ گئے۔ ایلیٹ نے ادب میں بھی بازنطینی مسیحی MYTH کی تجدید کی تھی اسے نظموں ناولوں اور خصوصاً منظوم ڈرامے کے ذریعے آگے بڑھایا گیا۔ اس میں بھی ایلیٹ پیش پیش ہیں۔ ان کے بعد کرسٹفر فرائی، نارمن نکلسن، این رڈلر وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ ان لوگوں نے قرونِ وسطیٰ کے ذہنی اور جذباتی ماحول کو دوبارہ زندہ کیا اور معاشرے کے مسائل کو گھما پھرا کے پھر کلیسا کے سامنے لا ڈالا۔ انسان اور اس کا ازلی گناہ، جرم و سزا جبر و اختیار، انسان کی انفرادی آزادی، روح اور مادّے کی کشمکش وغیرہ ان تمثیلوں کے موضوع بنتے گئے۔ گرہم گرین اس وقت وہاں کے سب سے بلند پایہ ناول نگار ہیں اور وہ زندگی کے رومن کیتھولک نظریے کی نمائندگی میں جٹے ہیں۔ یہ رومن کیتھولک نظریہ یورپ کے جدید فلسفے میں شامل ہے۔ فرانس میں گبریل مارسل کا دور دورہ ہے۔

ویسے انگلستان میں آج کل وہی ادبی جمود طاری ہے جس کی پاکستان میں اکثر شکایت سنی جاتی ہے۔ شاعری واعری اب نہ کوئی پڑھتا ہے نہ کرتا ہے۔ ''نیو رائٹنگ'' بند ہو چکا۔ ٹیرنس ٹیلر ایک دفعہ شکایت فرما رہے تھے کہ پبلشرز بہت کم پیسے دیتے ہیں۔ شاعری کا بازار اتنا گرم نہیں رہا جتنا جنگ کے زمانے میں تھا۔ میں نے عرض کی آپ کے یہاں آج کل قومی ملکیت کا بہت چرچا ہے۔ ویلفیئر اسٹیٹ کا زمانہ ہے۔ کوشش کیجیے کہ پبلشنگ ہاؤس بھی NATIONALISE کر دیے جائیں۔ بگڑ گئے۔ کہنے لگے جانے دیجیے آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ اس طرح تو ذہنی REGIMENTATION ہو جائے گا۔

ٹیرنس ٹیلر کے علاوہ اور جتنے بھی ادیبوں سے مایوسی اور احساسِ شکست کے اس موضوع پر میں نے بات کی..... یہ عظیم فن کار جنھوں نے پچھلے بیس سال میں جدید انگریزی ادب کو ایک نئی زندگی ایک نئی شان بخشی تھی..... وہ سب یہی کہتے رہے کہ اب زندگی میں کیا رکھا ہے۔ دنیا تباہ ہو رہی ہے۔ وغیرہ۔

پھر NIHILISM کے فلسفۂ خود وجودیت کا آزادی کا تصور ہے۔ جو سارتر نے پیش کیا تھا۔ (یادش بخیر) جس میں انسان، تنہا فرد، ماحول سے بے نیاز ہو کر، ماحول سے اوپر اُٹھ کر آفاق کا جائزہ لیتا ہے۔ فرد جو ہجوم سے علاحدہ ہے اور جو انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ اور یہ آئیڈیلزم نہیں بلکہ ایک فلسفہ انقلاب ہے جس میں فرد سوسائٹی سے بلند ہو کر اسے تبدیل کرتا ہے ـــــ اس سلسلے میں فلسفہ مادیت اس لیے بکواس ہے کہ اس سے انسان کی آزادی کے اس مابعد الطبیعاتی تصور میں خلل واقع ہوتا ہے۔ مغربی یورپ کے موڈرن فلسفے کے پس منظر میں شیلنگ ہیں، کولرج ہیں اور سینٹ آگسٹین ـــــ پھر گبریل مارسل کی مسیحی خود وجودیت ـــــ ان فلسفیوں کے نزدیک حقیقت کا ادراک محض لمحے کے وجدان کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا دُنیا کے مستقبل کے متعلق منصوبے بنانا بالکل بے کار ہے۔

اور انسان دوستی کا تصور بذاتِ خود خاصا قابلِ غور ہے۔ ہیومنزم کی تحریک نے مغربی یورپ میں کتنے چراغ جلائے۔ اس کی روشنی میں علم والوں نے کتنی ترقی کی ـــــ لیکن آج ہمیں اس موڑ پر پہنچ کر یہ فیصلہ بھی کرنا ہے کہ ہمارا انسان دوستی کا تصور کیا ہے۔ کیا یہ ای ایم فارسٹر کی انسان دوستی ہے، سارتر کی انسان دوستی، انارکزم کی انسان دوستی، لینن کی MILITANT ہیومنزم۔ یا اسلام کی ہیومنزم۔ یہ بہت اہم چیز ہے۔ کیونکہ مذہب کے فلسفے کی طرح اس تصور میں بھی حسبِ ضرورت لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔

انیسویں صدی کے انگریز ناولسٹوں، بالذاک، ٹالسٹائی اور فرانس کے انیسویں صدی کے مادہ پرستوں کے یہاں اگر آئیڈیلزم اور حقیقت پرستی ساتھ ساتھ نظر آتی ہے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ یہ تضاد اس وقت زندگی کے ہر شعبے میں موجود تھا۔ لیکن آج 1954 میں جب جدید فلسفے کے علم بردار اس طرح کی باتیں کرتے ہیں تو کچھ پلّے نہیں پڑتا کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے۔ ان

ادیبوں، شاعروں اور فلسفیوں نے اپنے اپنے CULT بنا لیے ہیں۔ جن میں بیٹھ کر وہ کلچر اور LIESURE کے باہمی تعلق پر بحث کرتے ہیں۔ یہ عام لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے۔ ان میں سے اکثر کا تو یہ کہنا ہے کہ جمہوریت نے جب سے تعلیم عام کی ہے بڑے آدمی پیدا نہیں ہوتے۔ آرٹ صرف رائل اکیڈمی والوں کی میراث ہے۔ یا پیرس کے بائیں ساحل کے باسیوں کی۔ عام لوگوں کے لیے سنیما کے رنگین اشتہار کافی ہیں۔ ویسے یہ سریلزم، ڈاڈاازم، فیوچرزم وغیرہ کا چکر بھی خاصا دقیانوسی ہو چکا ہے۔

پھر ان شخصی فلسفوں میں شروع سے آخر تک قدم قدم پر تضاد نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ ہم شخصی آزادی کے علم بردار ہیں جو انسانیت کی آزادی ہے۔ اور فرد انسانیت سے ماورا رہے۔ اجتماعیت کا نظریہ غلط ہے۔ محض گروہ COMMUNITIES ہونی چاہئیں۔ (یہاں گاندھی وادیوں کو خوش ہونا چاہیے کہ انارکسٹوں میں ان کو اپنے ہم نوا مل گئے)۔ کہیں آئیڈلزم کی بُرائی کی جاتی ہے اور کہیں خود وجودیت کو ہی بے حد PRAGMATIC سمجھا جاتا ہے۔

سوشل فلسفوں کی حیثیت سے ان موشگافیوں سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ ان کے یہاں تو ابھی یہ ہی طے نہیں ہو پایا کہ مساوات کا جو تصور عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا وہ صحیح ہے یا نطشے کی باتوں کو مانا جائے اور برگساں نے کہا ہے کہ دھن میں مختلف سُر ہوتے ہیں جن کے اُتار چڑھاؤ کے بغیر موسیقی ممکن نہیں اور یہی چیز قانونِ کائنات ہے۔ لہٰذا انسانی مساوات بھی ناممکن ہے۔

ایلیٹ کو سب سے بڑی فکر آج کل یہ ہے کہ تہذیب برباد ہو رہی ہے۔ تہذیب، سے ان کی مراد کیا ہے۔ یہ عالم گیر انسانیت کی تہذیب نہیں جس کی ہمیں اور آپ کو سبھی کو پریشانی ہونی چاہیے —— یہ ان کے الفاظ میں واضح طور پر مغربی یورپ کی مسیحی تہذیب ہے —— پچھلے دنوں اس سلسلے میں لوئی مک نیس نے ''ہم کو کیا کرنا چاہیے'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے —— جس میں وہ کہتے ہیں:

1930 تا 1939 کے دَور کے ادیبوں کے سامنے جب یہ سوال آتا تھا تو ان کے پاس

ایک بنایا جواب موجود تھا۔ ہمارے پاس سماج کا شعور ہونا لازمی ہے۔ اگر ہمارے پاس یہ شعور موجود نہ تھا تو گویا ہم فراری تھے۔ یہ لوگ بے چارے ایک بڑے زبردست دھوکے میں مبتلا تھے۔ ان کا 'سماجی شعور' سوسائٹی کا ایک بے حد تنگ نظر اور انسانیت کش تصور تھا۔ جس میں افراد کے باہمی تعلقات، مذہبی وفاداریوں اور جغرافیائی اور ملکی بندھنوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن آج ہم اس بھولپن اور اس بچپنے کی رجائیت سے چھٹکارا پا چکے ہیں۔ اب افراد کی عزت ہمارے دلوں میں دوبارہ جنم لے رہی ہے۔ جسے ہمارے پچھلے سماجی نظریوں نے بالکل طلاق دے دی تھی۔ ہمارے دل میں دنیا کے لیے وہ احترام بھی دوبارہ پیدا ہو رہا ہے جسے ہر نظریۂ کائنات WORLD-VIEW آسانی سے فراموش کر دیتا ہے۔ WORLD VIEW ایک TEUTONIC شے ہے۔ ہم انگریز ہمیشہ سے EMPIRICIST رہے ہیں اور اس شخص کے مقابلے میں جسے سارے سوالوں کا جواب معلوم ہے، ایک EMPIRICIST کے ہاں پرواز تخیل کا فقدان ہے ـــــ لیکن سارے مسائل کا حل معلوم کر لینا تخیل کی موت ہے۔ ہیگل اور مارکس دونوں بے حد تخیل پرست تھے۔ لیکن ان کے تخیلات ایک عام آدمی اور ایک فن کار دونوں کی سمجھ بوجھ اور پہنچ سے باہر تھے اور دنیا ان کے نظریۂ کائنات سے نجات حاصل کرنا چاہے گی۔ حالانکہ شروع میں ان کے اس WORLD VIEW نے دنیا کی توہین کی ہے اور اسے نقصان پہنچایا ہے۔

آگے چل کر وہ بتاتے ہیں کہ ایک انگریز کا بہ حیثیت ایک مسیحی اور ایک انگریز کے کیا عقیدہ اور کیا ایمان ہونا چاہیے۔

اسی طرح ادب اور ادبی نظریوں میں برطانوی قومیت، برطانوی ماضی اور روایات کی اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے۔

حال ہی میں دو شاندار ادبی اور تہذیبی رسالے ENCOUNTER اور CONFLUENCE کے نام شایع ہونا شروع ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلا ''آزادیٔ تہذیب کی کانگریس'' کی طرف سے انگلستان میں شایع ہوتا ہے۔ اسٹیفن اسپنڈر اس کے ایڈیٹر ہیں۔ دوسرا ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ ان رسالوں کو پڑھیے بہت سے اسرار

ورموز کا انکشاف ہو جائے گا۔

عقلی بنیادوں پر تخلیق کیے ہوئے ادب کی مخالفت کس طرح رفتہ رفتہ سو فیصدی ری ایکشن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مغربی یورپ کے ادیبوں کی موجودہ حالت دیکھ کر اس کا اندازہ ہمیں آسانی سے ہو سکتا ہے۔

ہمارے یہاں پاکستان میں ترقی پسندوں نے اپنی بعض عجیب و غریب پالیسیوں کی وجہ سے ری ایکشن کو تقویت پہنچائی۔ ایک طرف ادب برائے ادب رفتہ رفتہ ادب برائے حکومت بن گیا۔ دوسری طرف ادب برائے زندگی یا ترقی پسند ادب سمٹتے سمٹتے اتنا SECTARIAN ہوا کہ ادب برائے کمیونسٹ پارٹی ہو کر رہ گیا۔

پھر ایک تیسری آواز بلند کی گئی۔ یہ اسلامی ادب کا نعرہ تھا۔ ان لوگوں نے ترقی پسندوں کی ضد میں ادب برائے ادب والوں کی طرح ری ایکشن کے کیمپ کو اور مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ یہ حضرات اسلام کے ورثے کا ذکر کرتے ہیں لیکن ابن خلدون ابن سینا اور ابن رشد جیسے RATIONALISTS کو غالباً فراموش کر دینا چاہتے ہیں اور یہ سوچ کر ذرا پریشانی ہوتی ہے کہ اسٹیفن اسپنڈر وغیرہ کی طرح کیا ہمارے چند لکھنے والے بھی عقلیت پرستی سے دُور ہٹتے جائیں گے۔ ویسے اللہ کے فضل و کرم سے تحریک احیائے اخلاقی کا دفتر تو یہاں بھی قائم کیا جا چکا ہے—— اسلام کے متعلق جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، ابھی تک یہ ہی معلوم نہ ہو سکا اسے کون سے تصور ادب میں رائج کیا جائے گا۔ ''اسلام جس کی رو سے غزلیں تک خلافِ شرع ہیں۔ یا وہ اسلام جس نے امیر خسرو اور خواجہ معین الدین چشتی جیسے شاعر پیدا کیے۔

تو قصہ مختصر یہ کہ میری ناقص عقل کے مطابق تو یہ اسلامی ادب کا مسئلہ بہت گنجلک دکھلائی پڑتا ہے۔ ویسے اب تک ہمارے یہاں ترقی پسند ادب اور اسلامی ادب اور متحدہ محاذ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہم میں سے بعض کے نزدیک یہ بحث طلب مسائل ہی نہیں اور اسلامی ادب اور ترقی پسند ادب کا جھگڑا ہی بہت بعد از وقت ہے کیونکہ جس رخ پر اب تاریخ کا بہاؤ ہے وہ خود بہ خود اپنا راستہ تیار کرتا جا رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو ادب اور

سیاست کے متعلق سائنٹفک طریقے سے سوچنا چاہتے ہیں۔

اور ویسے 'انسان دوستی' یا 'اسلام کی صوفی روایات کا احترام تو بہت دُور کی بات ہے آج کل اگر ہم لوگوں میں اٹھارھویں صدی والی لبرل ازم ہی آجائے تو بہت غنیمت ہے۔

آخر میں ایک اقتباس پر اس مضمون کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔ ملاحظہ کیجیے۔

''یہ سب کس قسم کے انسان کے لیے؟ اور کیا کچھ؟ اور ابھی اور کیا آنا باقی ہے؟ ہم بچوں کی طرح پوچھیں گے۔ اور پھر کوئی تھکی ہوئی آواز جواب دے گی۔ جلدی کیا ہے۔ ابھی ذرا ٹھہرو۔ اور بے کار کے سوال نہ پوچھو۔ اور ہم دریافت کریں گے۔ یہ انسان جس کے لیے ہم نے اتنا دُکھ اُٹھایا یہ کیسا ہوگا؟ کیا یہ خوش ہونا جانتا ہوگا۔ اس میں جذبات کا مادّہ ہوگا۔ اس اندرونی لگن، ان صدموں کو سہارنے کا اہل ہوگا جو روح کی اصل دولت ہیں؟ ہاں! اس میں یہ سب باتیں ہوں گی—— لیکن اس کی خوشی، اس کی بشاشت، اس کا جوش و خروش، اس کے دل کی لگن، اس کے دُکھ سکھ، یہ سب کا ہے کے لیے ہوں گے؟ اس انسان کا دوسرے انسانوں سے کیا رشتہ ہوگا؟ کیا وہ خلوص اور محبت اور پائیداری دوستی کے احساسات کا مالک ہوگا۔ کیا وہ دوسرے سے مختلف اپنی علاحدہ شخصیت کا حامل ہوگا۔ کائنات، آفاق کی وسعت، وقت، اس کے اپنے وجود، موت کی آمد، کے متعلق اس کے احساسات کیسے ہوں گے؟ تاریخ کے ادوار، انسانیت، ہمارے اپنے زمانے اور مستقبل کے متعلق وہ کس طرح سوچے گا؟ کیا وہ آرٹ میں زندہ رہے گا؟ اور اس کی تخلیق کر سکے گا؟ اور بہر حال، وہ آرٹ کیسا ہوگا؟ ہاں، اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ روح کی گمبھیرتا۔ اس کی لطافت کو بھی باقی رکھ سکے گا؟ اپنی اور دوسرے کی زندگی، ساری انسانیت، ساری کائنات کے وجود کی پکار اور اس کی آواز بازگشت کو محسوس کر سکے گا؟ اس کا جواب دے پائے گا؟

''اور جب ہم یہ سب کہتے ہوں گے تو وہی تھکی ہوئی آواز اب ہم سے سوال کرے گی—— ''لیکن یہ سب آخر کا ہے کے لیے؟'''' یہ سب اس لیے کہ انسانیت کے باہمی تعلقات ایک بہت اونچی سطح پر پہنچ سکیں۔ تاکہ انسان دنیا کو فتح کرنے کے بعد اپنے آپ کو نہ کھودے''۔ ہم مضبوطی سے جواب دیں گے۔

اور وہ تھکی ہوئی آواز کہے گی ـــــ ''اچھا تو تم اپنے ان سوالات کا جواب دینے کے لیے بیٹھ کر کوئی یوٹوپیا والا ناول لکھتے رہو۔ میرے نزدیک تو تمھارے سوالات کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ (۱) اشتراکیت کے دَور میں زندگی کے مسائل۔ (۲) اور اُس دَور کی انفرادی نفسیات۔ لیکن بے کار میں سر کھپاتے ہو۔ دولت پیدا کرنے کے ذرائع نئے انسانی تعلقات اور نئے حالاتِ زندگی کا تعین کرتے ہیں اور اسی کا اثر انسان کی نفسیات پر پڑتا ہے ـــــ وجود شعور کا تعین کرتا ہے ـــــ اور بس ـــــ اللہ اللہ خیر صلا۔''

یہ سُن کر ہمیں غصہ آجائے گا اور ہم کہیں گے ـــــ اور انسانیت نے کیا کبھی آج تک زندگی کے دھارے کو محض اس کی راہ بہنے دیا تھا؟ اور کیا بالآخر آج وہ وقت نہیں آن پہنچا جبکہ اس دھارے کو صحیح راستے پر ڈالنے کی شعوری کوشش کی جائے؟ مستقبل کے انسانی تعلقات کے متعلق اور خصوصاً مستقبل کے انسان کی شخصی اور روحانی زندگی کے متعلق کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے ـــــ؟ فرد اور جماعت کے نئے بندھنوں کے بارے میں سوچا جائے ـــــ؟..... لیکن کوئی جماعت، آرگنائزیشن، یا اکیڈمی از خود ایک مصنوعی تہذیبی فردوس کی تخلیق نہیں کرسکتی ـــــ..... کسی ایسے خمیر کا وجود نہیں ہے جس سے اس دَور کی اخلاقیات، جمالیات وغیرہ کے بنے بنائے پُتلے تیار کر لیے جائیں ـــــ یہاں پر آرٹ کو اپنا عمل شروع کرنا ہے ـــــ اور زندگی کے محافظ دستے کے ساتھ سفر کرنا ہے۔''

کیا یہ ہربرٹ ریڈ تھے؟

کیا یہ گبریل مارسل تھے؟

جی نہیں۔ جن صاحب نے یہ مضمون لکھا ان کا نام I. KATAEV ہے۔

اور ویسے، ژاں پال سارتر کے معتقد حضرات آج کل جانے کیا کرتے ہوں گے ـــــ؟

وعلیکم السّلام۔

(نقوش، مارچ 1954)

کیا موجودہ ادب رُو بہ تنزّل ہے؟

عام طور پر جدید اردو افسانے کی ابتدا 1936 عیسوی سے کہی جاتی ہے لیکن 1938 عیسوی میں تو پریم چند کا انتقال ہوا۔ پریم چند کا افسانہ موضوع سماجی دیو مالا اور کردار نگاری کے لحاظ سے بے انتہا جدید تھا۔ ممکن ہے طرز بیان کے اعتبار سے نیا نہ رہا ہو۔ اور یہ خالص ہندستانی افسانہ تھا۔ اس وقت تک اردو میں روسی، انگریزی اور فرانسیسی کہانیوں کے ترجمے کیے گئے تھے اور ملک کے متوسط طبقے کی زندگی کی جھلک فن کارانہ طور پر محض بنگالی افسانہ نگاروں نے پیش کی تھی۔ مجموعی طور پر ہمارا افسانہ۔ سوا چند ایک ناموں کے۔ خاصا بے جان تھا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''لندن کی ایک رات'' اور ''انگارے'' نے اچانک ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ 36 عیسوی سے لے کر 47 عیسوی تک اور تقسیم کے بعد سے لے کر آج تک کے افسانوں کے بارے میں اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ مجھے وہی سب باتیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ''جمود'' کے مسئلے پر بھی ان گنت مضامین لکھے گئے ہیں۔ بار بار یہ سوال اٹھایا جا چکا ہے کہ اس ملک میں اچھا ادب کیوں نہیں تخلیق کیا جا رہا؟ یہ صحیح ہے کہ پچھلے بارہ سال میں چند ایک اچھے افسانے بھی لکھے گئے ہیں۔ 55 تک تو خیر منٹو ہی زندہ تھے۔ رہے 47 سے پہلے کے افسانہ نگار تو غلام عباس جب بھی لکھتے ہیں بہت اچھا

لکھتے ہیں۔ ہاجرہ اور خدیجہ کا ہر افسانہ تر شاتر شایا اور مکمل ہوتا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں جیلانی بانو کے علاوہ (جن کا تذکرہ میں آگے کروں گی) صرف تھوڑے سے نام ہی کوئی اہمیت حاصل کر سکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ گنتی کے یہ چند ادیب کب تک گاڑی چلائیں گے؟

ساری دنیا میں ہر زبان میں ہزاروں کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ ان میں سے سب ہی اچھی نہیں ہو سکتیں مگر جاپانی قوم، فرانسیسی قوم، امریکن قوم، اطمینان کے ساتھ کہہ سکتی ہے۔ ''یہ ہمارا آج کا ادب ہے'' ہم اپنے آج کے ادب کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں؟ ہم ایسے موقعوں پر اپنا سارا پرانا کچا چٹھا سنانے بیٹھ جاتے ہیں۔ یلدرم، سلطان حیدر جوش، ل۔ احمد اور نیاز صاحب نے یہ لکھا۔ 36 عیسوی میں یوں ترقی پسند آئے۔ یوں ان کا عروج ہوا، یوں زوال اور آخر میں ٹیپ کا بند اب یوں جمود طاری ہو گیا۔ اچھے افسانے کیوں نہیں؟ کیا کریں صاحب! جمود طاری ہے۔ اللہ کی قسم! اس لفظ کی گردان سنتے سنتے دم بولا گیا۔ اے لیجیے اب ''نقوش'' نے ''جمود نمبر'' شایع کر دیا۔ اب سال کے سال یوم جمود بھی منایا کیجیے۔

جدید مغربی ادیب نے کیوزم کی ناکامی کے بعد نئے تصوف کو اپنا لیا مگر وہاں ریلزم ختم ہوئی تو نیو ریلزم بھی شروع ہو چکی ہے۔ ہمارے یہاں ریلزم ختم ہوئی، ترقی پسندی ختم ہوئی کسی نئے رجحان، جان دار تحریک نے جنم نہ لیا۔ انٹ سنڈ جو جس کے جی میں آ رہا ہے لکھ رہا ہے یا پھر لکھتا ہی نہیں۔ عسکری صاحب کے ایسے لوگ بھی ہیں جو نروان کی اس بلندی پر پہنچ گئے ہیں کہ اب کچھ کہہ کر ہی نہیں دیتے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ان حضرات (اختر رائے پوری، احمد علی وغیرہم) کی خاموشی پر اب تک اتنے صفحے سیاہ کیے گئے ہیں جن کا حجم ان مصنفین کی ادبی تخلیقات سے زیادہ ہی ہوگا۔ گویا لکھنے والے بھی موجود ہیں رسالے بھی دنا دن چھپ رہے ہیں مگر سب کے سب مل کر جمود ہی کے متعلق لکھنے پر جٹ گئے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ موضوع کا اس قدر فقدان ہے کہ اب صرف اسی فقدان پر لکھا جا رہا ہے۔

اسے معرفت کی آخری اسٹیج کہتے ہیں۔

اس مرتبہ بھی نقاد لوگ دریائے جمود میں غوطہ زن ہو کر ایسے ایسے آب دار موتی برآمد کریں گے کہ مجھ جیسے جاہل چیٹ لوگوں کے سامنے چودہ طبق روشن ہو جائیں۔

ہر ملک میں ادب کا ایک عظیم عہد ہوتا ہے جو ناسازگار حالات کے باوجود تخلیق کیا گیا اور بعض مرتبہ انھی ناسازگار حالات کی وجہ سے پیدا ہوا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جنگ چھڑی یا کوئی قومی کرائسس آیا تو قوم کی قوم ایک طرف کو ڈھل گئی۔ یونیورسٹیاں بند کر دی گئیں۔ چھاپے خانوں اور لائبریریوں میں تالے پڑ گئے، کتابیں ردّی میں بیچ دی گئیں دماغوں کو کھنگال کھنگال کر خالی کر دیا گیا ادیبوں نے قلم رکھ دیے، کہ بھائی گھمسان کا رن پڑا ہے، لکھیں کیا خاک؟ کل کلاں کو ہم بمباری سے مر جائیں گے۔ شاعری اور افسانہ نویسی چھتر پہ رکھیے ہمیں تو اپنی جان عزیز ہے۔

اس کے برعکس ہوا یہ کہ شہروں میں آگ لگتی رہی۔ عظیم الشان میوزیم، آرٹ گیلریاں اور کتب خانے جل کر خاک ہو گئے ملک کے ملک تہ و بالا ہو گئے مگر لکھنے والا اسی طرح لکھا کیا۔ وہ محاذ پر لڑا، جلاوطن ہوا، جیلوں میں بند کیا گیا، گولی سے اڑا دیا گیا، مگر وہ سچا فن کار تھا تو اس نے پھانسی کے سائے میں بیٹھ کر بھی لکھا۔ ورنہ یورپ کے پچھلے دو ہزار سال جس قدر تباہی کے گزرے ہیں وہاں تو ایک کتاب بھی نظر نہ آتی لیکن ذہنی اور سیاسی انقلابات، روحانی بے اطمینانی، اقتصادی کساد بازاری کے ہر دور میں ادیب کو جو کام اس کے معاشرے نے سونپا تھا وہ اس نے پورا کیا۔ تاریخ کے ہر بھونچال نے ادب میں ایک جگمگاتے دور کا اضافہ کیا۔ کہیں پرانے بت توڑے گئے کہیں نئے صنم کدوں میں گم شدہ بت لا کر سجا دیے گئے۔ رزم و بزم، ہر جگہ ادیب اپنے لوگوں کے ساتھ ساتھ رہا، چاہے وہ خانقاہوں میں بیٹھا تھا، چاہے وہ درباروں میں قصیدے لکھ رہا تھا خواہ وہ جیلوٹین پر جا رہا تھا، ہر حالت میں بہر صورت اس نے اپنا تاریخی رول ادا کیا۔

دور کیوں جایئے آپ کے پڑوسی میں ایک ملک چین نامی کئی ہزار سال سے آباد ہے۔ وہاں کے باشندوں نے اپنی ساری تاریخ میں جس قدر دکھ جھیلے ہیں ان کا اندازہ ہم آسانی سے نہیں کر سکتے۔ اب سے چند برس ادھر کی بات ہے کہ ان کے فوجی دستے محاذ پر جانے کے لیے آگے آگے چلتے تھے اور ان کی یونیورسٹیاں خچروں پر کتابیں لادے پیچھے سفر کرتی تھیں۔ جہاں

لڑنے بھڑنے سے فرصت ملی، کسی خندق یا کھوہ میں بیٹھ کر لکھنا پڑھنا جاری ہو گیا۔

مغرب میں قرونِ اولیٰ کی رزمیہ داستانیں، عشقیہ شاعری، مسیحی تصوف، پر تکلف شائستگی، نشاۃ ثانیہ کا سارا ادب، ریفارمیشن کے زمانے کا جرمن لٹریچر فرانس کا عہد زریں، عقلیت پرستی، انقلاب فرانس، وکٹورین دور، روسی روایت صنعتی انقلاب کے بعد کا ناول، تجدید رومانیت، ناروے کا حقیقت پسند ڈرامہ، آئرلینڈ کی شاعری، فرانس کی جدید تحریکیں، پہلی جنگ عظیم، ڈپریشن اسپین، سوشلسٹ ریلزم، امریکہ کی وسیع کینوس کا عظیم ناول، ۴۵ کے بعد کا سارا جدید تر ادب یہ سب کس طرح تخلیق کیا گیا؟ کیا ان سب کے لیے حالات سازگار تھے؟ خود ہمارے یہاں سلطنت مغلیہ کے زوال نے اردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ برصغیر کی ساری جدید زبانوں کی نثر کی نشوونما اس زمانے میں ہوئی جب ملکی حالات قطعی آئیڈیل نہیں تھے۔ 1857 عیسوی سے لے کر 1947 عیسوی تک ہم نے بھی وہ وہ تھپیڑے کھائے کہ عقل درست ہو گئی اور اسی نوے سال میں ہمارا ادب اس مقام پر پہنچا جہاں ہم نے اسے 47 عیسوی میں چھوڑ دیا اور آنکھیں موند کر ایک طرف کو ہو بیٹھے۔ کبھی کبھار پبلک کو اطلاع دے دی۔ خواتین حضرات! جمود طاری ہو گیا۔

اب ذرا باہر کی دنیا میں ادب کی ترقی پر غور کیجیے اور اس اطلاع کی نزاکتوں پر جائیے تو سر دھننے کو جی چاہے گا۔

وجوہات تو بہت سی ہیں مگر چند ایک کا ذکر اس مضمون میں کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ بارہ سال گزر گئے پر ابھی تلک سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ یہ میں کوئی آفاقی سطح پر بات نہیں کر رہی ہوں، محض اپنے گرد پیش کا اندازہ لگا کر میں نے محسوس کیا کہ جس طرح ہم اپنے متعلق سنجیدہ نہیں اسی طرح اپنے ادب کے سلسلے میں بھی لاپرواہیں۔ بنیادی حقائق اور مسائل سے بے نیازی اسی ذہنی کاہلی اور بے تعلقی کا نتیجہ ہے جو شدید مایوسی کے بعد پیدا ہوتی ہے لیکن اس مایوسی کے بعد کچھ کرنے کی لگن کیوں نہ ہوئی؟ اس کا جواب آپ خود دیجیے اس کے ذمہ دار ملک و قوم نہیں آپ خود ہیں۔ آپ میں نہ ہمت ہے نہ تخیل، لگن کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ابھی دنیا کے بہت سے معاملات طے ہو رہے ہیں۔ اُونٹ ذرا ایک کروٹ بیٹھ جانے دو اس کے بعد ہم لکھیں گے۔ اس

کے بعد آپ کیا لکھیے گا؟ یک طرفہ کارروائی ہو جانے کے بعد کیا آپ اپنا سر لکھیے گا؟

دعوے تو آپ کو بہت ہیں۔ ہم اعلیٰ کچ ئیل ہیں (بہت ہیبت ناک لفظ ہے) ہم معاشرے کا ضمیر ہیں، ہم میر و غالب و حالی و اقبال کے وارث ہیں، تہذیب کے محافظ ہیں (وغیرہ وغیرہ) اپنے آپ کو "ادیب" کہلا کر پھولے نہیں سماتے مگر جو حالت ہے وہ یہ ہے:

غلامی کے عہد میں دارالمصنفین اعظم گڈھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، انجمن ترقی اردو نے ہزاروں کتابیں لکھ ڈالیں۔ تحقیق، تنقید، ترجمہ کیسے کیسے شاعر پیدا ہوئے۔ صاحب طرز نثر نگار، چوٹی کے اسکالر۔ ترقی پسند مصنفین کو تو چھوڑیے ان کو تو برا کہنا اب فیشن میں داخل ہے کہ یہ لوگ گمراہ اور دہریے تھے مگر اللہ والے مسلمانوں نے بھی کیا کچھ نہیں لکھ ڈالا۔ بچوں کے لیے جامعہ ملیہ نے کیسا لٹریچر چھاپا۔ خود زنانہ ادب کا ایک پورا کتاب خانہ "عصمت" اور "تہذیب نسواں" نے تیار کر دیا۔ "عصمت" اور "تہذیب نسواں" کے نام پر مسکرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کو آج ہم رجعت پسند سمجھ لیں مگر اس عہد میں انھوں نے مسلمان عورتوں میں لکھنے پڑھنے کا ذوق عام کرنے کی بڑی زبردست خدمت انجام دی۔ اس وقت عورتوں کے لیے کتنے اعلیٰ درجے کے رسالے نکلتے ہیں؟ بچوں کے لیے کتنی کتابیں لکھ گئی ہیں؟ کلاسیکس پر کتنا کام ہوا ہے؟ تخلیق ادب میں ہم نے کون سے جواہر پارے پیش کیے ہیں؟ اب اگر اردو میں نئی نئی کتابیں چھپواتا ہے تو مکتبہ فرینکلن، نیویارک۔

تقسیم کے بعد کچھ کم بلند پایہ ادیب تو ادھر نہیں آئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ پریشان حال ہیں انھیں ذہنی یکسوئی میسر نہیں، تو غیر منقسم ہندستان میں یہ لوگ کہاں کی گورنری کر رہے تھے؟ بلکہ اب تو زیادہ تر لکھنے والے اقتصادی لحاظ سے 47 عیسوی سے پہلے کے مقابلے میں کئی گنا بہتر حالت میں ہیں۔

صورت حال فی الحال یہ ہے:

ایک روز خاندان کی ایک کم سن لڑکی نے جس کی ساری ذہنی نشوونما پہلے امریکن کومکس کی اور اب انگریزی کتابوں کی مرہون منت اور اردو میں پاکستانی بچوں کے لٹریچر کی حد تک اس کا

مطالعہ ''بھوپت ڈاکو کی باتصویر سوانح حیات'' اور روزنامہ جنگ اور انجام کے بچوں کے صفحات تک محدود ہے۔ مجھ سے پوچھا۔ ''کوئی اردو کتاب ایسی بتایئے جسے پڑھ کر میں اردو سیکھوں۔''

میں نے ہڑبڑا کر بہت سے نام گنائے

''یہ سب تو کورس میں ہیں''

''اچھا تو کرشن چندر پڑھو۔''

''وہ تو ہندو ہے۔ کوئی اچھا سا پاکستانی رائٹر بتایئے خالہ اتنی۔!''

''اچھا تو بیٹا! تم وہ پڑھو۔ کیا نام ہے اس کا۔''

میں آج تک اس کا نام سوچ رہی ہوں!

قاضی عبدالغفار، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، یہ سب کسی اور دنیا کے باسی ہیں، کسی اور معاشرے کی بات کرتے ہیں۔ یہ پندرہ سالہ ذہین لڑکی آج کا ''پاکستانی رائٹر'' پڑھنا چاہتی ہے اور پھر بور ہو کر امریکن یا انگریزی کتابوں کی طرف واپس لوٹ جاتی ہے۔ ذہنی طور پر یہ نئی نسل یک لخت اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ اسے آسانی سے بہلایا نہیں جا سکتا۔

دفتر میں اکثر ہمارے پاس باہر کے ممالک سے فرمائش آتی ہے 47 عیسوی کے بعد کے پاکستانی ادبا عیسوی کی بہترین کہانیوں کا انتخاب بھیجیے ہم جدید ایشیائی ادب کی انتھالوجی شایع کر رہے ہیں۔ لیجیے پھر کے وہی ''ہماری گلی'' وہی ''آنندی'' وہی ''ہتک''۔ تہی دامنی کی بھی حد ہونی چاہیے (اور یہ ساری کہانیاں بھی تقسیم سے قبل لکھی گئی تھیں۔)

کئی اچھے خاصے ادیبوں کو سستی جرنلزم نے مارا۔ (فلم میں یہاں اتنے نہیں گئے، اگر گئے بھی تو ان کے چلے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ پہلے بھی کوئی تیر نہیں مار رہے تھے) چند ایک ادیب لوگ کہتے ہیں کہ میاں اردو میں کیا رکھا ہے، میں تو اب انگریزی میں ناول لکھنے کی فکر میں ہوں۔

تو کارز میں رانکو ساختی۔

یوں برس کے برس ادبی جائزوں میں فیکٹریوں کی سالانہ رپورٹ کی طرح ناموں کی

بارات کی بارات لے لیجیے (معلوم نہیں اس مضمون کو پڑھ کر مجھ پر کتنا حملہ بھیجا جائے گا)۔

تکنیک سے بے توجہی کا یہ عالم ہے کہ "بڑے" پندرہ سال قبل جو راستے بھاگ گئے تھے ان پر نہایت پابندی، سعادت مندی اور فرماں برداری سے چلا جا رہا ہے۔ اسے بھی چھوڑیے، کوئی ایک رسالہ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس میں دس افسانوں میں سے پانچ اس طرح شروع ہوں گے۔ اور علیہ کرسی پر سے اٹھی۔ اور بارش ہونے لگی۔ اور چراغ جلتا رہا۔ اور آسمان پر خوش الحان چڑیاں اُڑ رہی تھیں۔ اور

ہماری اس کم مائیگی کی کچھ وجہ تو ضرور ہوگی۔ اب بغاوت کیوں نہیں کی جا رہی ہے؟ بغاوت وہ نوٹ ہے جس سے مختصر کہانی کی ابتدا ہوئی۔ روایت سے باغی ہونا اور روایت کو ساتھ ساتھ رکھنا، ان دونوں دھاروں سے ادب بنتا ہے۔ ہمارے یہاں نثر کی روایت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ روایت ہم نے مغرب سے مستعار لی۔ بغاوت بھی مغرب ہی کے زیر اثر کی۔ اس کے بعد ہم خرافات میں کھو گئے۔

امریکہ کی جنگ آزادی میں برطانیہ ہار گیا تھا۔ ہندستان کی جنگ آزادی میں برطانیہ جیتا۔ ہمارے ادبی ارتقا کی خوبیوں اور کمزوریوں کی کڑیاں اسی حقیقت سے جا کر ملتی ہیں۔ امریکہ نے اپنی فتح کے بعد برطانیہ سے کٹ کر اپنا فلسفہ عملیت تیار کیا۔ اپنے محاورے، اپنی دیومالا، اپنا نظریہ زندگی۔ اپنی شکست کے بعد ہم محض برطانوی خیالات کی جگالی کرتے رہے اور آج تک کر رہے ہیں۔ ہمارے اپنے ادب کی دیسی نشو ونما رک گئی اور ہم کولونیل ملک کی حیثیت سے برطانیہ کے پیچھے پیچھے گھسٹتے رہے۔ حکمرانوں کے اشارے پر اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا ہوا جس کی وجہ سے زبان وادب کی ترقی میں اور زیادہ روڑے اٹکے۔ ہم نے انگلستان کے ادب سے بہت کچھ حاصل کیا مگر حکمرانوں کی نسلی برتری کے تعصب کی وجہ سے انگریزی ادب میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکے۔ آسٹریلیا، کینیڈا، جنوبی افریقہ اور آئرلینڈ کے ادیب کو تو انگریزی روایت میں شامل سمجھا گیا مگر نیگور اور سروجنی نائیڈو کو دوسرے درجے کے ادیبوں کے خانے میں جگہ ملی۔ آج کل بھی جان ماسٹرز کی بکواس کو سراہنے والے لاکھوں ہیں لیکن برصغیر کا کوئی ادیب جو انگریزی میں لکھتا ہے اس

کے ناولوں کو ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ کے تبصروں میں چار پانچ سطروں میں ٹال دیا جاتا ہے۔ احمد علی کا ذکر بھی جو ایک آدھ جگہ ''اینگلو انڈین لٹریچر'' کے زمرے میں آ گیا ہے وہ اس لیے کہ ان کو ای۔ ایم فارسٹر کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ حال میں نوجوان ہندستانی شاعر ڈوم موریز (فریڈک موریز کا لڑکا) کو البتہ بے انتہا پسند کیا گیا ہے مگر اس کے لیے بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ روحانی اور ذہنی طور پر وہ انگریز شاعر ہے، ہندستانی نہیں۔ فرانسیسی نسلی تعصب سے قطعاً واقف نہیں (الجیریا کی جنگ کے پس منظر میں اس حقیقت کو دیکھیے تو بے حد عجیب معلوم ہوتا ہے) مصر کے محمود تیمور اور دوسرے مصنفین جو فرانسیسی زبان میں لکھتے ہیں ان کے ناول پیرس میں چھپتے ہیں اور انھیں فرنچ روایت میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ خیر یہ تو بقول شخصے جملہ معترضہ تھا۔

تو ذہنی افق تو وسیع ہو گیا، تخلیقی صلاحیتیں بھی بے پایاں تھیں مگر نہ جانے کس طرح ہم اردو میں وہ عظمت پیدا نہ کر سکے جو اس خوب صورت زبان کا پیدائشی حق تھا۔ چونکہ سرکاری زبان انگریزی تھی اس لیے اردو جدید تقاضوں کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہی اور اس میں وہ خود اعتمادی نہ آ سکی جو چالیس کروڑ انسانوں کی لنگوا فرینکا کی حیثیت سے اس میں ہونا چاہیے تھی۔ ہمیں اپنی انگریزی دانی پر بڑا فخر تھا مگر ہمارے آقا اسے بابو انگلش کہہ کر اس پر مسکراتے تھے (جس طرح ان سے پہلے کائستھوں کی فارسی کا مسلمان مذاق اڑایا کرتا تھے) لہٰذا قومی ادب وہیں کا وہیں رہا۔

کسی اور ملک میں یہ حالت ہے؟ جاپانی، مصری، ایرانی، ترک سب ہی فخریہ اپنی اپنی زبانیں بولتے ہیں۔ ہم ہیں کہ انگریزی کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مغرب کے سیاسی اقتدار کے دور میں اور یورپ سے جغرافیائی قرب کی وجہ سے مشرق وسطیٰ نے فرانسیسی کو اپنی کلچرل زبان کے طور پر اختیار کر لیا تھا مگر اب زمانہ بدل چکا ہے۔ قوم پرستی کے جوشیلے عہد میں مشرق وسطیٰ کے ممالک اپنی اپنی زبانوں کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں۔

ہمارے یہاں نہ ڈرامہ پنپ سکا نہ تھیٹر بنا (جس ملک میں آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے یونان جیسا ترقی یافتہ تھیٹر موجود تھا) نہ ناول کی روایت قائم ہوئی۔ مختصر یہ کہ شکتی اور وسعت اردو

میں نہ آئی۔ آرٹ اور ادب کی جدید تنقید کے لیے بے شمار اصطلاحات ہیں جن کا اردو نعم البدل ہمارے پاس آج تک موجود نہیں اور یہ وہ زبان ہے جو دیوناگری اور عربی رسم الخاط کے فرق سے قطع نظر چینی اور انگریزی بولنے والوں کے بعد دنیا کی آبادی کا تیسرا حصہ استعمال کرتا تھا۔ دنیا کی تیسری بڑی زبان۔! صرف ایک صنف ادب ایسی تھی (یہاں میں نثر کا ذکر کر رہی ہوں۔ شاعری اس پوری بحث سے خارج ہے) جس کے بل بوتے پر ہم نے اپنا سر اونچا کیا اور ہندی، مرہٹی، گجراتی، بنگالی، تامل اور تیلیگو، افسانہ نگاروں سے کہا "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ نے اردو افسانے پڑھے ہیں؟"

اس اردو افسانے پر آج اوس پڑ چکی ہے اور اس کی مرثیہ خوانی کی غرض سے مدیر "نقوش" کی دعوت پر ہم آج اس محفل میں جمع ہوئے ہیں۔

اس مسئلے پر ذرا تفصیل میں جائے بغیر کام نہیں چلے گا کہ اس وقت ہمارا اور ہمارے افسانے کا ایک دوسرے سے کیا رشتہ ہے اور اس افسانے کے سوسائٹی اور باقی ساری دنیا سے کسی قسم کے تعلقات ہیں!

میں نے ابھی "بڑوں" کا ذکر کیا تھا۔ یہ "بڑے" بیدی، کرشن، عصمت، غلام عباس، منٹو، حیات اللہ انصاری، آسمان سے نہیں اترے تھے، نہ ان کے سروں کے گرد نور کے ہالے ہیں۔ مگر یہ سنجیدہ اور پرخلوص فن کار تھے۔ آج کل محض دفع الوقتی کی خاطر لکھا جا رہا ہے یا زندگی سے وہ رابطہ قائم نہیں کیا جا سکا جو لیکھک کو کائنات کا ترجمان بناتا ہے۔

اس دور میں ساری دنیا کو ایک Myth کی تلاش ہے۔ ہر زمانہ، ہر ادب، ہر رویہ اپنے لیے ایک Myth ڈھونڈھ لیتا ہے۔ پاکستان کو یہ اب تک نہیں مل سکا۔ 47 عیسوی سے پہلے والوں کے پاس یہ Myth موجود تھا۔ 45 عیسوی کے بعد کے مغربی ادیب بھی اسی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ رلکے اور کافکا اور لورکا اور ہوپکنز کو اپنے سمبل مل گئے تھے۔ ڈپریشن کے زمانے سے لے کر ہسپانوی خانہ جنگی تک ادیبوں نے اپنے سمبل تلاش کر لیے تھے اور ان کی خاطر اپنی جانیں تک دیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانس میں سارتر اور کیمو نے ایک دوسری قسم کے اساطیر تراشنے

شروع کیے۔ سارتر اب انسانیت کو ایک بالکل دوسرے رخ سے پرکھ رہا تھا۔ ایلیٹ نے اپنے Four quartets میں سمبلو کی ایک پوری دنیا آباد کر کے رکھ دی۔ ڈی لن طامس اور ایڈتھ سیٹ ویل دونوں الگ الگ علامتوں کے خالق ہیں۔ آرٹ میں جدید انسان کی طرف سے یہی فرض ڈالی، پالی کلی، گرہم، سدرلینڈ اور ہنری مور نے ادا کیا۔

ہمارے یہاں 36 عیسوی کے بعد سمبل مل گئے تھے اور ان میں بڑی توانائی اور گمبھیرتا تھی۔ اس وقت یعنی 1959 عیسوی میں کچھ حضرات اسلام میں یہ Myth تلاش کر رہے ہیں۔ غالباً ان کا کہنا یہی ہوگا کہ مغرب کے جدید تر ادیبوں نے مادہ پرستی، حقیقت پسندی اور مشینی تہذیب کے خلاف بغاوت کر کے روح اور صلیب کو اپنا آدرش بنایا ہے، کیوں نہ ہم اپنی روح میں اپنا حل ڈھونڈھیں۔ یہ آواز دس سال قبل 49 عیسوی میں بھی بلند کی گئی تھی۔ پچھلے دس سال میں ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے اور اب از سر نو بات وہیں سے شروع کی جا رہی ہے۔ پچھلے برسوں میں جو مایوسی طاری ہوئی اس کی وجہ سے میر کے الم سے اپنے الم کو مماثل کیا گیا۔ انتظار حسین کے کردار اس دور کے ترجمان ہیں۔ میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو ہمارا بیش تر ادب نوسٹلجیا کا ادب ہے اور اس کی یہ خصوصیت 47 عیسوی کے بعد بالکل لازمی اور جائز اور حق بجانب ہے۔ انتظار حسین اور شوکت صدیقی دونوں کے کردار علاحدہ علاحدہ مختلف قسم کے سمبلو ہیں اور بے حد حقیقی ہیں لیکن ان دونوں افسانہ نگاروں نے اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی پچھلے دس سال میں جو کچھ لکھا ہے اس کے باوجود ہم نہیں کہہ سکتے کہ مجموعی طور پر پاکستان میں افسانے کا رجحان کس طرف ہے، پاکستان اور ہندستان کی تخصیص اس لیے کہ جیلانی بانو جس طرح کی کہانیاں پیش کر رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ''روشنی کے مینار''۔ ''آگ کے پھول''۔ ''جگنو اور ستارے''۔ یہ کہانیاں پاکستان میں نہیں لکھی جا سکتی تھیں۔ آندھرا پردیش کی نئی عوامی زندگی، سیاسی شعور، حیدرآباد کی دم توڑتی ہوئی تہذیب ان حقیقتوں کی پرخلوص اور خوب صورت عکاسی صرف جیلانی بانو کا کمال ہے۔ ''روشنی کے مینار'' میں یہ پڑھیے۔

''اخبار بیچنے والا لڑکا زور زور سے چیخنے لگا۔ اس کے پاس کوئی گھٹیا سا اخبار تھا مگر ایک

آنے میں اچھا اخبار بھی تو نہیں مل سکتا۔

''اخبار بیچنے والا لڑکا اب بھیک سی مانگ رہا تھا جیسے یہ اخبار آج نہ بکے تو ایک قیامت خیز طوفان آجائے گا۔'' ٹرین الٹ جائے گی، ایک اور خوفناک جنگ شروع ہو جائے گی جس کی بنیاد یہ اخبار بیچنے والا لڑکا رکھے گا۔ یہ اخبار خرید لو ورنہ میں تمھیں اپنا دوسرا روپ دکھاؤں گا۔ اخبار تمھیں قطعی خرید لینے چاہیے ورنہ کل کی ہیبت ناک خبروں کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

رہیں عصمت چغتائی تو وہ جہاں بھی ہوتیں اسی طرح چیر پھاڑ کرتی رہتیں۔ (عصمت کے ذکر پر خیال آیا کہ اگر یہ بی بی لکھنے کے بجائے محض اسکول پڑھا رہی ہوتیں یا محض خانہ داری کر رہی ہوتیں تو آج اردو افسانے کی کیا کیفیت ہوتی)

میں ادب میں مردوں اور عورتوں کی تفریق کی قائل نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ میرا بائی، جین آسٹین اور ورجینا وولف کی مانند کوئی مرد کبھی نہ لکھ سکتا تھا۔ اردو کے نئے افسانے میں ایک نئی جہت کا اضافہ رشید جہاں اور عصمت چغتائی کی شرکت سے ہوا۔ یہ شرکت بھی اس بغاوت کا ایک لازمی پہلو تھی جس کا ذکر میں پہلے کر چکی ہوں۔ اس دور میں رشید جہاں اور عصمت کا پیدا ہونا اتنا ہی لازمی تھا جتنا کرشن چندر اور منٹو کا۔ وہ زمانہ اب گزر چکا تھا جب عورتیں محض موضوع سخن ہوتی تھیں دوسروں کو موضوع سخن بنانے کی ہمت نہ کر سکتی تھیں۔ جن دنوں عصمت کی کہانیاں پہلے پہل چھپیں، فضا پر شدید رومانیت چھائی ہوئی تھی۔ یہاں تک چند حضرات نے ''طاہرہ دیوی شیرازی'' کو ایجاد کیا اور ان فرضی بیگم صاحبہ کی طرف سے افسانے لکھے گئے یا پھر حجاب امتیاز علی کی مادام زبیدہ اور خاتون روحی اور کاؤنٹ لوٹ کی عمل داری تھی۔ اس میدان میں عصمت ڈٹ کر اسنبھالے اُتریں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں تلخی تھی، طنز، غصہ (یہ بات معنی خیز ہے کہ اس زمانے میں ان ترقی پسند افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کے عنوان ''چوٹیں'' اور ''چرکے'' ہوتے تھے) نئی مسلمان عورت کی یہ تلخی حق بجانب تھی۔ کیونکہ وہ اس سوسائٹی میں پیدا ہوئی جو اس مغربی دنیا سے سو سال پیچھے تھی جہاں کی زبان اور ادب اسے پڑھایا گیا۔ گو میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اکیڈیمک تعلیم نے عصمت کا کچھ نہ بگاڑا۔ علی گڑھ گرلز کالج میں پڑھ کر کیلس پر سر دُھننے کے بجائے انھوں نے

''پردے کے پیچھے'' لکھ ڈالا۔

پردے کے پیچھے۔ یہ ان نئی افسانہ نگار خواتین کا خاص میدان تھا۔

عورت کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی دنیا مختصر ہے لہٰذا وہ اس کے بارے میں زیادہ بصیرت سے لکھ سکتی ہیں۔ ورجینا وولف نے ایک جگہ کہا ہے:

''مردوں کی بنائی ہوئی دنیا میں فٹ بال میچ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور فیشن یا ملبوسات کی خریداری کو سطحی سمجھا جاتا ہے۔''

اگر یہ کتاب میدان جنگ کے بارے میں ہے تو بے حد معنی خیز ہے۔ اگر ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی عورت کے احساسات کے بارے میں ہے تو فضول ہے۔ میدان جنگ کا منظر ملبوسات کی دکان کے منظر سے زیادہ اہم ہے۔!

لیکن جب ان خواتین نے آگرہ، علی گڑھ اور لکھنؤ کے گھر آنگن کی دنیا کے متعلق لکھا تو لوگ چونک اٹھے۔ یہ نہیں کہ آگرہ، علی گڑھ اور لکھنؤ کے گھر آنگن کے بارے میں پہلے نہیں لکھا گیا تھا۔ مصلحین قوم نے عورتوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح و تربیت کے لیکچرز کے طور پر نصف صدی قبل ناولوں کا ایک دریا بہا دیا تھا۔ خود ان کی ہونہار شاگردوں نے حویلیوں کے اندر کی دنیا، شادی بیاہ کے قصے اور مسلمان پردہ نشین عورت کی دکھی زندگی کے موضوعات پر ان گنت جلدیں رقم کر ڈالیں۔ رقت خیز جذباتیت، آئیڈیلزم اور سماجی اصلاح پر ان کی بنیاد تھی۔ آپ اس صدی کے شروع میں لکھنے والی پردہ نشیں خواتین سے اس سے زیادہ کی توقع بھی نہ کر سکتے تھے جبکہ ان کے پڑھے لکھے مردان سے بہت زیادہ بہتر ناول نہیں لکھ رہے تھے ان کی یہ کاوشیں واقعی قابل قدر ہیں۔

پہلے زیادہ تر اردو ناولوں کی ہیروئن پاری حسینہ، بنگالی حسینہ، یورپین حسینہ یا پھر حور تمثال عفت کی دیوی مسلمان یا ہندو ماہ پارہ ہوتی تھی۔ (فیاض علی مرحوم کے ایک ناول کی امریکن ہیروئن اردو کا ایک لفظ نہیں جانتی۔ ٹرین میں علی گڑھ کے کھلنڈرے نوجوان ہیرو سے ملاقات کے بعد فی الفور ہارمونیم پر فارسی غزل گانے لگتی ہے)۔

لیکن 38 عیسوی تک پہنچتے پہنچتے دنیا بدل چکی تھی۔ گھر آنگن وہی تھے مگر باہر کی دنیا میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ڈیوڑھیوں پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے ٹکڑے اور محل سراؤں اور کوٹھیوں کے ڈرائنگ رومز کے قمقمین پردے سب کے سب اس آندھی میں پھٹپھٹانے لگے تھے اور ان کے اٹھنے سے اندر کی ایک بالکل نئی اور غیر متوقع جھلک دکھلائی دے گئی تھی۔ اب جذباتیت کا گزر کہیں نہ ہو سکتا تھا۔ عصمت اور ہاجرہ مسرور وغیرہ جذباتیت اور Humbug کی جانی دشمن تھیں۔

وہ وقت اب نکل گیا جب عورتیں غیر شعوری طور پر احتجاج آنسو یا گرانی لکھتی تھیں۔ اب وہ غیر شخصی اور پرسکون انداز سے زندگی پر تنقید کر سکتی ہیں۔ اس ذہنی پختگی کا اندازہ آپ کو ہاجرہ اور خدیجہ کے تازہ افسانوں سے ہو سکے گا۔

بہر حال اس پچھلے دور نے بہت سی خواتین افسانہ نگار پیش کیں۔ شکیلہ اختر، ممتاز شیریں، تسنیم سلیم چھتاری، سرلا دیوی، کوشلیا اشک، شکیلہ معظم علی، ناہید عالم یہ سب ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور خاصا اچھا لکھ لیتی تھیں۔ سرلا دیوی کا افسانہ ''کلنک'' مجھے آج تک یاد ہے۔

پچھلے بارہ سال میں جیلانی بانو کے علاوہ صرف تین نئے اور قابل ذکر نام سامنے آئے ہیں، نثار عزیز، واجدہ تبسم، جمیلہ ہاشمی۔

ان کے علاوہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں کس طرح کے افسانے لکھ رہی ہیں آپ ''ساقی'' اور ''زیب النسا'' کے پرچے اٹھا کر خود ہی ملاحظہ کر لیجیے۔

ہمارے یہاں ڈرامے کا سرے سے وجود ہی نہیں (جو ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے گئے ہیں وہ ڈھنگ کی ڈرائنگ روم کومیڈی بھی نہیں کہلا سکتے اور زندگی کے کسی بڑے مسئلے کی نمائندگی نہیں کرتے) ناول کا حال الگ پتلا ہے۔ اردو اللہ کے فضل سے برصغیر کی وہ واحد ترقی یافتہ زبان ہے جس کے ناول رسوا کی اکلوتی نور چشمی امراؤ جان ادا اور پریم چند کے ناولوں سے شروع ہو کر عصمت، کرشن چندر اور عزیز احمد پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ آخر ہم کسی برتے پر اپنے ادب کی بڑائی کا دعوا کر رہے ہیں؟ یہ احساس کمتری نہیں محض حقیقت کا اظہار ہے۔

اردو میں جمالیاتی اور سوشل بغاوت یلدرم نے شروع کی۔ پریم چند کے قلم سے باقاعدہ

منظم احتجاج کا آغاز ہوا۔ باہر کی دنیا میں سوشل بغاوت نے ڈکنز سے لے کر آج تک کے مصنفین تک طرح طرح کے کنوئیں جھنکوائے تھے۔ صنعتی علاقوں کے مسلم، آئرلینڈ کے یہودی، امریکہ کا نیگرو۔ پریم چند نے اپنے معاشرے کی سب سے اہم حقیقت یوپی کے کسان کو چنا۔ ان کے بعد ترقی پسندوں نے کسان، مزدور، طوائف اور متوسط طبقے کی عورت کو اپنایا۔ اس وقت ہمارے بیش تر ادیب کون سے تاریک گوشوں پر سے پردے اٹھا رہے ہیں؟ جو کچھ طوائف پر لکھا جائے گا وہ منٹو کو دہرانے کے مترادف ہوگا۔ مڈل کلاس لڑکی پر عصمت اور ہاجرہ اور خدیجہ لکھ چکی ہیں۔ نئی دنیاؤں کے دروازے کس طرح بند ہو گئے؟ تقسیم کے بعد ایک لٹا پٹا بے جان سا کردار سامنے آیا۔ پناہ گزین، شرنارتھی! مگر یہاں بھی کرشن چندر اور منٹو کے پیش کردہ غنڈے کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جل سکا۔ اس وقت احتجاج تو درکنار رپورتنگ بھی قرینے سے نہیں کی جا رہی۔

ہر دور اپنے گہن کا منتظر رہتا ہے کیوں کہ جو کچھ گزر رہا ہے اس کو ریکارڈ کرنا لازمی ہے۔ کردار اپنے ماحول کی تشریح کرتے ہیں۔ ماحول کرداروں کا آئینہ دار ہے۔ لکھنے والے کے لیے اس کی ساری گرد و پیش کی دنیا، مکان، سڑکیں، بازار، پہاڑ، دریا، میدان، کھیت، چنگھاڑتی ہوئی ریل گاڑیاں، ہجوم، جنگل، درخت غرض یہ کہ ہر شے ڈرامے میں حصہ لیتی ہے۔ ایک بھرپور اندرونی اور خارجی زندگی کی تخلیقی عکاسی کا دوسرا نام ادب ہے۔ ایک سماجی دیومالا کی تشکیل سماجی شعور اور شخصی احساس کے تانے بانے پر کی جاتی ہے۔ انکشاف وہ نوٹ ہے جس پر لیکھک دنیا سے کہتا ہے۔ دیکھو میں محقق ہوں میں انسان کی تصویریں بنا رہا ہوں۔ انسان جو اپنا دشمن، اپنا بھائی ہے کلاسیکل تہذیب وحشی ماضی، رومان، حقیقت پسندی، یہ ساری چیزیں آج کے متمدن انسان کے لاشعور میں بسی ہوئی ہیں۔ یہ وقت جبکہ دنیا پھر وحشی سماج کی طرف لوٹ رہی ہے۔ سارے فن کار نیوکلر تباہی کے سائے میں زندہ ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جہاں ماحول، احساسات، ادراک، ردعمل، بیک گراؤنڈ، ڈیکور، حرکات و سکنات محض تھیٹریکل بن کر رہ گئی ہیں۔ کیوں کہ ہم نے ایک غیر حقیقی Myth تخلیق کر کے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب زندگیاں یکساں ہیں، موت ایک جیسی ہے۔ اس وقت جدید انسان اپنی کھوئی ہوئی شخصیت کی کھوج میں مارا

مارا پھر رہا ہے۔

بقول البرٹ کیمو: To create today create dangerously

تھورنٹن وائلڈر نے کہا ہے کہ "ادب کا عظیم عہد وہ ہوتا ہے جس میں آڈیئس بھی ادب میں حصہ لے جس طرح ایتھنز کے آڈیئس نے یونانی ٹریجیڈی اور کامیڈی میں حصہ لیا، ہسپانوی اور عہد ایلزبتھ والے بھی اپنے اپنے ادب کے پھولنے پھلنے میں برابر کے شریک تھے۔"

زمانہ ہمارے یہاں اُنیسویں صدی کی شاعری اور سرسید اور ان کے چیلوں کے دور میں تھا اور اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے زمانے میں تھا۔ آج یہ کہنا کہ اب حالات بہت مختلف ہیں اور وہی بات دہرائی کہ عہد ناساز گار ہے تو بھائی صاحب لکھنے والوں نے، آزاد، نہرو، حسرت موہانی، فیض نے جیل ہی میں رہ کر لکھا ہے۔ البرٹ کیمو ہی کی ایک اور بات مجھے یاد آئی۔ انھوں نے ایک جگہ ایک جرمن لفٹیننٹ کا ذکر کیا ہے جو برسوں سائبیریا میں قید رہا جہاں سردی اور بھوک کی تکالیف ناقابل برداشت تھیں۔ اس نے چند تختے تراش کر اپنے لیے ایک بے آواز پیانو بنایا جس کے پردے لکڑی کے تھے اور ان میں سے سر پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ انتہائی مصیبت اور کرب کے عالم چیتھڑوں میں ملبوس ہجوم میں گھرے ہوئے اس جرمن قیدی نے اس بے آواز پیانو پر ایک عجیب و غریب انوکھی موسیقی کمپوز کی جسے فقط وہی سن سکتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ احتجاج کا ادب لکھنے سے آپ لامحالہ کمیونسٹ نہیں ہو جاتے۔ چارلس ڈکنز اور حالی کمیونسٹ نہیں تھے۔ آپ کا یہ کہنا کہ آپ خود کو کسی ایک بات کے لیے Commit نہیں کرنا چاہتے لیکن آپ پیدا ہوئے ہیں اور آپ زندہ ہیں، یہ بذات خود سب سے بڑا Commitment ہے۔ اگر آپ یوگی بن جائیں تب بھی آپ یوگی کی حیثیت میں خود کو Commit ہی کریں گے۔ بے تعلقی خود ایک رویہ ہے۔ رویے کی بات کہاں تک کیجیے گا۔

موجودہ دور کی جذباتی انارکی کا جواب کمیونسٹ معاشرے نے اپنی یکسانیت سے دیا جو ادب کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ مغرب کے فن کار نے اپنی اس انارکی میں کہیں سے توازن حاصل کرنے کی سعی کی اور کمیونزم کو تج کر اور نئے مذاہب اختیار کر لیے سب اپنی اپنی جگہ

Commited ہیں۔ مکمل آزادی کس چڑیا کا نام ہے۔ آپ بالکل عقل و ذہن سے عاری، سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیتوں سے معذور ہوں تب آپ البتہ خود کو آزاد کہہ سکتے ہیں۔ بودلیئر آزاد نہیں ہے، خودسارتر اور گبریل مارسل اپنی اپنی جگہ بندھے ہوئے ہیں۔

ادیب کو ہمیشہ یہ طے کرنا پڑے گا کہ اگر اسے Totalitarian سوسائٹی میں رہنا ہے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ جمہوریت کا باسی ہے یا کمیونسٹ سماج کا ممبر ہے تو اسے کیا کرنا ہوگا۔ اسے برابر چوکنا رہنا پڑے گا کہ "آزادی" کو کس طرح کے معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ انارکسٹ، مارکسسٹ، معدومیت پرست، خودوجودیت کے شیدائی سب نے آزادی کی الگ الگ تفسیریں لکھی ہیں۔ ادیب کا کام ہے کہ وہ اپنی تشریحات خود کرے۔

لکھنا ایک مابعد الطبعیاتی فعل ہے۔ "اس طرح لکھنا جیسے صفحے پر بارش ہو رہی ہے۔" ادراک، اکتساب، تجزیہ، تشریح، ترجمانی، اطلاع، خبر رسانی یہ سب ایک عمل میں شامل ہے جس کے ذریعے آپ کوئی واقعہ کوئی خیال، کوئی حقیقت کہانی کے روپ میں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کوئی ایک معمولی سا واقعہ۔ پھولوں کی شاخ، گلی میں اکیلا کھڑا ہوا بچہ، رات کے وقت سنسان سڑک پر سے گزرتی ہوئی روشن بس، خزاں کی ہوائیں، دور کی موسیقی، دوپہر کے سناٹے میں کمرے کا سنہرا رنگ اور آپ ایک نئے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

تین چار سال ہوئے آپا نے مشین پر سلائی کرتے ہوئے یوں ہی باتوں باتوں میں کہا "اپنے قصبے میں جاڑے آتے ہی ہم ہار سنگھار سے دوپٹے رنگتے تھے اور جب بسنت آتی تھی۔"

ان کی بچی نے جو چار سال کی عمر سے کراچی میں رہ رہی ہے ایلیوس پریسلے کی سوانح حیات پر سے سر اٹھا کر پوچھا "اماں بسنت کیا ہوتی ہے؟"

اس ایک جملے کو سننے کا تجزیہ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر تلاش کسی ایک نکتے سے تو شروع کی جا سکتی ہے۔

شاید ہم سب دہشت زدہ ہیں۔ زندگی ایک ایسی زبان میں لکھی ہوئی کتاب ہے جسے ہم سمجھ نہیں پاتے۔ اب تک ہم ایک ڈکشنری کی کھوج میں جٹے تھے۔ اب ہم نے وہ کھوج بھی

ختم کر دی ہے اور دوسروں کے بتائے ہوئے فٹ نوٹس اور حوالوں اور تشریحوں سے کام چلا رہے ہیں۔

دریافت، انکشاف اور اعتراف آخر کیوں نہیں؟ پورا رومن کیتھولک عقیدہ اعتراف پر قائم ہے۔ محض اس حقیقت کا احساس کہ آپ کیتھولک کیٹ کرنا چاہتے ہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ اپنے خیالات سے لبریشن حاصل کرنے کے خواہاں ہیں ورنہ آپ لکھنے کی زحمت ہی کیوں گوارا کرتے؟ لیکن مکمل اعتراف کی ہمت نہ پا کر چند تیسرے درجے کی علامتیں تلاش کر لیتے ہیں جن کی بنیادوں پر تیسرے درجے کی کلچر کی تخلیق کی جاتی ہے۔

چند حضرات ایسے ہیں کہ جن کو ہر معمولی سے معمولی، معصوم سے معصوم اشارے میں سرخی کا شبہ ہوتا ہے۔ کچھ صاحبان مذہب میں مکمل نجات تلاش کر چکے ہیں۔

بہت سی مایوسیاں جو ہونا تھیں ہو چکیں ابھی بہت سی سامنے موجود ہیں لیکن الم کے سارے مراحل طے کرنے کے بعد نیا عہد نامہ بھی لکھا جاتا ہے۔

یہ جواب کہ ہم مینی فیسٹو کے قائل نہیں بالکل درست ہے لیکن آپ جو کچھ بھی لکھ رہے ہیں خواہ وہ انشائے لطیف ہی ہے رومینٹک افسانے تصوف۔ وہ خود آپ کے تخیل، خیالات، شخصیت، جذبات، پس منظر اور ماحول کی تفسیر ہے۔ یوگا، معرفت، کیتھولک، فلسفہ، زین، بدھ ازم، مسیحی خود وجودیت، انارکزم یہ سارے رویے جن کا ادب میں اظہار ہوا ان کی تاریخی وجوہات تھیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ ایٹس یا ہوپکنز یا رلکے یا گرہم گرین، یا گبریل مارسل پہاڑ کی چوٹی پر جا کر بیٹھے اور ان پر وحی اتری یا غروب آفتاب کے وقت ان کو الہام ہوا یا آدھی رات کو فرشتے نے آن کر نور کا قلم ان کے ہاتھ تھمایا اور کہا ''لکھ!''

انھوں نے یہ سب اس لیے لکھا کہ اس اسٹیج تک پہنچنے کے لیے وہ بہت سے ذہنی اور روحانی اور جذباتی مراحل سے گزرے اور ہر مرحلے کے پس منظر میں ان کا پورا معاشرہ تھا ان کی تہذیب کی تباہی تھی ان کی اندرونی کیفیات تھیں جو اس لیے پیدا ہوئیں کہ وہ ایک مخصوص ملک، نسل، تہذیب، طبقے اور وقت کے دور میں پیدا ہوئے۔

ایک مصنف تنہا نہیں ہوتا اس کے پیچھے دوسرے مصنفوں کی قطار ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کے ذریعے ایک اور کڑی کا اضافہ کر دیتا ہے۔ ادیب ہمیشہ Non-conformist ہوتا ہے مگر اس کی یہ ضرورت کہ اسے کمیونی کیٹ کرنا ہے معاشرے سے اس کا رابطہ قائم کر دیتی ہے۔

ہمارا یہ رابطہ کس نوعیت کا ہے؟ روزانہ اخبار پڑھنے، اپنے حالات میں انتہائی دلچسپی لینے کے باوجود ہمیں اس قطعی تباہی کی فکر نہیں جو ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ گویا کوئی Causes باقی نہیں بچے جن کے لیے لڑا جائے۔ ہمیں اپنی آفاقی اہمیت کا احساس نہیں۔

جنگ کے بعد کمیونزم کے خلاف مایوسی کی بڑی عظیم لہر ساری دنیا میں پیدا ہوئی اور توبہ تلا کرنے والے ''سابقہ کمیونسٹ'' ادیب کا باقاعدہ ایک مدرسہ فکر قائم ہو گیا۔ جدید تر انتشار اور مایوسی کا سمبل پیرس کی اٹھارہ سالہ فرانسواسا گاں تھی جس کے انتہائی معمولی ناول لاکھوں کی تعداد میں بک گئے کیوں کہ وہ بعد از جنگ نسل کی شکست خوردگی، کلبیت اور بے نیازی کی ترجمان تھی، حتیٰ کی کہ مرحوم جیمز ڈین اور مارلن برانڈو بھی اس Beatnik نسل کے دیوتا بن گئے۔ لیکن وہ دور بھی اب ختم ہو رہا ہے۔ انگلستان میں کولن ولسن کا بھوت تو بہت ہی جلد سروں سے اتر گیا۔ سارے مصنف، سائنس دان، آرٹسٹ، موسیقار ہر مدرسہ فکر سے تعلق رکھنے والے لبرل کمیونزم کے کٹر دشمن، کیتھولک پادری سب متفقہ طور پر ہائیڈروجن بم کے خلاف شدید ترین احتجاج میں مصروف ہیں۔ مغرب میں ہائیڈروجن بم کا خطرہ ایک عظیم الشان علامت بن چکا ہے۔

مگر ہم تو علامتوں سے خوف زدہ ہیں۔

''پشاور ایکسپریس'' کو تو رقت خیز جذباتیت پر محمول کیا گیا تھا لیکن کیا ہم ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' سے آنکھیں چرانے کی ہمت رکھتے ہیں؟

تیسرے درجے کا ادب اور تیسرے درجے کا پریس (جو بدقسمتی سے ''عوامی پریس'' ہے) ان سب چیزوں کا مبلغ ہوتا ہے جن کے خلاف احتجاج کیا جائے یا آپ تبلیغ میں شامل ہو جاتے ہیں کہ میاں کیا فرق پڑتا ہے دنیا چند روزہ ہے اور اگر اس سے علاحدہ رہ کر خاموش رہتے ہیں تو اپنی خاموشی سے مزید تقویت پہنچاتے ہیں کیونکہ میدان آپ نے بالکل ہموار کر دیا ہے۔

باقی رہا یہ کہ منظم ادارے آپ کے ضمیر کی دیکھ بھال کر لیں گے تو ہم کو معلوم ہے کہ ہار جھک مار کے فرد کو اپنی فکر خود کرنی پڑتی ہے۔ کیوں کہ بقول شخصے ''اخلاقیات جب کوڈیا کونسٹی ٹیوشن کی شکل اختیار کر لیں تو ریاکاری لامحالہ چور دروازے سے گھس آتی ہے۔''

خود ہی ملاحظہ کیجیے عیسیٰ کی عجز و آشتی مسیحی کلیسا میں تبدیل ہوگئی، اپنشدوں کی شانتی کے تصور کا ایک طرف اقوام متحدہ کے مسخرے پن اور دوسری طرف بیسویں پارٹی کانگریس میں انجام ہوا۔

ہنگری پر ظلم ہوتا ہے تو ساری مغربی دنیا میں آگ لگ جاتی ہے۔ الجیریا میں اس سے کہیں بڑی قیامت ڈھائی جا رہی ہے مغربی دنیا کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ ریاکاری اور دوہرا معیار قدم قدم پر ہمارے سامنے ہے۔

ان ساری الجھنوں کا جواب ہمیں کمیونزم میں مل جاتا ہے۔ یہ امام حسینؑ اور جناب امیرؑ کی ہیومنزم بھی ہے اور ایران اور ہند کے صوفیوں کی بھی اور ان انسانیت پرستوں کی بھی جو کمیونسٹ جتھے بندی سے باہر رہ کر سوشلسٹ تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ انسان میں یقین کرنا اصل چیز ہے چاہے وہ انسان کسی ملک، کسی قوم، کسی نسل، کسی مذہب کے لباس میں آپ کے سامنے موجود ہو۔ وہ آپ سے اپنی ترجمان کروانے کا محتاج ہے کیونکہ خدا نے آپ کو تخلیق کی صلاحیت دی ہے۔

یوں Outsiders کا ڈھنڈورہ پیٹنا دوسری بات ہے کہ کہاں کی ہیومنزم صاحب ہم تو Misfit ہیں۔

ادیب ہمیشہ Misfit ہوتا ہے ورنہ وہ ادیب نہ ہوتا، کپاس کی تجارت کر رہا ہوتا۔ یہ حقیقت کہ آپ نے لکھنا اپنا مقدر بنایا ہے آپ کے ہجوم سے ایک حد تک مختلف ہونے کا ثبوت ہے۔ معاشرے کا اجتماعی ضمیر آپ کے ضمیر سے الگ ہے۔ اگر دونوں کو ایک سانچے میں ڈھال دیا جائے تو آپ اسٹالن (اب لینن) پرائز ناول تو ضرور لکھ لیں گے مگر Murder in the Cathedral لکھنے سے قاصر رہیں گے۔

اسٹریوٹائپ کچھ اور سوچ رہا ہے، آپ کچھ اور سوچ رہے ہیں اور چوں کہ آپ مختلف طور

پر سوچنے کی اہلیت رکھتے ہیں آپ کے لیے وہ خوفناک لفظ ''فن کار'' استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ اس خطاب کو بڑی ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں لیکن اگر آپ واقعی فن کار ہیں تو آپ کی ذمہ داری آپ کے دوسرے بھائی بندوں سے کہیں زیادہ ہے۔ موسیقار، سنگ تراش، مصور اتنے آدمیوں تک نہیں پہنچتے۔ آپ کی کتابیں ہر ریلوے بک اسٹال پر موجود ہیں۔ آپ کے افسانے کالج کی ہر لڑکی پڑھتی ہے (جی ہاں! کالج کی لڑکیاں بہت اہم ہیں) اور ایک سماجی اور اقتصادی طور پر پس ماندہ ملک کے مصنف کی حیثیت سے تو آپ کی ذمہ داری اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ چونکہ آپ ایک کم علم، توہم پرست، فاقہ زدہ، سیاست کی ماری ہوئی قوم کے لیے لکھیں گے، آپ جتنے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اتنے ہی خطرناک بھی۔ یہ کہنا کہ ہم ایک چھوٹے سے حلقے کے لیے لکھتے ہیں، فی الحال صحیح ہے مگر تعلیم دیر یا سویر عام ہوگی۔ آج ریڈیو اور سینما کے ذریعے غالب اور فیض سے لے کر شکیل بدایونی اور قتیل شفائی تک سبھی کے اشعار برصغیر کے کونے کونے میں صبح سے شام تک گونج رہے ہیں۔ ادب تو وقت کی رفتار اور صنعتی ترقی کے ساتھ خود بخود مقبول ہوتا جائے گا۔ اس وقت ہم کیا کہیں گے ہمارے افسانہ نگار کون تھے؟

بہت سے مسائل ہیں جن پر ابھی سے غور کرنا چاہیے۔ اس ملک میں اردو کی شکل کیا ہوگی؟ مستقبل کا پاکستانی ادیب کن خطوط پر سوچے گا؟ وہ تہذیب جس کا وہ ترجمان سمجھا جائے گا کن عناصر پر مشتمل ہوگی؟

کیونکہ سمبلز اور روایتیں بدل جائیں گی۔ ''سنگھاسن بتیسی'' اور ''اندر سبھا'' کے سارے ٹرم آف ریفرنس آئندہ نسل کے لیے بے معنی ہوں گے۔ محض محاوروں ہی کو لیجیے۔ ایسے محاورے اور کہاوتیں جو اردو کی گھٹی میں پڑی ہیں۔ ''مٹی کا مادھو''۔ ''مہادیو کی بارات''۔ ''لنکا میں جو ہے باون گز کا''۔ ''رام کہانی''۔ ''بن باس''۔ ''نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی''۔ ''آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ''۔ ''گنگا جمنی''۔ ''گھر گھوڑا انخاس مول'' وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں دلی اور لکھنؤ کے روزمرہ اور ان گنت مقامی حوالے جن کی وجہ سے اردو، اردو بنی ان کا اب کیا جواز ہوگا اور بچوں کو کس طرح سمجھایا جائے گا؟ اب ایک عورت اپنی پڑوسن کو طعنہ دیتے وقت یہ نہ کہے گی۔

''جاؤ۔ جاؤ گڑھیا میں منہ دھو کر آؤ۔ ایسی ہی تو بڑی ستی ساوتری ہو''۔ اور ''اہل زبان'' گھرانوں کی پندرہ سالہ لڑکیوں کو بسنت کی کچھ خبر نہ ہوگی۔

پاکستان میں اس اُردو کے لیے کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ کیوں کہ ٹکسالی سنسکرت، مگدھی، پالی پراکرت، شور سینی، اپ بھرنش، شرقی ہندی، برج بھاشا، دکنی اور کھڑی بولی کے بتدریج یا متوازی ارتقا میں عربی اور فارسی اور ترکی کی آمیزش سے اُردو بنی اور یہ وہی اُردو ہے جو اس وقت پاکستان میں مستعمل ہے اور جو اس ملک کی قومی زبان کہلاتی ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ لسانیات کے نقطہ نظر سے یہ ایک آریائی زبان ہے، سامی زبان نہیں۔ آریائی زبان کی دو شاخیں تھیں۔ ایرانی اور ہند آریائی۔ لہٰذا فارسی جو اُردو کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہے خود ایک آریائی زبان ہے۔ عہد قدیم میں ان دونوں شاخوں یعنی سنسکرت اور اوستا کی صورت تقریباً یکساں تھی اور یہ مشابہت جدید فارسی میں ہمیں آج تک نظر آتی ہے۔ ہند آریائی زبان ڈیڑھ ہزار سال سے مسلسل بولی جا رہی ہے۔ ہماری آج کی اُردو میں پیش تر الفاظ اور نحوی تراکیب ایسی مستعمل ہیں جو کم و بیش اسی صورت میں آج سے پندرہ سو سال قبل مگدھ میں بولی جا رہی تھی اور اس سے بھی ایک ہزار سال قبل ان الفاظ کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔

علاوہ ازیں لوگ گیتوں کی زبان اور راگ راگنیوں کے بول بھی پوربی اور اودھی اور کھڑی بولیوں پر مشتمل ہیں اور ان کی ساری تلمیحات ''غیر ملکی'' اور ''غیر اسلامی'' ہیں۔

چنانچہ زبان کا مسئلہ بھی بہت پریشان کن ہے۔

وہ نئی نسل جو کرشن چندر کا نام بھی سننے کے لیے تیار نہیں، اس لیے کہ وہ ہندو ہے۔ اسے اردو کے لسانی اور تمدنی ورثے، کے متعلق کیا بتایا جائے گا؟ مستقبل کا پاکستانی ادیب کس ورثے کو اپنا گردانے گا؟ مشرقی وسطیٰ۔؟ مغربی یورپ۔؟ امریکہ۔؟

آزادی کے بعد نئی امریکی قوم اپنے انگریزی پس منظر سے شعوری طور پر جدا ہو گئی۔ واشنگٹن اروِنگ سے لے کر شیروڈ ایڈرسن تک سارے ادبا کا جو اس نئے ملک میں پیدا ہوئے تھے، زندگی کو دیکھنے کا انداز بھی نیا تھا۔ ان کی ادبی روایت رفتہ رفتہ خالص دیسی یعنی امریکن بن

گئیں گو زبان وہی (انھوں نے ناول میں روزمرہ کی گفتگو اور لکھی ہوئی پر تکلف تحریر کا فرق یکسر مٹا دیا اور انگریزی کو اس کی بہت سی بندشوں سے آزاد کر دیا) پاکستان کی اُردو ابھی 47 عیسوی سے بہت قریب ہے۔ برصغیر کے پانچ ہزار سال میں بکسر کی لڑائی کے بعد 1947 عیسوی اہم ترین تاریخ ہے۔ ابھی ہم اس حد فاصل سے وقت میں بہت نزدیک ہیں۔ کل کی بات ہے کہ سارے پاکستانی ہندستانی تھے۔ نئی تہذیب اور نئے لٹریچر کے فطری ارتقا میں وقت لگے گا۔ اسے کسی فیکٹری میں تیار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح زبان میں سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ نئے الفاظ شامل ہوتے ہیں اور پرانے الفاظ متروک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ راتوں رات کسی قسم کی قلب ماہیت ناممکن ہے۔

جغرافیائی دوری سے ذہنی اور جذباتی فاصلے آپ سے پیدا ہو جاتے ہیں اور ان فاصلوں کے لیے سیاسی حد بندی یا مذہبی منافرت کی بھی ضرورت نہیں۔ گو امریکی ادیب امریکی ہونے کے باوجود بار بار پرانی دنیا کو لوٹے۔ یورپ خصوصاً فرانس ان کا ذہنی اور روحانی مکہ تھا۔ وہ جغرافیائی اور سیاسی طور پر یورپ سے علاحدہ ہو چکے تھے مگر یورپ اپنے زاویۂ راہ میں لائے تھے۔

اس لیے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ صحیح وطن پرستی کیا ہے؟ صرف اپنی دیواروں میں جیے جانا ساری دنیا کی تہذیب کو اپنا ورثہ سمجھنے سے اپنی قومیت میں کسی قسم کا رخنہ پڑ جاتا ہے یا نہیں؟ جب روس کے دروازے مغرب کے لیے کھلے تو وہاں بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔ روسی یعنی سلاو کلچر یا مغربی کلچر کس کو اپنا آدرش بنایا جائے۔ ایشیا میں قوم پرستی کی لہر پھیلی تو یہ کشمکش ہر جگہ سامنے آئی۔ ترکوں نے عربی الفاظ کو ترک کیا اور ''خالص'' ترکی کی طرف لوٹے۔ یہی سلسلہ ایران میں بھی رہا۔ مصر اور ترکی اور ایران اور انڈونیزیا سب اپنی اپنی قبل از اسلام قدیم تہذیبوں کو اپنی قومی تہذیب گردان رہے ہیں اور اسلامی عہد سے زیادہ ان تہذیبوں کا پرچار کر رہے ہیں۔ اگر برطانیہ دخل انداز ہوا ہوتا یا اگر ساری کی ساری چالیس کروڑ آبادی مسلمان ہو چکی ہوتی تو شاید یہاں بھی مسلمان سنسکرت تہذیب کو اپنی تہذیب سمجھتے لیکن چونکہ مسلمان یہاں اقلیت میں رہا اور ایک متحدہ قومیت وجود میں نہ آ سکی اس لیے بیسویں صدی کے مسلمان ادیب نے کالی داس اور بھرتری ہری

کو اپنا ورثہ نہ سمجھا (لہٰذا مثال کے طور پر جب آج قومی تھیٹر کی بات کی جاتی ہے تو سنسکرت ڈرامے کی طرف بھولے سے بھی کسی کا دھیان نہیں جاتا) تقسیم سے پہلے بھی حالات اس قسم کے تھے کہ اُردو ادیب ہم عصر ہندی ادیب سے قطعاً ناواقف تھا اور سات سمندر پار کے ملکوں کا اجنبی لٹریچر بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا تھا۔ ادبی ہندی اور ادبی اُردو کی صرفی ونحوی تشکیل بالکل ایک جیسی ہے لیکن اُردو ہندی کے سیاسی جھگڑے کی بنا پر موخرالذکر میں غیر مستعمل سنسکرت ٹھونس کر اسے جناتی بنا دیا گیا۔ اُردو میں عربی فارسی کا مزید اضافہ کیا گیا اور دونوں زبانوں کی ادبیات ایک دوسرے سے بہت دور جا پڑیں۔ وہ زمانے لد گئے جب مسلمان ہندی میں شاعری کرتے تھے اور اُردو میں دیسی دیو مالاؤں اور اساطیر کی داستانیں قلم بند کی جاتی تھیں اور یہ سب گویا ایک بڑی ہندستانی ادبی روایت میں شامل تھا۔ 1947 عیسوی سے پہلے کے عہد کے سیاسی اور جذباتی بحران سے زبان کو جو نقصان پہنچا اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں اور اس صورت میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ بھارتیندو یا نرالا کو اپنا ورثہ سمجھا جاتا؟

بنگالی والوں کے لیے یہ مسئلہ زیادہ ٹیڑھی کھیر بن جاتا ہے کیوں کہ ادب کا ''کلکتہ اسکول'' بنگالی لیکھکوں کا آدرش رہا ہے اور وہ سنسکرت زبان اور تہذیب سے بہت ہی قریب ہیں (گو مسلمانوں کی آمد کے بعد بنگالی میں بھی فارسی اور عربی کی ہلکی سی آمیزش ہوگئی) اسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ''مشرقی بنگال کی کویتائیں'' کی قابل مؤلفہ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

> ''مشرقی پاکستانی ادب کی غیر مسلم روایات پر اعتراض کیا جاتا ہے لیکن اگر اردو شاعری میں ایران کی ساری قبل از اسلام Imagery کو متواتر استعمال کیا جاتا رہا ہے تو بنگال کی دیسی روایات پر اعتراض کیوں؟''

قصہ مختصر یہ کہ آج کے پاکستانی ادیب کے سامنے خود لٹریچر کی بنیادی تشکیل کے متعلق بڑے زبردست مسائل ہیں جن کا سائنٹیفک اور غیر جذباتی حل تلاش کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

اور یہ فکر کہ یا تو یہاں جمود ہے اور یا نوسٹیلجیا۔ تو موخر الذکر کی حد تک عرض ہے کہ اس کی پروانہ کیجیے۔ وقت گزرنے دیجیے اگلے دس سال تک انتظار حسین کے کردار بوڑھے ہو کر مرکھپ چکے ہوں گے۔ گرٹروڈ اسٹین تیس سال تک پیرس میں رہے۔ کچھ عرصے کے لیے وطن واپس آئے مگر دوبارہ پیرس واپس جاتے وقت انھوں نے کہا:

''بہرحال یہ میرا ذاتی معاملہ ہے..... یہ امریکہ!!''

ہم جہاں رہتے ہیں، جہاں ہماری جڑیں ہیں۔ ہم دنیا کے کسی حصے میں بھی چلے جائیں ،وہ خطہ جس نے ہمیں جنم دیا ہمیشہ ہمارا ذاتی معاملہ رہے گا۔

ایک چیز اور ہے۔ سر ہربرٹ ریڈ نے ایک جگہ خبردار کیا ہے کہ ہمیں کلچر کی بلیک مارکیٹ سے بچنا چاہیے اپنے روحانی ''مال کو'' کلیسا، اسٹیٹ اور پریس کی دکانوں کے ذریعے بلکہ کاؤنٹر کے نیچے فروخت کرنے کی صورت حال کا سدباب ضروری ہے لیکن ممکن ہے اس کے جواب میں آپ کہیں کہ ہربرٹ ریڈ تو انارکسسٹ ہیں، ان کی بھلی چلائی۔!

اپروچ کا تعین۔ ہمارے یہاں اجتماعی تجزیے کا وجود ہی نہیں آج کل ہم لوگ امریکہ سے بے حد متاثر اور مرعوب ہیں، یا ان کی ہر بات کو آنکھ بند کر کے قرآن حدیث سمجھتے ہیں یا پھر ان کو گالیاں دیتے ہیں۔ ان کے اچھے پہلوؤں پر غور نہیں کرتے۔ امریکن قوم پیٹ بھر کر اپنا مذاق اڑانے میں اپنی توہین نہیں سمجھتی۔ وہ اپنی سوسائٹی کے انتہائی کریہہ اور مجرمانہ پہلوؤں پر ان گنت کتابیں لکھتے ہیں فلم بناتے ہیں، اعداد و شمار جمع کرتے ہیں۔ سوشیولوجیکل رپورٹنگ کا انھیں مرض ہے اور اس خصوصیت نے امریکن ناول کو وہ توانائی اور تروتازگی اور بے ساختہ پن بخشا ہے جس کی مثال کسی اور ملک کے ناول میں مشکل سے ملے گی۔ 39 عیسوی سے پہلے کے پرولتاری ادیب جیمز ٹی فیریل، ڈوس پیسوس، اسٹین بک وغیرہ اور اب ٹینسی ولیم، نیلسن ایلگرن، نارمن میلر عوامی زندگی کی بھرپور اور بالتفصیل داستانیں بیان کرنے میں مصروف ہیں۔

ہم انگلستان سے بھی بہت مرعوب ہیں۔ وہاں دیکھیے آج کل کیا ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں ''برافروختہ نوجوانوں'' نے کیسا کیسا اودھم نہ مچایا۔ لکی جم اور جمی پورٹر اس دور کے سمبل بن

چکے ہیں۔ ان دونوں کرداروں کے خالق کنگز لے ایمس اور جان زبرن اور دوسرے ''برافروختہ نوجوانوں'' نے انگلستان کی ملکہ پرستی کے پرخچے اڑا دیے۔ حکومت اور برسر اقتدار طبقے اور مڈل کلاس کی کھوکھلی اقتدار، سوسائٹی کے ذہنی دیوالیہ پن، ریاکاری، کلیسا، ملکہ ایلزبتھ، اوکسفرڈ اور کیمبرج والوں کی نخوت غرض یہ کہ ہر چیز کا بھرتہ بنا کر رکھ دیا لیکن جان اوزبرن، ایک شراب خانے کی افلاس زدہ ملازمہ کا لڑکا اس وقت کروڑ پتی ہے۔ اسی قوم نے، جسے اس نے جی بھر کر گالیاں دیں، اسے مالا مال کر دیا۔ ان نوجوانوں کی کتابوں، ڈراموں اور ناولوں پر پابندی حاید نہیں کی گئی۔ الٹی ان کی تصنیفات ہاتھوں ہاتھ لاکھوں کی تعداد میں بک گئیں۔ ان کے ڈرامے لندن میں اپنی حیرت انگیز کامیابی کے بعد نیویارک کے براڈوے تک لے جائے گئے۔ ان کے ناولوں اور ڈراموں کے فلم بن رہے ہیں۔ برطانیہ کو کسی بورس پیسٹرنک کی ضرورت پیش نہ آئی، کیونکہ اس گئی گزری حالت میں بھی انگلستان آزادی افکار کا علمبردار ہے۔ یہ لبرل روایات کا نتیجہ ہے۔

لہٰذا آج کل وہاں خوب جھگڑا ہو رہا ہے اور اس نئے گروہ نے بالکل آفت جوت رکھی ہے۔ آرٹسٹ اور سوسائٹی میں ہمیشہ ایک دوسرے سے ٹکٹا ہوتا آیا ہے اور یہ نوجوان تو سب کے سب بڑے سخت انفرادیت پسند ہیں۔ ''برافروختہ نوجوان'' کسی ایک منظم تحریک کا نام نہیں بلکہ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف بھی ہیں اور آپس میں بھی خوب لڑ رہے ہیں۔

کسی نقاد نے جان اوزبرن کو ''اعصاب زدہ'' لکھ دیا تھا۔ جان اوزبرن اس کی جان کو آ گیا۔ اس نے دہاڑ کر کہا:

> ''اچھا تو تم ہمیں نیورسس اور ہسٹریا کا شکار سمجھتے ہو! اچھا ہم تو سور ہیں، گندگی میں لوٹ رہے ہیں، پھر تم سے مطلب۔؟ سماجی کوڑا کرکٹ کی صفائی کے داروغہ جی! ہم نے تو تمھیں تمھاری اصلی صورت دکھلائی ہے۔
>
> ''یہ لوگ دیواروں پر سے اندر جھانک رہے ہیں اور میں سور خانے میں لوٹ لگا رہا ہوں۔ لوگ کتنی حقیر سطح پر زندہ ہیں ہم لوگ

سب سور ہیں۔!

''اگر یہ باہر والے کچھ دیر کے لیے اندر آجائیں اور اپنی تھوتھنیاں کلیسائی مذہب کے کوڑے میں گھسیں تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ ویلفیئر اسٹیٹ۔ ملکۂ معظمہ۔ اس سارے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں اپنی ناکیں رگڑو تو حقیقت کھلے گی بیٹا۔ ہم سور لوگ تو غلاظت کے انبار میں لوٹ لگا لگا کر تم کو یہاں کا سارا کچا چٹھا سنا رہے ہیں۔ ہم اسی گندگی میں پیدا ہوئے ہیں اسی میں مریں گے۔ سوشل سالوتیج یونٹ سیاست دانوں، ماہرین نفسیات، فلسفیوں، اساتذہ کرام اور ماہرین اقتصادیات کو اپنا ممبر بنائے گا۔ یہ سب جو سینٹری انسپکٹر ہیں۔ ادیب کی جگہ تو سور خانہ ہے۔''

''اب تک مذہب، شہنشاہیت، معاشرے کی منظور شدہ اقدار، اعلیٰ طبقہ، پبلک اسکولز کے متعلق ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ آرٹی اکلچوئل ڈرامے محض کلب تھیٹروں اور لٹل تھیٹروں کے لیے مخصوص تھے۔ اس گروہ نے غربت، جہالت، تشدد اور ظلم کے متعلق بھی تمثیل نگاری شروع کردی۔ کیتھ ٹائی نن، ان ہی میں سے ایک کا کہنا ہے کہ روس میں ''صرف روٹی ہی سب کچھ نہیں'' نے تہلکہ مچادیا تھا۔ یہاں ہمیں ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس کا عنوان ہو ''صرف کیک ہی سب کچھ نہیں''۔

''اسی وقت جبکہ اہل قبرص کو پھانسی پر لٹکایا جارہا ہے اور اہل ہنگری مشین گن سے بھونے جارہے ہیں آرٹ محض دور کا تماشائی نہیں رہ سکتا۔''

یہ نیابایاں بازو خود کیتھ ٹائی نن کے الفاظ میں 39 عیسوی سے پہلے والے ترقی پسندوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ جس طبقے میں یہ نوجوان پیدا ہوئے ہیں اس سے بغاوت نہیں کرتے۔ یہ نچلے متوسط طبقے کے افراد ہیں جن کو سرکاری یونیورسیٹوں میں مفت تعلیم ملی (اسی وقت برطانیہ میں ساٹھ فی صدی انڈر گریجویٹ سرکاری خرچ پر پڑھ رہے ہیں) یہ کنٹری ہاؤس

میں رہنے والے اونچے طبقے سے نہ متنفر ہیں اور نہ ان سے رشک میں جلے مرتے ہیں۔ یہ اس اونچے طبقے سے محض بہت بری طرح بور ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''چھوٹی چھوٹی تو میں اپنی خصوصیات کی پرستش کرتی ہیں چنانچہ ہسپانیہ اپنی بل فائٹ کے، سان مارنیو والے اپنے ڈاک کے ٹکٹوں کے اور اہل انگلستان اپنی ملکہ معظمہ کے بجاری ہیں لیکن حالات اس وقت واقعی قابو سے باہر ہو جاتے ہیں جب مقبول پریس ملکہ، ڈیوک اور ان کے بچوں کو دنیا کی چار اہم ترین ہستیاں بتاتا ہے۔ آج کا بایاں بازو اس مضحکہ خیز صورت حال سے بغاوت کر رہا ہے۔''

چنانچہ اگر اس گروہ میں کولن ولسن ہے تو ڈورس لسنگ بھی موجود ہے جو کہتی ہے ''کولن ولسن کے علاوہ اس دنیا میں روس اور چین اور ہندستان کے لاکھوں نوجوان ہیومینسٹ بھی ہیں۔ مسٹر ولسن ظاہر ہے اس جوش و خروش کے جذبے میں شرکت کرنے سے معذور ہیں جو ہندستانی میں عظیم الشان Dams کی تعمیر کی خبر سن کر ایک ایسے نوجوان افریقی قوم پرست کے دل میں پیدا ہوتا ہے جس کو لکھنا پڑھنا سیکھے ابھی پانچ سال کی مدت بھی نہیں گزری۔''

کیمونسٹوں کے مقابلے میں برطانیہ کے نئے اشتراکیوں کی وہی پوزیشن ہے جو ریفرمیشن کے وقت کیتھولک فرقے کے مقابلے میں پروٹسٹنٹ ''بدعتیوں'' کی تھی۔

''برافروختہ نوجوانوں'' کو بدتمیز اور نالائق کہا گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک سفید پولیش شریف گھرانے کا لڑکا آوارہ، گستاخ اور بے ہودہ نکل جائے، ''سُرخ اینٹوں'' والی پروفیشنل یونیورسیٹوں میں سرکاری وظیفے پر پڑھی ہوئی اس لونڈ ہار پارٹی نے (جسے سمرسٹ ماہم نے Scum کے لقب سے نوازا) انگریزی ادب میں ایک نئی جان ڈال دی ہے اور ایک زبردست باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

''برافروختہ نوجوانوں'' نے یہ لقب خود اختیار نہیں کیا بلکہ مقبول پریس نے ان کو یہ خطاب دیا ہے۔ اس گروہ کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ 45 عیسوی کے بعد وہی جنگ سے پہلے کے حالات واپس آ گئے تھے۔ وہی طبقاتی تفریق، وہی متوسط طبقے کی قناعت اور جمود۔ دائیں بازو والے صاف صاف کہہ رہے تھے کہ سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ برطانیہ نے جنگ میں روس

کے خلاف جرمنی کا ساتھ نہ دیا بلکہ اُلٹا ہٹلر سے لڑ پڑا۔ لیکن اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ جدید انسان، مرد اور عورت، بہت بہادر ہے جو اتنا کچھ سہہ لینے کے بعد بھی نیوکلر تباہی کے سائے میں سانس لینے کے باوجود ہنس رہا ہے اور مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہتا۔

دنیا روز بروز مشکل تر ہوتی جارہی ہے۔ ہم الفاظ اور اصطلاحات اور نظریات اور خیالات اور واقعات کے سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کا انتخاب ہمارا کام ہے۔ اگر ہم نے ادب کی تجارت نہیں شروع کردی۔ اور یہ عالمگیر تجارت کا دور ہے تو ہم اچھے فن کار ثابت ہوسکیں گے۔

مرتے وقت گوئٹے کے آخری الفاظ تھے۔ ''اور روشنی۔!''

(کیا ''موجودہ ادب رو بہ تنزل'' ہے؟ یہ سوال ''نقوش'' لاہور نے مختلف ادبی اصناف کے حوالے سے اس وقت کے اہم ادیبوں کے سامنے رکھا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے افسانے کے حوالے سے اس کا جواب دیا۔ یہ تمام تحریریں ایک سمپوزیم کی صورت میں ''نقوش'' لاہور کے شمارہ 78, 77 دسمبر 1959 میں شائع ہوئیں۔ اس سمپوزیم میں افسانے کے بارے میں پہلی تحریر قرۃ العین حیدر کی ہے۔)

اردو ناول کا مستقبل

کیا سچ مچ اردو میں ناول کے مستقبل کے بارے میں کوئی گفتگو ممکن بھی ہے؟ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ ہماری زبان میں اس ادبی صنف کا سرے سے نہ تو کوئی ماضی رہا ہے اور نہ کوئی حال ہی ہے۔ شاعری تو خیر اردو کی گھٹی میں پڑی ہے لیکن ناول اور مختصر افسانے، ادبی تنقید اور ڈرامے کی طرح بعد میں مغرب سے لیے گئے۔

ایسے لکھنے والے جو خالصتاً دیسی موضوعات پر بالکل مشرقی طرز میں لکھ رہے تھے، دراصل ہماری داستانوں کے مصنف تھے۔ انھوں نے مقامی رنگ کو اپنے مقامی استعاروں میں پیش کیا اور ہماری زبان کی یہ نثری صنف داستان انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک آ کر ختم ہو گئی۔ یہی داستان نویس ادیب اور فورٹ ولیم کالج گروپ کے ارکان دور متقدمین کے آخری نمائندے تھے۔ یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے باغ و بہار، رانی کیتکی کی کہانی، نورتن، سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی، داستان امیر حمزہ، آرائش محفل، فسانہ عجائب اور طلسم ہوش ربا جیسی چیزیں لکھیں۔ گو داستان والے دور کے خاتمہ کے ساتھ ہی اردو بے حد تیزی کے ساتھ اپنی جڑ اور Myth سے علاحدہ ہو گئی۔ اسی دور میں ہندی اور اردو ایک دوسرے سے دور ہونے لگیں۔ مغربی

ناولوں سے روشناسی کے بعد نئے موضوعات کا احساس جاگا اور پھر ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا راشد الخیری نے اصلاحی ناول پیش کیے۔

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں جب دونوں فرقوں نے تجدید و احیا کی تحریکیں چلائیں تو آریہ سماج رہنماؤں اور علی گڑھ سے وابستہ ماہرین تعلیم دونوں کو ناولوں سے کافی مدد ملی۔ بے حد جوش و خروش کے ساتھ ہندوؤں کے ماضی اور مسلمانوں کے ماضی کی شان و شوکت کا چرچا کیا گیا اور انھیں مثالی ثابت کیا گیا اور یہ سب اس حد تک ہوا کہ نتیجتاً فرقہ وارانہ بدمزگی پیدا ہو گئی۔ اس کی مثال بنگالی ناول آنند مٹھ ہے۔ اردو میں اس افسانوی اسکول کے رہنما مولانا عبدالحلیم شرر ہیں۔ البتہ پنڈت رتن ناتھ سرشار انیسویں صدی کا ایک دوسرا اہم نام ہے جس نے فسانۂ آزاد میں اپنی ہم عصر لکھنوی زندگی اور تہذیب کا ایک بے حد سچا نقشہ... اس کا فریب، اس کی تفریح، طنز، سیر و شکار اور رومان سب کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ یہاں تک آتے آتے ناول کی ہیئت قطعی مشرقی بن چکی تھی۔ فسانۂ آزاد اردو کے سوا کسی بھی دوسری زبان میں نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ سرشار اپنے دور کے سماجی شعور کے ہمارے سب سے کامیاب مبصر ہیں۔ انھوں نے ہمارے اس گہرے انحطاط کی جس کے ہم شکار تھے اور اس بالادستی کی جو مغربی تہذیب کی ہندستان نے قبول کر لی تھی، بڑی مکمل تصویر اتاری ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مرزا رسوا نے اپنا لافانی ناول 'امراؤ جان ادا' لکھا۔ عہد ایڈورڈ کی شام میں کچھ باغی رومانی نوجوانوں کا ایک ایسا گروہ منظر عام پر آیا جس کی بڑی آرزو یہ تھی کہ ملک میں اصلاح ہو اور اسے جدید لباس سے سنوارا جائے۔ انھیں بے حد رومانی اور تلخ تجربوں سے گزرنا پڑا تھا اور یہ پکے عینیت پرست لیکن بڑے جمالیات پسند تھے۔ یہ مغرب میں انیسویں صدی کے خاتمہ کے بعد زوال پسند ادبی رجحانات سے کافی متاثر ہوئے تھے اور اس کی گہری چھاپ ان پر پڑی تھی۔ یہ گروہ سید سجاد حیدر یلدرم، مرزا محمد سعید، نیاز فتح پوری اور چند اور دوسرے حضرات پر مشتمل تھا۔ یلدرم 1914 کے پہلے کے یورپ اور انقلاب سے قبل کے ترکی میں رہ چکے تھے۔ وہ ترکوں کو مثالی سمجھتے تھے اور اسی طرح پیش کرتے تھے۔ اس عہد کے ناول

نگاروں کی ہیروئنیں عموماً پارسی خواتین ہوا کرتی تھیں کیونکہ ان دنوں رومانی واقعات کے ضمن میں کسی مسلمان خاتون کا تصور بھی قیاس سے بعید تھا۔ ان ہی رومانی روایات کی پیروایک باصلاحیت ادیبہ حجاب اسماعیل بھی اس کے فوراً ہی بعد منظر عام پر ابھریں اور اپنے قارئین کو اٹھارھویں صدی کے نیم فرانسیسی ماحول والی ایک ایسی خوابوں کی سرزمین کی سیر کرائی۔ یہی وہ دور تھا جب ٹیگور کی چیزیں ترجمہ ہو کر آ رہی تھیں اور ان کی رومانیت بے تحاشہ حشر انگیز ثابت ہو رہی تھی۔

لیکن اسی زمانہ میں ہماری افسانوی دنیا میں ایک نئی آواز گونجی۔ یہ منشی پریم چند تھے جنھوں نے پہلی مرتبہ اردو کو سماجی حقیقت پسندی سے روشناس کیا اور ہمیں سیوا سدن (1914)، چوگان ہستی (1925)، نرمن (1931) اور گئودان (1936) دیے۔ یہ اردو کے سب سے پہلے ترقی پسند ادیب تھے۔ ہمیں ان کے ناولوں میں اس نئے ہندستان کی جو اس صدی کے پہلے تیس سالوں میں دھیرے دھیرے کروٹ بدل رہا تھا، ایک بے حد حیرت ناک اور واقعاتی تصویر ملتی ہے۔ ان ناولوں میں خاص طور پر کسانوں کی جدوجہد، تحریک آزادی اور مشرقی یوپی کے نچلے متوسط طبقہ کے مسائل اور مصائب کی بھرپور تصویر اتاری گئی ہے۔

زمان و مکان کے اس فصل کے اس پس منظر میں جب ہم پریم چند کے ناولوں پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں اب وہ ذرا پرانے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی اس برصغیر کی سیاسی اور سماجی تاریخ کے ایک نہایت اہم اور ایسے دور کی کہانی، جبکہ آزادی کی جنگ ابھی سچ مچ لڑی جا رہی تھی اور جب سپنے دیکھے جا رہے تھے، انھوں نے کافی اچھی طرح کہی ہے۔ شاید وہ کافی جذباتی اور عینیت پرست تھے۔ اخلاقی سدھار اور اس کی تبلیغ کی طرف ان کا جھکاؤ تھا۔ ان باتوں کے سبب وہ اپنی اصلی سطح سے کبھی تھوڑے کھسکتے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں اور کبھی کبھی آج کل کے نئے اور روشن خیال لوگوں کی نظر میں وہ ایک دم دقیانوسی بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنی ان مجبوریوں اور کمزوریوں کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک سچے فن کار ہیں اور ان کا ناول 'گودان' ہماری زبان کے چند گنے چنے ناولوں میں شامل ہے۔ یہ ایک سنجیدہ خیال ہے اور ہمیں پھر سے اصلی سوال کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے کہ اچھے ناول اردو میں نہیں لکھے جا رہے ہیں؟ حالانکہ ہمارے کئی افسانے اتنے اچھے اور اعلیٰ ہیں کہ وہ عالمی ادب میں بھی امتیاز حاصل کر سکتے ہیں۔ آخر یہ کون سی چیز ہے جس نے ہمارے ادیبوں کو افسانہ سے بڑے کینوس پر تخلیقی کام کرنے سے روک رکھا ہے؟ اس کا سبب کہیں یہ تو نہیں کہ اس کے لیے ایک قسم کی ذہنی اور جذباتی تنظیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے ادیب اس زحمت کے متحمل ہی نہیں؟

اردو میں ناول کی اپنی کوئی روایت نہیں ہے جس کے جی میں جو اور جیسا آیا لکھ مارا۔ کرشن چندر اور عصمت چغتائی اور عزیز احمد جیسے چند ایک کو چھوڑ کر دیکھیے تو ہر طرف معمولی قسم کے فکشن کا اک انبار سا دکھائی دے گا۔ ناول نگاری کے ضمن میں ہم لوگ کسی رجحان یا کسی طرز یا کسی اسکول کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کر سکتے۔

پریم چند کو وفات پائے اب بیس سال سے زیادہ ہوئے اور پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے بعد ہماری ادبی دنیا میں آج تک کوئی بھی ان کے فنی پایہ کا لکھنے والا پیدا نہ ہو سکا۔ کرشن چندر، عصمت اور عزیز احمد نے اپنے وہ ناول لکھے جن پر آج ان کی شہرت کا دار و مدار ہے۔ اب ایک لمبا عرصہ گزر گیا۔ 1940 کے بعد پاکستان کے ممتاز لکھنے والوں میں بس تین ہی حضرات اے حمید، انتظار حسین اور شوکت صدیقی ہیں جنھوں نے معقول اور اچھے ناول پیش کیے ہیں۔ اے حمید تقسیم سے پہلے کے امرتسر کی زندگی کو یاد رکھتے ہیں اور اس کی تصویر کشی کے لیے ممتاز ہیں۔ انتظار حسین بھی تقسیم سے پہلے کے مغربی یوپی کا تذکرہ کرتے ہیں اور اسی کے لیے مشہور ہیں۔ البتہ شوکت صدیقی ہی شاید تنہا ادیب ہیں جنھوں نے عام طور پر نچلے متوسط طبقہ، مزدوروں اور کراچی کے گندے پس ماندہ علاقوں کے بارے میں بھی لکھا ہے اور اس طرح آج کے ماحول اور زمانہ کی پوری عکاسی کی ہے۔ بلاشبہ اس کا کچھ سبب تو ضرور ہے کہ کچھ لوگ ابھی تک ماضی ہی میں الجھے ہوئے ہیں اور حال سے دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔

ایک دوسری باصلاحیت ناول نگار نثار عزیز ہیں جن کا ناول 'نگری نگری پھرا مسافر' ابھی چند سال پہلے شایع ہوا۔ اسے وہ مقبولیت نہ مل سکی جس کا یہ مستحق تھا۔ اس میں ایک ایسی بیمار لڑکی

کے تجربوں کو جسے روحانی اور جذباتی مصائب سے گزرنا پڑا ہے جس کو عمدہ اور پر درد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

یہاں پاکستان میں اردو ناولوں کی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ان دنوں نثار عزیز اور ہاجرہ مسرور سماجی موضوعات پر ناول لکھنے میں مصروف ہیں۔ نثار عزیز ایک سنجیدہ، باوقار اور ادب کی ایک سچی طالب علم ہیں۔ ہاجرہ مسرور اس برصغیر کے چند گنے چنے عمدہ افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں باصلاحیت نوجوان خواتین اپنے قارئین کو مایوس نہیں کریں گی۔ (سننے میں آیا ہے کہ ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب بھی ناول لکھ رہے ہیں۔)

ہر سال ملک کے اخباروں اور رسالوں کے آزادی نمبر میں ایک فہرست شائع کی جاتی ہے جس میں اس بات کی کہ ناول و افسانہ کی کتنی کتابیں چھپیں اور کتنی کہانیاں لکھی گئیں وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ موجودہ جمود کے بارے میں بھی کافی لکھا جا چکا ہے۔ کہا گیا ہے کہ لکھنے والے آج اپنے آپ کو ایک قسم کے فکری اور جذباتی اندھیرے میں گھرا پا رہے ہیں اور پھر اس کے کئی اسباب گنائے گئے ہیں۔ تھکاوٹ، انتشار، ناکامی اور مایوسی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ پچھلے دس برسوں میں ہمیں الجھنوں کے ایک بڑے سلسلہ سے گزرتے رہنا پڑا ہے اس لیے یہ حالات اچھے ادب کی تخلیق کے لیے سازگار نہ تھے۔

لیکن ادیب تو ہمیشہ ہی خارجی اور داخلی دونوں طرح کی الجھنوں سے گزرتا رہا ہے اور جب کبھی بھی قدروں کو چوٹ پہنچی تو اس کی آواز بھی بلند ہوئی ہے۔ تخلیقی فن کار چاہے وہ جہاں بھی ہو ایک دام میں اسیر، ایک جال میں پھنسا ہوتا ہے اور اس کے چاروں اُور شام کے سائے ہمیشہ پھیلتے اور بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں کوئی راہ، کوئی فرار نہیں ہے۔ انسانی تاریخ کے ایسے ہی ادوار میں ادب عالیہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس کشاکش میں جو تہذیب اور نا تہذیب، وحشی لوگوں اور مہذب انسانوں میں جنگ ہر طرف ہو رہی ہے۔ ہمارا ادیب خاموش نہیں بیٹھ سکتا اور نہ اچھے دنوں کے انتظار میں رہ سکتا ہے۔

ہمیشہ ہی تخلیقی کام کرنے والے ادیب اپنے خارجی اور داخلی مسائل کی کشاکش کے شکار رہے ہیں۔ اس کے بہتیرے حل بھی ڈھونڈے گئے ہیں۔ مابعد جنگ کی دنیا میں بہت سے ادیبوں نے خود اپنے ہی ذوق و پسند کی خلوتوں کو سجایا ہے۔ بہت سے لوگوں نے کیتھولک اور ہندو مادرایت میں پناہ لی ہے۔ تفصیلی واقعیت پسندی اور سماجی آگہی دونوں کو آج ماضی کی چیز سمجھ کر ٹھکرا دیا گیا ہے۔

1930 سے 1940 تک کے زمانہ کو اکثر و بیش تر سیاسی عہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن 1920 سے 1930 تک کا زمانہ بھی خواہ یہاں ہو یا یورپ میں، سیاسی عہد ہی تھا۔ لیکن اپنے زمانہ کے عالمی حالات نے آج کے ادب پر جو اثر ڈالا ہے وہ آج سے پہلے کے کسی بھی عہد میں ممکن نہ ہوا۔ اس صورت حال نے ہمیں موضوعاتی تحقیق کے چند اصول دیے ہیں اور ہمارے رجحانات کو وضع کیا ہے۔

مائیکل، مدھوسودن اور سرسید احمد خاں کے زمانے سے ہی ہم لوگ مغربی ادب سے بہت گہرے طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ ٹالسٹائی، ڈکنس اور بالزاک کی دنیا ہماری دنیا نہ تھی پھر بھی ہم اس سے مانوس تھے۔ اس میں خوش تھے۔ ٹالسٹائی اور گورکی سے ہمیں آسودگی اور تازگی ملتی تھی۔ پروست، ورجینیا وولف، ہنری جیمس، جیمس جوائس اور ڈی ایچ لارنس کی بیسویں صدی کی دنیا بھی ہماری دنیا نہ تھی۔ لیکن ان ناول نگاروں میں سے بعض نے ہمیں خوف زدہ کیا تو بعض نے خوش کیا۔ بعض نے بے حد ڈرایا اور بعض نے کافی متاثر کیا۔ مغربی طرز فکر کے اثرات نے شاید ہم میں سے کچھ لوگوں کو اپنے طرز بیان سے غیر مطمئن کر دیا ہے اور اسی کے ساتھ ہمیں اپنی زبان کی غربت، اس کے مختلف مضامین کی مجبوریاں اور اکھڑا پن اور اپنی ذہنی و فکری زندگی کی مجموعی بے اثری اور نا اہمیت پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ یہ اس طرح بھی ظاہر ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو وہ باشعوری یا لاشعوری طور پر مغربی مصنفین کے اسلوب کی نقل اتارنے لگتے ہیں۔ ہمیں بارہا اپنی تحریروں میں ہارڈی اور ایلیٹ اور پروست کی ہلکی سی صدائے بازگشت ملتی ہے۔ ہمارے ممتاز مزاح نگاروں نے بھی جی کھول کر انگلستان اور امریکہ کے لکھنے

والوں سے اثر قبول کیا ہے۔

جیمس جوائس نے اس صدی کے ابتدائی برسوں سے ہی روایاتی طرز بیان میں اپنی شعوری بہاؤ (Stream of Consciousnes) والی تکنیک سے ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ سنے ہوئے، دیکھے ہوئے اور ڈرامائی تجربوں کے بیتے ہوئے لمحات کو دوبارہ تازہ کرنے والی اس تکنیک کا ورجینیا وولف، ایلز بیتھ بوون، ہنری گرین، فاکنیر، فاریل اور عظیم روایات جدیدہ کے بہت سارے امریکی مصنفین نے بڑا اچھا استعمال کیا ہے۔

ہماری ترقی پسند تحریک اصل میں انگلستان کے گلابی دور (Pink Decade) کے بائیں بازو کی فکری تحریک کی ایک صدائے بازگشت تھی۔ بائیں بازو والے حلقوں، یونیورسٹیوں اور معاشی بحران کے سوالوں نے مل جل کر مغرب میں اشتراکی حقیقت پسندی کو جنم دیا۔ یہ کرسٹوفر اشروڈ اور ہسپانوی خانہ جنگی کا زمانہ تھا۔

عظیم مایوسی کا دور دوسری جنگ کے دوران شروع ہوا۔ 1930 اور 1940 کے درمیان والے مفکرین نے عرصہ ہوا اپنی بازو کی ہمدردیوں کو ترک کر دیا ہے۔ آج کے انگلستان کے ناول نگار گراہم گرین، ایولن وا، جوالیس کیری (ان کا ابھی حال میں انتقال ہو گیا) اور اینگس ولسن یہ سب کے سب زندگی کی وہی تصویریں اور تعبیریں پیش کرتے ہیں جسے وہ خود دیکھتے ہیں اور اس ضمن میں کسی پروگرام کی تصدیق یا توسیع کو سامنے نہیں رکھتے۔

اردو کی ترقی پسند تحریک بھی اس مایوسی سے متاثر ہوئی اور ملک کی تقسیم نے اسے اور بھی پیچھے ڈال دیا۔ تاہم ساری کارکردگیاں ایک جھٹکے کے ساتھ انتشار کا شکار ہو گئیں اور اس بھگدڑ میں اردو کے ہندو ادیب ترک وطن کر کے ہندستان پہنچے اور بہت سارے اردو کے ادیب ہندستان سے مہاجرین پاکستان آئے۔ آزادی کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ اب حالات کافی مختلف ہو چکے ہیں۔ دم بھر میں نظریات بدل گئے اور نئے اتحادیوں نے جنم لیا۔ نئی جذباتی یگانگت شروع کرنا پڑی۔ پاکستان کے ترقی پسند ادیب ایک دم سے پکے فرقہ پرست بن گئے اور بہت سے ذہین لوگوں نے بھی اسلامی ادب اور پاکستانی ادب کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ ان سبھوں کا اظہار

اس عہد کے الجھے ہوئے فکر اور ادب کے بارے میں کئی بار کیے گئے مضحکہ خیز پالیسی بیانات میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ 1936 سے 1947 تک کا شاندار دور اب عہد ماضی کی چیزیں بن گیا تھا اور بیش تر لوگ اب صرف اپنے آپ کو دہرانے پر اکتفا کر رہے تھے۔ شاید اسی پس منظر میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آخر اختر حسین رائے پوری، احمد علی اور محمد حسن عسکری جیسے ادیبوں نے اس کے بعد کیوں کچھ نہیں لکھا۔

پاکستان میں ادیبوں کو اطمینان سے جمنے میں تھوڑی دیر لگی۔ گم شدہ افق کی یاد ان کے دلوں کو تڑپا رہی تھی اور ان کے ذہن و دماغ میں بے حد انتشار تھا۔

اور اس طرح ہم سب کے سب اپنے آپ کو آج کے حالات میں گھرا پاتے ہیں۔ ہم میں سے بہتوں کے لیے آج تکنیک کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور شاید مواد کی بھی۔ ہم لکھ رہے ہیں اور محض اس لیے کہ ہم سے لکھنے کی توقع کی جاتی ہے۔ ہمارے پاس بیان کرنے کو کوئی مخصوص چیز نہیں ہے اور نہ کہنے کو کوئی اہم بات ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ طبقہ واری رشتوں کے متعلق بے حد الجھے ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر اردو کا ادب متوسط طبقہ کا ادب ہے جسے متوسط طبقہ کے لوگوں نے متوسط طبقہ کے لوگوں ہی کے لیے تخلیق کیا تھا۔ گلابی دور میں بھی پرولتاری ادب کے علم برداروں نے خود پرولتاریوں کے لیے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ وہ پرولتاریوں کے بارے میں لکھ رہے تھے۔ ان کے اقدار مشترک نہیں ہیں۔ اس ملک میں پڑھنے والوں کا طبقہ افسوسناک حد تک مختصر ہے اور وہ لوگ جو کتابیں خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں بلاشبہ ممتاز مفتی کے اس ناول کو نہیں پڑھیں گے جسے وہ اب ختم کر رہے ہیں۔ نثار عزیز کے داخلی ذوق جمالیات کی تو قدر نہ ہوگی لیکن نام نہاد اسلامی ناولوں اور مصنوعی تاریخی رومانوں کے چند ہی ماہ میں کئی ایڈیشن شائع ہو جائیں گے اور لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ عامیانہ انداز میں لکھنے والے ترقی کے زینوں پر آگے بڑھتے جائیں گے اور تہذیب کا پردہ انسان پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگا۔

اب میں پھر یہ سوال دہراؤں گی۔ قطع نظر اس بات کے کہ ناول نگاری (یا پھر کسی بھی طرح کی مضمون نویسی) گویا ایک بن صلہ پیشہ ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ آخر ادیبوں کو لکھنے سے آج

کون سی چیز روک رہی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ابلاغ کی دشواریاں ہی ہمیں ڈبو رہی ہیں؟ ایک فرد کی حیثیت سے ہر ادیب ایک مختلف دنیا کا باشندہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوئے کہ ہر ادیب کو اپنے خول میں بند ہو جانا چاہیے اور خود کو ڈبو دینا چاہیے۔ اصل میں یہ دور جس میں ہم لوگ آج رہ رہے ہیں ای ایم فارسٹر کا 'انتشار نو' والا دور ہے۔ سیاسی اداروں کے ذلیل کرنے والے جو اثرات انسانوں پر مرتب ہوئے ہیں انھیں ہم لوگوں نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ ہم لوگ بے حد مضحکہ خیز زندگی گزار رہے ہیں اور آج ہمارے وجود میں تھوڑی مسرت باقی نہیں ہے۔ چاروں اُور بڑے زوروں پر نظریاتی مجادلے برپا ہیں۔ آرتھر کوئسلر اور اسٹیون اسپنڈر جیسے ادیب آج پکے مجاہدین بن چکے ہیں اور ہر ادیب سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس جہاد میں شریک ہوگا۔ ای ایم فارسٹر کی انسان دوستی کا عہد آج ختم ہو چکا ہے۔

لیکن جلد ہی یہ 'پرانی نسل والے' بے مقصد کے یہ باغی، یہ خارجی لوگ، یہ مجاہدین اور پھر یہ 'غصیلے نوجوان' یہ سب کے سب پرانے پڑ جائیں گے۔ آج کے امریکی ناولوں میں تو ایک نئی قسم کا سماجی شعور اب بڑی حد تک ابھر بھی چکا ہے۔

میرا خیال ہے کہ پاکستان میں جو آج جمود اور سناٹے کا دور ہے یہ بھی جلدی ختم ہو جائے گا۔ بہت سارے انسانی تجربے ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں اور ان پر کام کرنا ہے اور بہتیرے سماجی حالات ایسے ہیں جن کے بارے میں تحقیق و جستجو کرنا ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ اپنی گرفت کو قائم نہ رکھ سکے تھے اور خود کو بہکنے کے لیے چھوڑ رکھا تھا۔ فن کار اور اس فن کے نوازوں کے درمیان کی خلیج اب کافی بڑھ گئی ہے۔ کسی کو اب اس خلیج کو پاٹنا ہوگا اور ایسا کرنے میں اگر فن نواز کچھ برہم بھی ہو جائیں تو مضائقہ نہیں۔ اسٹیون اسپنڈر نے کسی موقع پر لکھا ہے کہ ادیب ہمیشہ اپنے قارئین ہی کے لیے نہیں لکھتا بلکہ کبھی کبھی ان کے خلاف بھی لکھتا ہے۔

تخلیقی ادیب ہمیشہ ہی غیر مقلد ہوتا ہے۔ اس میں مختلف آرا کے اختلاف کو سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے اور اسے کسی بھی حال میں لکھنا بند نہیں کرنا چاہیے۔ ایک تخلیقی ادیب کو اس کے علم، اس کی دانست، اس کی پرسوزی اور اس کے گہرے شعور سے قوت و نمو ملتی ہے

اور یہی باتیں اس کی عظمت کا سبب بنتی ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ عظیم ادبی فن پاروں کی تخلیق کا دور اب بے حد قریب، کہیں آس پاس ہی میں ہے؟ ہمیں پورے خلوص کے ساتھ اس کی امید رکھنی چاہیے۔

(بقول مصنفہ یہ مضمون انھوں نے انگریزی میں لکھا تھا جو ''پاکستان ٹائمز'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں پروفیسر وقار عظیم نے اردو میں ترجمہ کر کے رسالہ ''اشارہ'' لاہور، نومبر 1959 میں شایع کیا)

چاندنی بیگم کی واپسی

کیونکہ ابھی میں نے ''ایوان اردو'' (اگست 1991 عیسوی) میں ''چاندنی بیگم'' پر ڈاکٹر عبدالمغنی کا تبصرہ پڑھا لہٰذا ایک غلط فہمی کا ازالہ فوراً سے پیش تر ضروری سمجھتی ہوں۔ مولانا مودودی کا اقتباس میں نے لفظ بہ لفظ ''تفہیم القرآن'' (مطبوعہ پاکستان) سے نقل کیا تھا۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اس کو سیاق وسباق سے علاحدہ اور تلخیص وتحریف کے ساتھ پیش کیا ہے۔

''چاندنی بیگم'' گزشتہ سال ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شایع کی۔ اس کا فلم رول سنگ میل پبلشرز لاہور کو بھیجا گیا۔ جو انھوں نے طبع کیا (گو پاکستانی ایڈیشن کی طباعت اور کاغذ بے حد ناقص ہے) بہرحال اب زیر بحث موضوع کا اصل متن ملاحظہ فرمایئے۔

''وکی ماموں کہہ رہے تھے'' یہ دیکھو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن پارہ 29۔ آیت 28۔ اذشئنا بدلنا امثالھم تبدیلا۔

''مولانا لکھتے ہیں اس فقرے کے تین معنی ہو سکتے ہیں۔ ہم جب چاہیں انھیں ہلاک کر کے انھی کی جنس کے دوسرے لوگ ان کی جگہ لا سکتے ہیں۔ جو اپنے کردار میں ان سے مختلف ہوں۔ 2۔ ہم جب چاہیں ان کی شکلیں تبدیل کر سکتے ہیں یعنی جس طرح ہم کسی کو تندرست

اور سلیم الاعضا بنا سکتے ہیں اسی طرح ہم اس پر قادر ہیں کہ کسی کو مفلوج کر دیں۔ کسی کو لقوا مار جائے اور کوئی کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ ہم جب چاہیں موت کے بعد ان کو دوبارہ کسی اور شکل میں پیدا کر سکتے ہیں۔"

"ارے۔ یہ تو وہ نہیں ہے؟ کیا اسے کہتے ہیں۔"

"آواگون۔" پنکی نے فیروزہ کی مدد کی۔

"معلوم نہیں مولانا کا کیا مطلب ہے۔ مگر یہ تیسری بات ہم کہتے تو لوگ ہماری ٹھکائی کر دیتے۔"

"آپ آواگون کو مانتے ہیں؟" پنکی نے دریافت کیا۔

"بالکل نہیں۔"

(چاندنی بیگم، ص224-225۔ پہلا ایڈیشن، 1990 عیسوی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

پروفیسر عبدالمغنی کا تلخیص و تحریف شدہ اقتباس:

"دیکھو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن پارہ29، آیت28۔ اذاشئنا بدلنا امثالھم تبدیلا۔

مولانا لکھتے ہیں:

"اس فقرے کے تین معنی ہو سکتے ہیں ۔ ہم جب چاہیں انھیں ہلاک کر کے انھی کی جنس کے دوسرے لوگ ان کی جگہ لا سکتے ہیں، جو اپنے کردار میں ان سے مختلف ہوں (۲) ہم جب چاہیں ان کی شکلیں تبدیل کر سکتے ہیں۔ یعنی جس طرح ہم کسی کو تندرست اور سلیم الاعضا بنا سکتے ہیں اسی طرح ہم اس پر قادر ہیں کہ کسی کو مفلوج کر دیں۔ تیسرے یہ کہ ہم جب چاہیں موت کے بعد ان کو دوبارہ کسی اور شکل میں پیدا کر سکتے ہیں۔ آواگون۔ معلوم نہیں مولانا کا کیا مطلب ہے۔ مگر یہ تیسری بات ہم کہتے تو لوگ ہماری ٹھکائی کر دیتے۔" (ص224-225)

(ایوان اردو، اگست 1991 عیسوی، ص8)

ارے صاحب اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ مولانا مودودی مسئلہ تناسخ کے قائل نہیں تھے ظاہر ہے۔ لیکن دو ڈھائی سال قبل کراچی میں پروفیسر احمد علی سے (جنھوں نے قرآن شریف

انگریزی میں ترجمہ کیا ہے) تفاسیر کے متعلق بات ہو رہی تھی۔ میں نے اس سورہ کی تفسیر کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے بعض تفسیریں اس طرح لکھی گئی ہیں کہ ان سے اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے۔

وحدت الوجودی وکی میاں اسی باب میں ذرا آگے چل کر کہتے ہیں کہ وہ تناسخ کو نہیں مانتے مگر ''ایک یونیورسل اسپرٹ ہے سارے میں جاری وساری۔ یہی ویدانت ہے اور زین اور تاؤ۔ جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں ہفت صد ہفتاد۔''

کچھ دیر بعد ان کا بھانجا پنکی فیروزہ سے ان کے متعلق کہتا ہے، ایسے نفیس الطبع آشفتہ مزاج لوگوں کی اب ہماری سوسائٹی میں گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔''

اور آگے۔'' جاپانی باغیچوں میں زین کی روح انھیں بڑی صاف دکھلائی دے جاتی ہے۔ پورن برہم۔ یونیورسل اسپرٹ۔ پیڑ پودے پرندے ان میں شامل ہو کر یہ خود اور ہم سب بار بار نمودار ہوتے رہیں گے۔'' دفعتاً پنکی ہنس پڑے۔

''ماموں جان کی یہی بات سن کر ایک صاحب کہنے لگے۔ ذرا سوچئے۔ 2012 عیسوی کی ایک سہانی صبح ایک چڑیا بیڈ روم کے دریچے میں آن بیٹھے اور اچانک انکل وکی کی آواز میں تقریر شروع کر دے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔''

اس ناچیز کی تحریروں کو پڑھنے کے لیے تھوڑا سا سنس آف ہیومر ضروری ہے۔

زمین اور اس کی ملکیت اس پہلو دار ناول کا بنیادی استعارہ ہے جو پہلے باب کے تعارفی پیراگراف سے لے کر آخری صفحے تک موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی ارتقا کا عمل، پیہم تغیر، تبدیلی، تخریب وتجدید وتعمیر اور فطرت سے انسان کے اٹوٹ سمبندھ کی اشاریت بھی خاصی واضح ہے۔ اس سیاق وسباق میں چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔ قمر علی چاندنی بیگم کو وہ بوسیدہ کوٹھی دکھلاتے ہیں جس میں مرزا ہادی رسوا رہتے تھے۔ اس کے گرد جنگل اُگ آیا ہے۔ قمر علی جان عالم کا شعر:

وہاں جنگل ہے اب پر اس کے آگے
چمن تھا، گل تھے، ہم تھے، باغباں تھا

گنگناتے اپنے گھر پہنچتے ہیں۔ چند گھنٹوں بعد ہی مکان و مکین جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔اور وہاں بھی جنگل اُگ آتا ہے۔

''ندی میں بڑا زبردست سیلاب آیا۔ ریڈ روز کا ملبہ بہالے گیا۔ ساتھ ہی متوفین کی ہڈیاں بھی ندی میں پہنچ گئیں۔ مینڈک کے کزن پانی سے نکلے تھے۔ پانی میں واپس گئے۔

رفتہ رفتہ زمین ہموار ہوگئی سرسبز اور زرخیز۔ اس پر رنگ برنگے پھول اُگ آئے۔ پرانے بیج جو بھگوان دین نے بوئے تھے۔ نئے بیج جو چڑیاں چونچ میں لے کر جانے کہاں کہاں سے آتیں (یہ بستیوں اور ملکوں کے ازسرنو آباد ہونے کا استعارہ بھی ہے)

بیلا، گل عباس اور چاندنی کے پودے لہلہا اٹھے۔

اندھے کنویں کے چوگرد بھنگ پیدا ہوگئی۔ (یہ انسانی فطرت کے ان ناقابل فہم عناصر کا اشارہ ہے جن کی اب تک سائنس توجیہہ نہیں کر سکا۔) اس کے آس پاس گورے ہی منڈلانے لگے۔

ہاؤلی کی ہری سطح پر آبی پورے پھیل گئے۔

''ہمارے جدامجد۔'' ایک ہی نے منڈیر پر بیٹھی ہین کو ان پودوں کی طرح اشارہ کر کے اطلاع دی۔ وہ نم پتھر پر جمی کائی پر ہاتھ پھیرتا، ''ہماری جدہ۔''

دوسرا ہی چلم میں کوئلہ بھر کر آنکھیں نیم وا کرتا۔ ''یہ کوئلہ پندرہ کروڑ برس پہلے فرن کا ایک سوفٹ اونچا درخت تھا۔ اس کا دم لگا کر میں وہی فرن بنتا ہوں۔''

پھر وہ زمین پر رینگتے کیڑوں کو مخاطب کرتا۔ ''ہیلو کینچوے۔ ہائی مکڑ، ہیلو بچھو، گڈمارننگ چھپکلی، پندرہ کروڑ برس پہلے ہم نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تو بڑی مصیبتوں میں پھنسے مگر تم اتنے وفادار ہو کہ ہمیں یاد رکھتے ہو۔ قبر میں ہمارا ساتھ دینے آجاتے ہو۔ ہے۔ فریڈ—— دیکھو یہ قدیم کچھوا ندی سے نکل کر تم سے ملنے آیا ہے۔ ہیلو کزن کچھوے تمہارا دماغ اتنا چھوٹا رہ گیا۔ آرام سے ہو۔ ہمارا بڑا ہو گیا ہم بڑی آفتوں میں پڑے۔'' وہ حلقہ باندھ کر چلم پیتے اور کہتے ہم اولین اسپنج ہیں، ہم اولین کائی ہیں۔

کندھوں پر بال بکھیرے احساس سے عاری اسیج کے ایسے چہرے والی پون اپنے مرتبل بچے کو منڈیر پر بٹھال کر کنویں پر جھکی اپنی شکل ملاحظہ کرتی رہتی۔ اس نے جنگلی انجیر کے پتے توڑ کر ان کی اسکرٹ بنائی تھی۔

کوئی گورا خراباتی کابلی کے ساتھ بیر کتر تا رہتا۔

چلو اب یہاں سے آگے چلیں۔ پون فرمائش کرتی۔

ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ لاکھوں، کروڑوں برس، وہ آرام سے جواب دیتا۔

باب میں۔ پنکی لیلے کے ساتھ تفریحاً ایک بحث کر رہا ہے۔ ''سنو بھائی لیلے ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ معاملہ ابھی ارتقا کی بھول بھلیوں میں پڑا ہے۔'' آہا بیٹا قیس لاجواب کر دیا۔

بھول بھلیاں۔ سوچ کی انڈر گراؤنڈ ٹرین پر سوار وہ چھن بھر امام باڑہ آصفی پر رکی۔ آگے نکلی سلاطین دکن کے غمناک اجاڑ لرزہ خیز جنوبی قلعے پیچ دار تاریک سرنگیں تیز رفتار مشعل بردار رہبروں کی صدائے بازگشت۔۔۔ ایکو۔۔۔ ایکو۔۔۔ لٹل سر ایکو ہاؤ ڈو یو ڈو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ لٹل سر ایکو کم ڈانس ود می۔

جی بھر آیا۔ چھنگلیا سے آنکھ کا گوشہ خشک کیا۔ پور ڈیر صفیہ خالہ۔

اندھیری سرنگ کے باہر اچانک تیز دھوپ قلعہ دولت آباد کی خندق کے سبز پانی پر پھیلی سبز کائی۔ آبی پودے حیات اوّلین کے نقوش اوپر جاتی شکستہ قدیم سیڑھیاں ٹھنڈے سایہ دار درختوں کے نیچے براجمان نوادر فروش دولت مند گورے سیاحوں کو بیچتے وزنی موٹے ٹیڑھے عربی و فارسی ٹھپوں والے شاہان کہن کے، چمکیلے حروف والے گول سڈول ایسٹ انڈیا کمپنی کے، گویا شہر ایمان سے عہد ڈارون تلک کے سکے۔ جو بلواہوں کو کھیتوں کی مٹی میں ملا کیے۔ جیسے سنا ہے متا دھوبی ریڈروز میں ہل چلاتا تھا تو۔ ٹرین ایک خواہ مخواہ کی برانچ لائن پر چل پڑی۔ واپس آئی۔

''رائٹ پنکی تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔''

(چاندنی بیگم۔ ص، 358۔359)

امام باڑہ آصف الدولہ کی بھول بھلیاں کے علاوہ کلکتہ میٹرو اس تلازمہ خیال میں شامل ہیں (ایسا لگتا ہے جیسے مجھے بچوں کو یہ ناول سمجھانا پڑ رہا ہے)

ڈاکٹر عبدالمغنی نے فرمایا ہے کہ مقبول سیریل ٹیپو سلطان کا عکس بھی ناول میں ملتا ہے۔

بھائی یہ غضب تو نہ کیجیے۔ یہ ناول میں نے 1988 عیسوی میں لکھا تھا اور بہر حال ابھی یہ نوبت نہیں آئی کہ کمرشل فلمی سیریل مجھے انسپائر کرنے لگیں!! اور ٹیپو سلطان بار والے باب کا اس سیریل سے کیا تعلق ہے؟

اب تصوف کے اسرار اور دھندلکے پر آیئے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "چاندنی بیگم کی تعریف و توصیف کے فوراً بعد "ندائے کوہسار" کی صوفیانہ تعبیر سامنے آجاتی ہے۔ سینٹ چاندنی۔ سینٹ مونی۔ اس طرح محترمہ کی روحانیت حقیقت کو اساطیری رنگ دے دیتی ہے اور ایک زندہ کردار بھی فقط علامت بن جاتا ہے۔"

گزارش یہ ہے کہ اس عبارت میں کوئی تصوف وغیرہ مضمر نہیں ہے۔ ناول کے آغاز میں ہندستان و پاکستان کے جعلی کانونٹ اسکولوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حالاں کہ ہندستان میں عیسائی غیر ملکی مشنریوں کی پرزور مخالفت ہوتی رہتی ہے۔ اور اہل پاکستان اسلامی طرز حیات کے دعوے دار ہیں۔ چنانچہ صفیہ بھی ایک "کانونٹ" قائم کر لیتی ہیں جب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ایک "سینٹ جونز کانونٹ اسکول" نخاس میں چل رہا ہے تو وہ اپنے نام کی مناسبت سے "سینٹ صوفیہ" رکھ لیتی ہیں۔ ناول کے اس آخری باب میں جو کنڈر گارٹن وہ ریڈ روز کے احاطے میں زمین خرید کر قائم کرنا چاہتی تھیں اس کا نام انھوں نے خود ساختہ سینٹ روز سوچ لیا تھا۔ اب وہ اپنے نئے اسکول کے لیے بھی کسی "سینٹ" کا نام تلاش کر رہی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو وہ دن یاد آجاتا ہے جب ویلا چاندنی کو لے کر تین کٹوری ہاؤس آئی تھی۔ اپنے دبنگ منھ پھٹ انداز میں صفیہ کے "کانونٹ" کا مذاق اڑایا تھا اور اپنی باندرہ کلچر کی وجہ سے اس نے چاندنی کو مونی پکارا تھا۔ اسی تلازمہ خیال کی بدولت صفیہ چاندنی کے متعلق سوچنے لگتی ہیں۔ چاندنی کی نیکی اور شرافت یاد کرتی ہیں۔ مونی۔ مونا۔ سانتا مونیکا۔ سینٹ مونیز کانونٹ۔ ڈالی باغ۔ اچانک ان کو نام سوجھ

جاتا ہے اور وہ بشیر پینٹر کو بلواتی ہیں۔

معاف کیجیے گا اس واقعے میں اسرار کے بجائے محض سیدھی سیدھی Irony ہے۔ وہ غریب لڑکی جو خواہ مخواہ جل کر مر گئی ایک کمرشیل اسکول کی فرضی سینٹ بن جاتی ہے۔ لیکن مکمہ، قضاوقدر کی دوسری ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی رات صفیہ خود مر جاتی ہیں۔ گردپیش کے ڈیزائن میں ناچیز نے یہی منظر دکھلایا ہے۔ یعنی چاندنی رات میں تین کٹوری ہاؤس کی برساتی کی محراب سے ملحق نصف چبوترہ۔ اس چبوترے پر ایک چاندنی رات میں بیلا نے گایا تھا۔ مدتوں بعد ایک اور شب ماہ میں برساتی کے اندر کار میں بیٹھی صفیہ ارشد حسین کے واقعے سے (اور اب وہ شہلا اور ارشد کی منگنی کے ڈنر میں جا رہی ہیں) اپنے اندرونی حادثات کے صدموں کی انتہا تک پہنچ چکی ہیں اور اسی عالم میں ان کو اس چبوترے پر سے گزرتا ایک فیگر نظر آتا ہے جسے وہ پہلے ہیولا سمجھتی ہیں لیکن ان کے "کان کی آواز" سرگوشی کرتی ہے۔ "چاندنی بیگم۔"

اس Shock سے ان کی حرکت قلب بند ہو جاتی ہے۔

ہیولا جو صفیہ کو دکھلائی دیا اس کی سائنٹیفک توجیہہ فریب نظر التباس یا خلل دماغ ہوگی۔ پیرا سائیکولوجی والے اور اسرار پسند کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔

لاہور میں "چاندنی بیگم" پر جو سیمینار منعقد ہوا اس کے متعلق اپنے کالم میں مظفر علی سید رقم طراز ہیں کہ اب میں Middle-Brow لوگوں کی خاطر ماری کوریلی کی طرح لکھنے لگی ہوں۔

شاہ جی۔ تسی وی حد کر دے او۔

چند ماہ قبل پاکستانی صحافی خالد حسن نے سید صاحب موصوف کے تبصرے کا ایک جملہ وی آنا سے Relay کیا تھا۔

She has trivialised the characters تو سید صاحب جی کیریکٹرز کو Trivialise کیسے کرتے ہیں؟

اب چاندنی بیگم کی موت کا واقعہ لیجیے۔ شریر بچے پنکی سے چھینا چھپٹی میں عینک ٹوٹی۔ اس وجہ سے موم بتی نظر نہ آئی اور آگ نے اس لیے زور پکڑا کہ الحمدو کے منع کرنے کے باوجود بیلا نے

اپنا حکم چلانے کے لیے سارے لحاف توشک برابر کے کمرے میں رکھوا دیے تھے اور گھر میں کاغذات، نیوز پرنٹ کے گٹھے اور کتابوں رسالوں کے انبار موجود تھے۔ گیس سلنڈر بھی جو بلانے شوقیہ کچن بنوا کر اس میں لگایا تھا۔ واقعات کی اس زنجیر کو علت و معلول بھی کہا جا سکتا ہے اور مقدرات بھی۔

اسی سوختہ زمین پر کہانی آگے بڑھتی ہے۔ لیکن ناقدین اور بہت پڑھے لکھے قارئین شاکی ہیں کہ ہیروئن کو شروع میں مار ڈالا تو کہانی وہیں ختم کر دینی چاہیے تھی۔

جس طرح ہندستانی عوام فارمولا فلم پسند کرتے ہیں ہمارے اہل دانش بھی کیا فارمولا ناول پڑھنا چاہتے ہیں؟ یعنی اگر ہیروئین شروع ہی میں چل بسی تو کہانی آخر تک کیسے چلے گی؟ لیکن سینما کے ناظرین مطمئن بیٹھے رہتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ موت غلط فہمی ہے۔ ہیروئین پھر نمودار ہو جائے گی۔

تو اگر چاندنی بیگم آخر تک زندہ نہیں رہتی تو وہ ہیروئن نہیں ہے۔ اور اگر مرکزی کردار نہیں ہے تو ناول کا نام چاندنی بیگم کیوں؟

اور ایک ہیروئن نہیں تو کیا پانچ ہیں؟ یا کوئی ان میں سے ''اینٹی ہیروئن'' ہے؟

ایک مشہور ناقد نے مجھ سے اعتراضاً کہا تھا کہ آخر شب کے ہم سفر پیور ناول نہیں ہے۔ ''آگ کا دریا'' کو ٹوٹل ناول نہیں کہا گیا کیونکہ یہ اصطلاح اس وقت یہاں غالباً پہنچی نہیں تھی۔ ''کار جہاں دراز ہے'' بھی مغربی تنقید کے بہت سے نظریوں کی کسوٹی پر کسا گیا۔ پورا نہ اترا کہیں فٹ نہ بیٹھا۔ اس وقت تک non-fiction ناول بھی شاید کسی نے نہیں سنا تھا۔ بالآخر فیصلہ یہ کیا گیا کہ اسے Roots نے انسپائر کیا ہے۔ حالاں کہ وہ Roots کی اشاعت سے پہلے لکھا گیا تھا۔ اس کہانی کی داغ بیل میں نے یلدرم کی وفات کے چند روز بعد ہی ڈال دی تھی اور مدتوں بعد اس پر باقاعدہ کام شروع کیا۔ یہ میری والدہ کی ادبی روایت تھی۔ جنھوں نے 1942 عیسوی میں اپنے حالات زندگی بڑے دلچسپ انداز میں 1907 عیسوی سے بہ طور ''روزنامچہ'' لکھنے شروع کیے تھے اور وہ 1942 عیسوی ہی سے قسط وار ''تہذیب نسواں'' اور اس کے بعد ''عصمت''

میں چھپ رہے تھے اور اس لحاظ سے اس نئی ادبی صنف کی وہ ایک پیش رو تھیں۔ لیکن چوں کہ ہمارے ناقدین اور ادبی مورخوں نے اس نسل کی خواتین کو "ادنیٰ درجے کے ادب کا خالق" کہہ کر یکسر مسترد کر رکھا ہے لہٰذا کون تذکرہ کرے گا۔

ارے بھئی ایک سوانح عمری انتہائی غیر دلچسپ انداز میں لکھی جا سکتی ہے اور ناول کے پیرائے میں بھی۔ اس میں کون سی ناقابل فہم یا قابل اعتراض یا بحث طلب بات تھی؟

چونکہ ناقدین کے سنسر بورڈ نے اسے نہ سوانحی ناول کا سرٹیفکیٹ دیا نہ خود نوشت سوانح حیات کا لہٰذا سوانح عمریوں پر پی۔ ایچ ڈی کرانے والے گائیڈ اس کے مطالعے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

پاکستانی تبصرے سوائے محمد علی صدیقی کے مضمون کے (جس کا ذکر آگے آئے گا) مجھ تک نہیں پہنچے نہ اس سیمینار کے مقالے۔ لیکن سیمینار کا تذکرہ جو انتظار حسین اور مظفر علی سید نے اپنے اپنے انگریزی کالموں میں کیا، ان کے تراشے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مجھے بھیجے ہیں۔ مقالے پڑھے بغیر محض ان کالموں کی بنا پر بحث کرنا بے انصافی ہوگی۔ لیکن مظفر علی سید نے بعنوان A Noval on Trial لکھا ہے بطور وکیل دفاع اعجاز بٹالوی نے بیلا اور صفیہ کو قمبر علی کی گویاں بتلایا۔

بھئی اعجاز بٹالوی! تمھیں بیلا قمبر کی گوپی کی طرح معلوم ہوئی؟ وہ ایک بے حد مضبوط اور باشعور انڈیپنڈنٹ مزاج کی لڑکی ہے جو مرتے دم تک قمبر کو Defy کرتی ہے۔

(بر سبیل تذکرہ، بیلا کو میں نے بمبئی کے جس نچلے متوسط طبقے کے محلے ناگپاڑہ کا پروردہ بتایا ہے وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے حلقہ اثر میں تھا۔)

بیلا قمبر علی کے طبقے کی ریاکاریوں پر طعنہ زن رہتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی سابقہ زندگی کے افلاس اور محرومیوں کی وافر تلافی چاہتی ہے۔ اپنے ملازموں کو حقیر سمجھتی ہے اور خود ایک صاحب جائیداد بیگم صاحبہ بن کر رہنے کی خواہاں ہے۔ یعنی اس کا اوّلین جبلی اور فطری رویہ ذاتی سلامتی اور تحفظ کا ہے۔ کردار کے یہ تضاد خود ہمارے بڑے بڑے پروگریسو افراد

میں موجود تھے۔

بیلا ریڈروز کی ملکیت پر اس وجہ سے بھی مصر تھی کہ اس کی ماں چنبیلی قنبر علی ہی کے طبقے کے استحصال کا شکار رہ چکی تھی۔

اعجاز بٹالوی غور سے بات سنو کیونکہ تم لوگ چند روز انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں قیام کر کے، اور سیمیناروں اور دعوتوں میں شرکت کرنے کے بعد واپس چلے جاتے ہو۔ چاندنی بیگم ایک نمائندہ کردار ہے۔ باپ بیوی بچوں کو بے سہارا چھوڑ کر فرار ہوئے۔ سرحد پار پہنچ کر بے قصور ماں کو طلاق لکھ بھیجی۔ یو پی کے مڈل کلاس گھرانوں میں بے شمار واقعات اس قسم کے ہوئے۔ اس کے لیے کسی فلسفیانہ تاویل کی ضرورت نہیں۔

اعجاز حسین بٹالوی اس منظر نامے سے ناواقف ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں میں نے کراچی کا ہیرلڈ (اپریل 1991 عیسوی) دیکھا اس میں محمد علی صدیقی کا ریویو پڑھ کر البتہ تعجب ہوا۔ سنا ہے پاکستان میں اس نام کے دو نقاد ہیں۔ اگر ہیرلڈ کے بتصرہ نگار وہ محمد علی صدیقی ہیں جو 1958 عیسوی میں امروہے سے تشریف لے گئے تھے تو میں ان سے مخاطب ہوں۔

پہلی غلط بیانی تو انھوں نے یہ کی ہے کہ فرماتے ہیں ''آگ کا دریا'' کا ہیرو کمال اپنی جڑوں کی تلاش میں پاکستان سے انڈیا واپس آجاتا ہے۔ حالاں کہ ناول کا پلاٹ اس کے برعکس ہے۔ کمال یہاں ملازمت نہ ملنے پر پاکستان چلا جاتا ہے۔ محمد علی صدیقی صاحب نے آگے چل کر لکھا ہے:

Chandni Begum is symbolic of the post-independence of the Oudh Muslim gentry's drift towards decay and fall. She is only a "Ghost" of what she could have been had the subcontinent not been partitioned, Quratulain Hyder would like to suggest to us.

یہ تجاہل عارفانہ قابل داد ہے۔ موصوف کیونکہ 1958 عیسوی تک امروہہ میں موجود تھے۔ اس وقت تک انھوں نے حالات بچشم خود ملاحظہ نہیں کیے تھے؟

یہاں پر مسئلہ آرٹسٹ اور نقاد کے سیاسی اور سماجی رویوں کے اختلاف کا آجاتا ہے۔

اگر چہ یہ بھی ناگزیر ہے۔ اردو فکشن کی تنقید ترقی پسند تحریک سے پہلے ناپید تھی۔ اچانک ترقی پسند نقاد مارکس اور لینن کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں اترے اور ممتاز شیریں، محمد حسن عسکری، پروفیسر عزیز احمد وغیرہ مغربی یورپ کے ادب اور تنقید سے متاثر ہو کر گویا حزب مخالف کے طور پر صف آرا ہوئے (اب مجھے اتنے طویل عرصے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ ''پوم پوم ڈارلنگ'' عصمت چغتائی کے نام سے چھپا تھا لیکن اسے چند ترقی پسند ادبی عیاؤں کی سنڈیکیٹ نے مل کر لکھا تھا) سیاسی رویے جن میں بدقسمتی سے کہیں کہیں ہندستان اور پاکستان کے نظریاتی اختلافات بھی شامل ہیں، کسی نہ کسی طرح تنقید میں در آتے ہیں۔ سیاسی اور ادبی گروہ بندی، مصلحت کوشی، احباب نوازی، ذاتی ترجیحات اور تعصبات اور ان کے علاوہ پبلک ریلیشنز (جسے ہمارے ہاں ادبدا کر ''پبلک ریلیشنگ'' لکھا جاتا ہے) ان کی پرچھائیں اکثر تنقیدی مضامین پر پڑ جاتی ہے۔ اور یہ ہماری نئی ادبی کلچر ہے جو دراصل ہمارے مجموعی سماجی انتشار، ابتری اور اقتدار کے زوال کی آئینہ دار ہے۔

ایک معاملہ اور بھی ہے۔ ''آگ کا دریا'' پر ''جنگ'' کے مضامین کی اشاعت کے پندرہ سولہ سال بعد مجھے ایک خاتون نے جن کا اس اخبار سے گہرا تعلق ہے۔ بمبئی میں بتلایا کہ وہ مرحوم مضمون نگار (خدا ان کی روح کو نہ شرمائے) مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی خدمت میں اپنا کوئی کارنامہ پیش کر کے ایک زمین اپنے نام الاٹ کروانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے وہ مضامین لکھے اور پورے تیس برس بعد ''فنون'' لاہور کے ایک حالیہ شمارے میں میں نے پڑھا کہ جس عہدے پر میں تھی ایک صاحب وہ حاصل کرنے کی فکر میں تھے انھوں نے وہ مضامین لکھوائے اور میرے جانے کے بعد ان کو وہ عہدہ مل گیا (گو اس وقتی اخباری ہنگامے سے میری روانگی کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن چونکہ میں تقریباً سال بھر بعد انگلستان چلی گئی اور وہاں سے ہندستان آئی اس واقعے کو اس معاملے سے جوڑ دیا گیا۔)

خالص ادبی سنجیدہ تنقید کے ساتھ مغرب میں بھی طرف داریاں موجود ہیں۔ سلمان رشدی کا ''شیطانی اشعار'' بحیثیت لٹریچر ایک خراب ناول ہے (میں اسے پڑھ چکی ہوں) اس کی

تہلکہ خیز پذیرائی اہل مغرب کے اینٹی اسلام تعصبات کی غماز تھی۔ اور ان تعصبات کی جڑیں بھی بہت دور ماضی بعید میں پہنچتی ہیں۔ ہندو یا بودھ مت کی، خاص سرزمین یورپ پر کوئی آویزش عیسائیت سے نہیں ہوئی نہ اہل اسلام کی طرح یورپ پر ان اقوام نے صدیوں تک سیاسی تسلط رکھا۔ لہٰذا یورپین سائیکی میں انڈک مذاہب کے خلاف کوئی گہرا تعصب موجود نہیں بلکہ انڈک فلسفے جدید مغربی ذہن کے لیے پرکشش ثابت ہوئے ہیں اس کے برعکس بالخصوص عروج اسرائیل کی بدولت اینٹی اسلام رویے میں وہاں اور شدت آ چکی ہے۔

برطانیہ کو اقوام مشرق کی سیاسی آزادی خوش نہ آئی۔ چنانچہ ہر وہ ہندستانی ادیب جو اپنے ناولوں میں اپنے ملک اور تہذیب کا مذاق اڑاتا ہے وہاں مقبول ہے۔ میں یہ بات وہاں دولت مشترکہ کے ادارے کے ایک جلسے میں بھی کہہ چکی ہوں۔ بہت سے ادیب مغربی قارئین کو ذہن میں رکھ کر اس قسم کے ناول لکھتے ہیں اور ان کو وہاں فوراً شرف جاتے ہیں۔ برطانیہ میں ایشیائی اپنی مالی کامیابیوں کی وجہ سے مقبول نہیں۔ چنانچہ پاکستانیوں کے متعلق ایک نہایت بے ہودہ فلم (جس کا مصنف بھی ایک پاکستانی نژاد نوجوان ہی ہے) بے حد کامیاب ہوئی اور اسے انعام ملے۔ اس فلم میں ایک مولوی جائے نماز پر کھڑا اپنی داڑھی کے اندر سے غیر قانونی منشیات کی پڑیا برآمد کرتا ہے اور ایک پاکستانی لڑکی انتہائی فحش حرکتیں کرتی ہے۔ لیکن کسی پاکستانی نے اس فلم پر اعتراض نہیں کیا۔ ایک پاکستانی گھر میں اس کا ویڈیو دیکھا۔ اس پر احتجاج کرنے والی واحد ہستی بھی میں ہی تھی۔ تب مجھے پتہ چلا کہ قاضی جی شہر کے اندیشے میں کیوں دبلے ہوئے تھے۔

کلکتہ اور بمبئی کی گندی بستیاں مغربی فلم سازوں کے محبوب موضوع ہیں۔ فارس روڈ کے متعلق فلم ''سلام بومبے'' کی ڈائرکٹر بھی ایک ہندستانی خاتون ہیں۔ اس پکچر کی ساری دنیا میں دھوم مچ گئی ہے۔ ایک فرانسیسی فلم ساز بیگم سرو فرنچ ٹیلی ویژن کے لیے فلم بنانا چاہتا تھا۔ لیکن فنانس حاصل نہ کر سکا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ سسلی، یونان، نیویارک، ساؤتھ امریکہ میں بھی ہندستان جیسی غربت موجود ہے۔ مگر ہندستان کا افلاس مغربی فلموں کا کلیشے بن چکا ہے۔

اور کلیشے کس طرح بنتے ہیں۔ پھر اردو ادب کی طرف آیئے۔ کرسٹفر کا ڈویل کی

Studies in a Dying culture ترقی پسندوں کی بائبل تھی۔ پھر ''حزب مخالف'' کے ہاتھوں میں دوسری انتہا پسند کتاب The God that Failed نظر آنے لگی۔ ایک روز قدرت اللہ شہاب مرحوم یہ کتاب لے کر آئے اور فرمایا کہ میں اس کا ترجمہ کردوں۔ میں نے انکار کیا کہ کسی طرح کی انتہا پسندی مجھے پسند نہیں۔ بہر حال کر سلفر کا ڈویل کے دور میں میں بے چاری ایک نئی بنائی ''زوال پرست'' ترقی پسندوں کو مل گئی۔

میں ترقی پسند ادب کی بہت مداح اور معترف ہوں لیکن یہ بھی ماننا چاہیے کہ اس تحریک کے بیش تر ادبی نظریہ ساز فکشن کی سمجھ بوجھ سے عاری تھے۔ اب سرد جنگ کے خاتمے سے پہلے ہی ہوا کا رخ بدل رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اردو کے متعدد رائدۂ درگاہ ''زوال پرستوں'' کو کھینچ تان کر ترقی پسندوں کے بونا فائیڈ زمرے میں شامل کرلیا حتیٰ کہ جب ایک مشہور نظریہ ساز نے مجھ سے کہا کہ اواخر اُنیسویں صدی کے فرانس کے جمال پرست بھی بہت اہم ہیں تو اس بندی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

لیکن میرے لیے ''فیوڈل طبقے کی نوحہ خوانی'' کا جو لیبل یہی حضرات اس پچھلے دور میں لگا گئے وہ نقادوں کی ہر پیڑھی اور ہر مدرسہ فکر کو منتقل ہوتا گیا۔ چنانچہ ''چاندنی بیگم'' کی خالص عصری مسائل کی کہانی بھی ان کو ماضی کی نوحہ خوانی معلوم ہوئی کیونکہ وہ ماضی کو حال سے مربوط دیکھنا نہیں چاہتے۔

چند سال قبل میں نے ایک پرانی پینٹنگ دیکھی جس میں ایک وکٹورین میم صاحب آب دار خانے میں مونڈھے پر بیٹھی ہیں اور ہندستانی خانساماں ترازو لیے جنس تول رہا ہے۔ دوسرے ملازم آس پاس کھڑے ہیں۔ اس تصویر نے مجھے چونکا دیا۔ یہ بے حد مانوس منظر تھا کیونکہ بچپن میں دیکھا کرتی تھی جارجین ستونوں والے برآمد میں پینٹری کے سامنے بید کی کرسی پر متمکن میری والدہ خانساماں سے اسی طرح جنس تلواتی تھیں اور دوسرے ملازم آس پاس کھڑے ہوتے تھے۔ تو کیا وہ میموں کی نقالی کر رہی تھیں؟ جی نہیں۔

یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی کلچر کی پرچھائیں تھی جو اس وقت تک موجود تھی۔ ''چاندنی بیگم''

میں ریڈروز کے آتش دان پر سجے شاگرد، پیشہ ور اور اہل حرفہ وغیرہ کے مختصر ترین فیگرین نہ صرف لکھنؤ کے نادر روزگار کمہاروں کے فن کا نمونہ تھے بلکہ ان کا رابطہ جان کمپنی کی انھیں پرچھائیوں سے تھا۔ لکھنؤ کی حالیہ تعمیراتی تباہی کی جو تصویر میں نے ''گردش رنگ چمن'' میں پیش کی ہے وہ عالمی تہذیب کا ایک المیہ ہے۔ پیرس کے پرانے علاقے کی ایک ایک اینٹ قانوناً محفوظ کرلی گئی ہے۔ ذرا آپ جاکر فرانسیسیوں کو ماضی کا نوحہ خواں پکاریے۔ پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ علی گڑھ میں سرسید کی کوٹھی کا کھنڈر آزادی کے بہت برسوں بعد نظامی صاحب کی زیر نگرانی شعبہ تاریخ نے نہایت سلیقے سے ازسرنو تعمیر کروایا۔ اس میں سرسید میوزیم بنایا گیا۔ دو تین سال ادھر میں نثار عزیز بٹ کو بڑے جوش وخروش سے یونیورسیٹی دکھلانے علی گڑھ لے گئی۔ اور سرسید ہاؤس بھی گئی اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ اس سفید نیوکلاسیکل جارجین عمارت کا برآمدہ اور برساتی کے پیل پائے تیز نیلے چلچلاتے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی رنگ سے پوت کر غارت کردیے گئے ہیں۔ (یہ رنگ سرکاری اسپتالوں کی گیلریوں میں لگایا جاتا ہے) جب میں نے متعلقہ پروفیسر صاحب اور وائس چانسلر سے احتجاجاً پوچھا کہ ایسا کیوں کیا گیا تو جواباً انھوں نے گم سم رہ کر مجھے اس طرح دیکھا گویا میں ایک نہایت فضول، بے معنی اور احمقانہ بات کررہی ہوں۔

پچھلی بار جو علی گڑھ گئی تو جنرل پیرون کے افسروں کا آخری خس پوش بنگلہ بھی غائب تھا۔ یہ بنگلے انگریزوں نے سرسید کو کالج کے لیے دیے تھے۔ اور اواخر اٹھارویں صدی کی یادگار تھے۔ جب بقول سودا ہائیس صوبوں کے خاوند کے تصرف میں فوج داری کول بھی نہ رہی تھی اور مرہٹوں کے فرانسیسی جنرل پیرون نے یہاں چھاؤنی چھائی تھی۔ خانہ جنگیوں کے اسی دور میں ایک پٹھان سردار نے اپنا قلعہ تعمیر کرکے اس کا نام علی گڑھ رکھا تھا۔

لال ڈگی کے کنارے دوسو سال سے موجود یہ باقی ماندہ خش پوش بنگلہ اس وجہ سے بھی اہم تھا کہ مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اسی میں قائم کیا تھا۔ پچھلے برس اس کے وارثوں نے آپسی تنازعے کی وجہ سے اس کو نذر آتش کردیا۔

اس ایک معمولی سے بنگلے کی کیا حقیقت ہے۔ ہم اپنی تہذیبیں اپنے ہاتھوں سے تباہ کر

چکے ہیں (اوّلین اسلامی تاریخ کے نادرالوجود، بیش قیمت ترین آثار اور منفرد ترین یادگاروں کا باضابطہ اور مسلسل انہدام سعودی عرب میں میں نے خود دیکھا ہے۔ اور ساری اسلامی دنیا چپ بیٹھی ہے۔)

ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ لال ڈگی کے اس خس پوش بنگلے کا "چاندنی بیگم" کے تبصروں سے کیا تعلق ہے۔ حضور والا موجود تہذیبی بربریت کا تذکرہ میرے ناولوں کا ایک موضوع ہے۔ اسے میری کمزوری سمجھیے۔ دوسری کمزوری جس پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہانی میں انگریزی، اردو، ہندی گیتوں، نوحوں، مرثیوں، دوہوں کی بھرمار۔ مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح سوز خوانی میں "بازو" مستقل ایک سر چھیڑے رکھتے ہیں۔ موسیقی وجود کی ایک جہت ہے اور کم از کم میرے ہاں اس سے مفر نہیں۔ اس نقص کے لیے معذرت خواہ ہوں کیوں کہ یہ معاملہ سمجھانا بہت مشکل ہے۔

مثال کے طور پر دہر دون میں ایک انگلش گانا مع اس کے بے حد پر لطف اردو ترجمے کے ایک پرانے ریکارڈ میں موجود تھا۔ ایک بار ایک سوداگر شہر لندن میں تھا۔ جس کی ایک بیٹی نام اس کا ڈائنا سولے برش کا عمر۔ جس کے پاس بہت کپڑا چاندی اور سونا۔ ایک دن جب ڈائنا بگیچہ میں تھی۔ باپ آئی اور بولی بیٹی جاؤ کپڑا پہنو اور ہو صفا۔ کیونکہ میں ترے واسطے ایک خاوند لایا۔

ارے رے مورا باپ تب بولی بیٹی۔ شادی کا ارادہ میں نا ہیں کرتی۔ اگر ایک دو برس تکلیف نا ہیں دیو آ۔ آرے دولت میں بالکل چھوڑ دیوں۔

تب باپ بولا ارے بچہ بیٹی اس شخص کی جورو تو نا ہیں ہوتی۔ مال اور اسباب تیرا کر کی کر دیوں اور ایک کچی دمڑی بھی تجھے نا دیوں۔

ایک دن جب دلی کن ہوا کھانے کو گیا ڈائنا کا مردہ ایک کونے میں پایا ایک بادشاہ پیالہ اس کے کمر پر پڑا اور ایک چٹھی جس میں لکھا۔

"زہر پی کے مرا"

بعد میں میں نے اکثر سوچا کہ اس گیت کا اور بیجن کیا تھا؟ ابھی دو تین سال قبل عقدہ کھلا

(شاید میری مشکاف کے) روزنامچے میں پڑھا کہ دہلی میں جنرل اسکنر کی ایک ہندستانی بہو نے ان کو لندن میوزک ہال کا یہ مقبول گیت پیانو پر گا کر سنایا۔ (غالباً 1835ء) میں نے وہ کتاب جنرل اسکنر کے ایک مسلمان Descendant کو دے رکھی ہے ورنہ اس کا حوالہ دیتی بہر حال یہ تو معلوم ہوا کہ اس وقت اینگلو انڈین یا پوریشین اردو کا کیا پر لطف روپ تھا۔ اور یہ گانا گراموفون کے عہد تک مقبول رہا۔

فن تعمیر موسیقی، سنگ تراشی، ادبیات، سب غیر مرئی وجدانی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

وہ روح عصر کی ترجمانی کے علاوہ ابدی سچائیوں اور جمالیات کی ابدی قدروں کا احاطہ بھی کرتے ہیں۔

ہمارا ماضی مثبت اور منفی دونوں طرح حال سے مربوط ہے۔

انگریز حکام نے مغلیہ صوبے داروں کا کردار اپنایا۔ بالخصوص جب وہ دورے یا شکار پر جاتے تھے۔ اس کی جھلک میں نے ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' کے کیمپ میں دکھلائی ہے۔ مغربی معاشرے میں وزیروں یا سول سروس کے عہدے داروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں وہ بادشاہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہماری اپنی ذہنیت نے برطانوی کولونیل روایات کو برقرار رکھا ہے۔ لیکن ہمہ وقت انگریزوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ یہ ڈبل تھنک ہماری قومی خصوصیت ہے اور ہم یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں کہ ہم بنیادی طور پر جاہ پرست اور اقتدار کے پجاری ہیں۔

''گردش رنگ چمن'' کے لیے میں نے ملکہ جان کے متعلق کچھ میٹریل برٹش لائبریری لندن سے حاصل کیا اور ٹیپو سلطان کی فوجی موسیقی کے متعلق معلومات بھی۔ 1986 عیسوی میں انڈیا آفس کے لائبریرین سلیم قریشی صاحب نے ٹیپو سلطان کا خواب نامہ بھی دکھلایا جس کی فوٹو کاپی میں نے بعد میں ان سے منگوائی۔ اب تک اس ارادے پر قائم ہوں کہ پہلی فرصت میں میں اس خواب نامہ کی (جو سلطان شہید نے اپنے قلم سے لکھا تھا) گنجلک فارسی عبارت Decipher کروا کر اس کا ترجمہ انگریزی میں کروں۔ اس کے محض ایک حصے کا ترجمہ اب تک انگریزی

میں ہوا ہے۔ جس قسم کے ناول میں لکھتی ہوں ان کے لیے تو ریسرچ ظاہر ہے کہ بے حد ضروری ہے۔ علاوہ ازیں مصوری، آرٹ، ہسٹری، آرکیالوجی اور موسیقی سے میری گہری دلچسپی اس چھان پھٹک میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ کون سی انوکھی بات ہے۔

اسی اپریل میں کرسٹی کے مشرقی نوادر کے ایک بڑے نیلام میں یاسمین شاہد حسین کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا۔ یاسمین لندن میں نادر کتابوں اور نایاب تصاویر کا کاروبار کرتی ہیں۔ کرسٹی کے ایوانوں میں خریداروں کا جم غفیر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کے اہل ثروت ہمارے نوادر سے کتنی گہری دلچسپی اور واقفیت رکھتے ہیں) ان گنت فولیوز میں مغلیہ، راجپوت اور کمپنی پیریڈ کی تصاویر محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک لاجواب مینا تور میں ''علالت سے صحت یاب ہونے کے بعد ایک مغل شہزادہ'' انگلش فیشن ڈریسنگ گاؤن پہنے جس کے کالر پر فرلگی ہے، اس قلعے کے باغ میں رات کے وقت کنیزوں کے ساتھ (جنھوں نے شمع دان اٹھا رکھے ہیں) چہل قدمی کر رہا ہے۔ یہ ریلسٹک تصویر 1802 عیسوی میں بنائی گئی تھی۔ جب دلّی پر برطانوی کلچر کی چھاپ لگی تھی۔ ایک مرتبہ ایک تصویر دلّی کے ایک ذخیرے میں دیکھی جس میں واجد علی شاہ رابنہ اندرز کے لباس میں تخت پر جلوہ افروز تھے اور ان کی خواصیں پرلگائے سامنے کھڑی تھیں۔ اس تصویر نے یہ سوال بھی حل کر دیا کہ جان عالم نے اندر سبھا میں خود حصہ لیا تھا یا نہیں۔ جان عالم کی یہ روایت اودھ میں صدی تک قائم رہی جب شوقین رؤسا خود بھی اندر سبھا کا سوانگ رچتے تھے اور ان کے ہاں ڈومنیاں اور میراثنیں پریاں بنتی تھیں۔ پرائیویٹ تھیٹر کی روایت بنگال میں موجود تھی جسے ٹیگور نے جلا دی۔

''نشتر'' جسے اردو ناول کے ایک مورخ نے مترجم کی طبع زاد تخلیق بتایا ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کے بعد اس کا تعارف لکھنے کے لیے بہت ریسرچ کی اور اندازہ لگایا کہ غالباً گولہ گنج لکھنؤ میں کلن کی لاٹ جن میجر جان کولنز کی قبر ہے وہی نشتر کے کلن صاحب ہیں۔ مشہور ہندی ادیب اصغر وجاہت سے (جن کا تعلق آغا میر کے خاندان سے ہے جو کانپور جلاوطن کیے تھے) میں نے جاج مئو کے متعلق استفسار کیا۔ انھوں نے بتلایا کنار دریا جاج مئو ایک نہایت خوش

منظر قصبہ ہے جس میں کمپنی بہادر کے انگریز ویک اینڈ منانے جایا کرتے تھے۔ اور ان کے چند بنگلے ابھی باقی ہیں۔ قدیم جاج مئو اور اس کے قریبی قصبات میں شیعہ سادات حکیموں کے کنبے بھی موجود ہیں۔ نشتر کے مصنف سید حسن شاہ کے نانا بھی حکیم تھے۔ روہیلہ دربار کے زوال کے بعد بریلی سے آکر وہاں بس گئے تھے۔ اور انگریزی چھاؤنی میں منشی گیری کرنے لگے تھے۔ اور بے روزگاری اور معاشی تباہی کا یہ وہی اندوہناک دور تھا جس کی نوحہ گری سودا اپنے شہر آشوب میں کررہے تھے۔ تو ملاحظہ فرمایئے کہ کس طرح کڑیوں سے کڑیاں ملتی ہیں۔

مصنف حسن شاہ بھی اپنے انگریز افسر کی ملازمت کی کڑی پابندیوں کی وجہ سے بروقت لکھنؤ نہیں پہنچ پاتا۔ اور غالباً 1787 عیسوی میں خانم جان مرجاتی ہے۔ اسے بھیم کے اکھاڑے کے قبرستان میں دفن کرتے ہیں (جہاں 1810 عیسوی میں میر سپہر دخاک کیے گئے) چوھدری کی گڑھیا، بھیم کا اکھاڑہ ست ہٹی، اٹھارھویں صدی کا لکھنؤ تھا۔ اس کے آگے سے باغات شروع ہو جاتے تھے۔ آصف الدولہ نے ٹیلے والی مسجد کی طرف ہی اپنا قلعہ بنایا ہوگا۔ بکسر کی شکست کے بعد انگریز زبردست سیاسی طاقت پکڑ چکے تھے۔ معاہدہ فیض آباد کے مطابق آصف الدولہ کا کانپور، فرخ آباد اور چنارگڑھ میں کمپنی کی فوجیں رکھنے کی اجازت دینی پڑی تھی۔ ''نشتر'' میں ان تمام چھاؤنیوں کا ذکر ہے جہاں انگریزی افسر ہندستانی عورتیں حاصل کر کے اپنے حرم میں رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں انگریزوں کی چھاؤنی بھیم کے اکھاڑے کی طرف رہی ہوگی۔ کیونکہ گولہ گنج میں انگریزوں کا قدیم قبرستان ہے۔ امام باڑہ آصفی کے عقب میں کمپنی باغ بھی اسی زمانے کا ہے۔ جب خانم جان کو بغرض علاج اس کا کنبہ چنارگڑھ سے لکھنؤ لایا تو وہ بھیم کے اکھاڑے میں اترا۔ اس کی وجہ بھی یہی رہی ہوگی کہ ڈیرے دار طوائفوں کا ڈیرا انگلش چھاؤنی ہی میں ملا۔ عہد آصفی کے مصوروں کی بنائی ہوئی دو حقیقت پسند مغربی طرز کی بہت بڑے سائز کی تصاویر ناچ گرلز اور ان کے سازندوں کی لندن کے ایک پرائیویٹ ذخیرے میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک تصویر کیا پتہ خانم جان اور اس کے طائفے کی ہی رہی ہو!

''نشتر'' میں ہر مغنیہ کلام حافظ کا کر رقص کرتی ہے اور فارسی داں انگریز اس پر سر دھنتے

ہیں۔ پوری ایک صدی کے بعد جان ہمر نے اپنی کتاب Memoirs of a Bengal Civilian میں لکھا کہ بنگال کی ہر طوائف حافظ کی غزلیں گاتی ہے۔

''نشتر'' میری تحقیق کے مطابق ہندستان کا نہ صرف پہلا ناول ہے بلکہ یہ بیش تر ترقی یافتہ روسی اور انگلش ناولوں سے بھی پہلے لکھا گیا تھا۔ دوسری بات جو بہت ہی قابل ذکر ہے کہ بیس سالہ مصنف یقیناً انگریزی سے نابلد تھا۔ اسے انگلش جاننے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیوں کہ تمام انگریز اردو اور فارسی داں تھے اور اگر وہ انگلش جانتا تھا تو اس کے مربی مسٹر منگ نے ہم عصر انگلینڈ کے ناول نگاروں کا تذکرہ اس سے نہ کیا ہوگا۔ مسٹر منگ اور اس کے ہم وطن دوستوں کو عیاشی سے کہاں فرصت تھی۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے محمد حسن شاہ نے اپنی خلاقی سے یہ ناول جس کا بیانیہ بالکل آج کا اسٹائل ہے اور جس میں اس نے مکالمے بھی ڈرامہ نگاری کے اس انداز میں نہیں لکھے جو ہمارے یہاں پریم چند تک رائج رہا۔ کہیں کہیں روایتی، مشرقی، عبارت آرائی اور شاعرانہ غلو کے باوجود ناول کا پورا سانچہ اور کردار نگاری حقیقت پسند اور انسانی نفسیات سے مصنف کی واقفیت کی آئینہ دار ہے۔ ناول کے آخر میں جب حسن شاہ بھیم کے اکھاڑے کے قبرستان میں شدت غم سے غش کھا کر گر پڑتا ہے اور لڑھکتا ہوا ایک قبر کے گڈھے میں جا گرتا ہے۔ خانم جان کا چھوٹا منہ بولا بھائی اسے کھینچ کر نکالتا ہے۔ لیکن اس کا ایک جوتا گڈھے ہی میں رہ جاتا ہے۔

ایسی دل کو چھو لینے والی حقیقت نگاری ہمارے یہاں ناول میں 1790 عیسوی میں کی گئی۔

اب یہ سوچ کر تعجب ہوتا ہے کہ میرا سارا ادبی کیریئر خواہ مخواہ ایک قسم کا مجاہدہ کیوں رہا ہے۔ اوّلین افسانے کی اشاعت سے لے کر آج تک ہمیشہ کوئی نہ کوئی شور مچتا رہا۔ کیا اس لیے کہ میں مروّجہ منظور شدہ روّیوں سے علاحدہ جیسا ٹوٹا پھوٹا مجھے آیا بے ساختگی سے لکھا کی؟ ''چاندنی بیگم'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ''گردش رنگ چمن'' کے بعد عام شکایت یہ رہی کہ آپ پیری مریدی میں کیوں پڑ گئیں۔ (گو حال ہی میں مجھے اطلاع ملی ہے میری حقیقی اور اکلوتی پھوپھی مرحومہ کا سالانہ عرس شاہجہاں پور میں عرصے سے ہو رہا ہے جس میں دور دور سے قوال آتے ہیں اور مرحومہ نے کبھی ولایت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ان کے والدہ کے ماموں حضرت مولانا فضل الرحمٰن

گنج مراد آباد ضلع اُناؤ کے خلیفہ تھے) دراصل پرویلم یہ ہے کہ میری خاندانی بیک گراؤنڈ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی متنوع رہی ہے۔ اس میں اہل طریقت بھی شامل ہیں اور اہل تشیع بھی اور ایسے حضرات بھی مولانا علی میاں جن کے مداح ہیں! میں زندگی کی اس رنگارنگی کو بہت معنی خیز اور دلچسپ پاتی ہوں اور تصویر کے دونوں رخ پیش کرنا چاہتی ہوں۔ پاکستان، ہندستان۔ ہندو مذہب، اسلام۔ شیعہ، سنی۔ جہاں تک میں جانتی ہوں بساط بھر میں فریقین کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ امریکن یونیورسیٹوں کے لیکچر ٹور میں اگر خواتین کے متعلق بات ہوتی تو میں پاکستانی خواتین کی ترقی کا تذکرہ بھی کرتی تھی (اور اس وجہ سے ایک محفل میں ایک صحافی لڑکی مائیک پر جا کر بولی، ''ہم نے سنا ہے آپ کہتی ہیں کہ پاکستانی عورتیں ذہنی طور پر بہت پس ماندہ ہیں'' تو کیا مجھے غصہ نہ آتا؟ حد تو یہ ہے کہ میں روس میں امریکہ کے منفی امیج اور امریکہ میں روس کے خلاف غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ان دونوں ملکوں میں کرنے میں جٹی رہی بہ طور خدائی فوج دار۔

آوارہ وطن بنگلہ دیشیوں کے المیے کی ایک جھلک میں نے ''چاندنی بیگم'' میں پیش کی ہے اور اس صورت حال کی شدید Irony کہ وہ بے روزگار لوگ کراچی پہنچنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہیں۔ پچھلے سال کلکتہ میں ایک بنگلہ دیشی خاتون سے ملاقات ہوئی جو حقوق نسواں کے متعلق ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائی تھیں۔ آوارہ وطن بنگلہ دیشی عورتوں کی درگت کے متعلق ان سے پوچھا۔ وہ مغربی دنیا میں جہاں جہاں حقوق نسواں پر سیمینار ہوتے ہیں بطور مندوب جایا کرتی ہیں۔ انھوں نے فخریہ بتایا۔ لیکن میرے سوال کا جواب نہیں دیا کیونکہ وہ نیو مارکیٹ پہنچنے کی جلدی میں تھیں۔

گزشتہ بیس پچیس سال کے عرصے میں سینکڑوں جناتی مضامین جدیدیت، تجریدیت، رمزیت، علامت نگاری وغیرہ وغیرہ پر لکھے گئے۔ سیمینار ہوئے۔ لیکن اس ناول ''چاندنی بیگم'' کے بالکل آخر میں بسنت کے ڈوپٹے رنگنے کی معنویت نظر انداز کر دی گئی۔

جنگ بنگلہ دیش کے متعلق ایک افسانہ ''ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی'' کو اس کے واضح

کلیدی اشاروں کے باوجود ایک ناقد نے سوویت یونین کی آمریت کے متعلق افسانہ قرار دیا! بمبئی کے ایک مشہور برافروختہ بقراط نے اطلاع دی کہ یہ افسانہ جہاں ختم ہوتا ہے دراصل وہاں سے شروع ہوتا ہے یعنی الٹا چلتا ہے (یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی)

ایک اور کہانی ''دریں گردسوارے باشد'' 1980 عیسوی کے مرادآباد کے فساد کے متعلق تھی۔ امروہے کے ایک فرضی کردار کلوخاں رکشے والے کے اجداد نواب محمد رضا خاں نائب ناظم بنگالہ بہار اڑیسہ کے غلام تھے۔ دوسو سال بعد بھی کلوخاں خستہ حال ہی رہے۔ وہ نواب محمد رضا خاں کی نگڑ پوتی کو اپنی سائیکل رکشہ پر بٹھال کر ایک گھر میں امام زین العابدین کے تبرکات کی زیارت کے لیے لے جاتے ہیں۔ ان تبرکات میں سے ایک تلوار کے لیے مشہور ہے کہ جب کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہو اس کی سطح پر دھبے سے نمایاں ہوجاتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد شہر مرادآباد میں خوں ریزی ہوتی ہے۔ اس میں خاکروبوں کے رول کا تذکرہ اخباروں میں بھی آتا ہے۔ جب خاکروبوں کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے تو چند بے انتہا تہی دست افراد یہی کام شروع کردیتے ہیں۔ کلوخاں جن کو تپ دق ہوچکی ہے اور رکشا نہیں چلا سکتے امروہہ سے مرادآباد آکر ''کلوا حلال خور'' بن جاتے ہیں۔

''دریں گردسوارے باشد'' میں مرادآباد کی ظروف سازی اور دوسرے اشارے بہت ہی صاف صاف موجود ہیں۔ لیکن ایک مشہور ناقد نے مسلمانوں کی نئی زر پرستی کو اس افسانے کا موضوع بتایا۔ گزشتہ سال اردو تہذیب کے ایک بڑے مرکزی شہر میں جہاں میں صرف دو یا تین دن کے لیے گئی تھی بھاگم بھاگ میرے لیے ایک ادبی نشست منعقد کی گئی۔ برستی بارش میں دور دور سے خواتین وحضرات تشریف لائے۔ میں نے ''دریں گردسوارے باشد'' پڑھا۔ وہ جملے جو کلوخاں کی ٹریجڈی کی تشریح کرتے تھے سامعین نے ان کو لطیفہ سمجھ کر قہقہے لگائے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ ایک نامور نقاد بالکل چپ گم سم بیٹھے رہے۔ انھوں نے بھی اس افسانے کی معنویت حاضرین کو سمجھانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ نہ اس کے متعلق مجھ سے کوئی بات کی۔ جیسے گم سم آئے تھے ویسے ہی اٹھ کر چلے گئے۔ اس میٹنگ کے آغاز میں ایک نوعمر ادیب

نے کہا تھا کہ غالباً یہ اردو کا آخری گیان پیٹھ ایوارڈ ہے تو مجھے اس مایوسی پر افسوس ہوا تھا۔ محفل برخاست ہوئی تو میں نے سوچا کہ اس ماحول میں غالباً اس کی ناامیدی بے جا نہ تھی۔

لیکن پاکستان جہاں کی قومی زبان اردو ہے اور جہاں ادبی سرگرمیاں، کتابوں کی رونمائی وغیرہ روز افزوں ماشاءاللہ ترقی پر ہیں وہاں پر اس ناول کا تھیم سمجھنے میں کیا دقت پیش آسکتی ہے؟ کیا اس وجہ سے کہ وہاں کے قارئین آج کے ہندستانی کرداروں سے Relate نہیں کر سکتے؟ راقم الحروف نے بارہ تیرہ کتابیں لکھی ہیں جو پاکستان میں چالیس مختلف عنوانوں کے ساتھ ساتھ دھڑا دھڑ چھپتی رہتی ہیں۔ یعنی میری تصانیف کے غیر قانونی ایڈیشن شایع کرنا عرصہ دراز سے وہاں کی ایک باقاعدہ پبلشنگ انڈسٹری ہے۔ اور اس تمام فکشن کا پس منظر ہندستان ہے تو قارئین ان کرداروں سے کس طرح اپنا ذہنی اور جذباتی رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔ ''گردش رنگ چمن'' پر فکر انگیز طویل مضامین کا سلسلہ وہاں انگلش پریس میں ڈیڑھ دو سال تک جاری رہا۔ جبکہ اس کا موضوع بھی عصری ہندستان ہی تھا۔ ''چاندنی بیگم'' کا معاملہ یہ ہے کہ جس وقت میں تقسیم شدہ کنبوں کی یہ کہانی لکھ رہی تھی مجھے معلوم تھا کہ پاکستان میں اس کا منفی ردعمل ہوگا۔ ہمارے پڑوسی ایک اوپن سوسائٹی اور اختلاف رائے کے عادی نہیں رہے۔ بٹے ہوئے خاندانوں کا کرب ایک سیاسی مسئلہ قطعی نہیں ہے۔ یہ ایک Human المیہ ہے اور یہ سوائے مہاجرین کی پہلی نسل کے کسی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نسل کے سفر آخرت کے بعد یہ مسئلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ چلو یہ بات تو یوں طے ہوئی۔ اب یہ کہ ایک ہی کنبے کی دو شاخیں جو مختلف ملکوں میں پروان چڑھی ہیں، ظاہر ہے ان کے رویے اور خیالات بھی مختلف ہوں گے اور اس حقیقت کا تجربہ بھی فرسٹ جنریشن مہاجرین کو بخوبی ہے جو رشتے داروں سے ملنے یہاں آتے رہتے ہیں۔ اور عرض یہ ہے کہ ''پروین سلطانہ'' بالکل ایک ٹائپ اور نمائندہ کردار ہے۔ برا ماننے کی قطعی ضرورت نہیں۔

قومی شناخت کا معاملہ بھی اب عالم گیر ہو چکا ہے۔ اس کے لیے وکی میاں کہہ گئے ہیں کہ اب قومیت کا دارومدار اس واقعے پر منحصر ہے کہ تم کو کس سفید ملک کا پاسپورٹ زیادہ آسانی سے مل جائے۔

کیا یہ ایک سچائی نہیں؟

اتفاق سے ابھی 9 ستمبر سے جرمن اور ہندستانی ادیبوں کی ایک کانفرنس برلن میں منعقد ہورہی ہے جس کا موضوع بالکل یہی ہے یعنی Flight Dislocation and Identity کیونکہ پچھلے چالیس پچاس سال سے ان دونوں ملکوں کی آبادیوں کو مسلسل ہجرتوں اور منقسم خاندانوں کا تجربہ کرنا پڑا ہے۔ اس کانفرنس میں پروفیسر گنگا دھر گدگل اور دلیپ چترے (مراٹھی) امت مورتی (کنڑ) بھیشم ساہنی اور نرمل ورما (ہندی) سنیل گنگو پادھیائے الوک رنجن داس گپتا اور ناچیز کے علاوہ آٹھ جرمن ادیب شرکت کریں گے۔ ہندستانی ادیبوں کے تراجم کے لیے میں نے ''آگ کا دریا'' اور ''چاندنی بیگم'' کے چند صفحات بھیجے ہیں۔ ان تمام جرمن ادیبوں کے انگریزی تراجم یہاں آگئے ہیں تاکہ کانفرنس میں بحث مباحثہ آسانی سے ہوسکے۔

ایک جرمن نظم کا عنوان ہے ''گم شدہ زبان کی تلاش۔'' پولینڈ کی ایک لڑکی کو دوران جنگ اپنی جگہ سے اکھڑنا پڑا۔ دوسرے ملک میں آکر اس نے اپنے قدم جما لیے۔ لیکن اب مدتوں بعد وہ اپنی گم شدہ زبان کو تلاش کرتی پھرتی ہے۔ یہ ساری دنیا کے ''فرسٹ جنریشن'' جلاوطنوں کی ٹریجڈی ہے۔

''گم شدہ زبان'' پر یاد آیا کہ ''گردش رنگ چمن'' میں میں نے اردو کے متروک الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ''چاندنی بیگم'' کی زبان کے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی فرماتے ہیں:

''اودھی، بھوجپوری بولیوں پر مشتمل عبارتیں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ وہ کرداروں سے منسوب ہیں اور زیادہ تر ناخواندہ عورتوں یا ملازموں کی زبان سے ادا ہوئی ہیں۔ یہ ایک لحاظ سے ان ٹھیٹ پراکرتوں کا استعمال ہے جن سے اردو اپنے تشکیلی دور میں انھیں پیچھے چھوڑ چکی یا انھیں ترقی دے کر ان کے اندر ایک شائستگی پیدا کر چکی ہے۔ بہرحال مقامی بولیوں کا مصرف حقیقت نگاری کے خیال سے کیا گیا ہے اور اس کا مقصد کرداروں کی ہستی کا ثبوت دینا ہے۔ لیکن اس مقامیت سے اظہار و بیان کے سانچے ڈھیلا ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔''

گزارش یہ ہے کہ بھوجپوری اور اودھی محض ناخواندہ عورتوں اور ملازموں کی زبان نہیں

بلکہ پڑھے لکھے خواص بھی گھر میں بولتے ہیں اور ان بولیوں میں اردو فارسی بھی بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ دوسری بات کہ چونکہ اردو اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہے لہٰذا اس طرح کی زبان سے اردو کی فصاحت و سلاست پر غلط اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ تو معاف کیجیے گا ایسا ہی ہے جیسے کسی انگریز افسانہ نگار سے کہا جائے چونکہ انگلش ایک نہایت ترقی یافتہ زبان بن چکی ہے تم اپنے Cockney کرداروں سے بھی اوکسفرڈ اور کیمبرج کی انگریزی بلواؤ۔

''چاندنی بیگم'' میں بنے چچا، عمن خاں اور امام باندی روہیل کھنڈی یعنی پچھوا اردو، اور ارشد حسین بہاری اردو میں بات کرتے ہیں۔ امام باندی کا لہجہ خالص امروہے کا ہے۔ اس خطے میں میر و سودا کی زبان اب تک زندہ رہی ہے لیکن بہت جلد اردو کی یہ دل کش وسعت اور تنوع رامپور اور مراد آباد کی اردو کا بانکپن اور ٹھسا لکھنؤ اور اس کے اطراف کی اردو کا لوچ، شیرینی، اور نفاست، بہاری لہجے کا ایک نوع کا بھولپن یہ سب بہ سرعت زائل ہوتا جائے گا۔ پاکستان میں پنجابی اور ہندستان میں دور درشن کی ہندی اردو زبان پر چھا رہی ہے۔ ہندستان کے اردو اخبارات میں اکثر آپ کو اس قسم کی عبارتیں مل جائیں گی۔ دلّی میں ہو رہے دنگے کو لے کر ہم بھلے ہی نہ چلیں وغیرہ۔

جی تو ڈاکٹر صاحب میں نے بہرائچ کے میلے کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ آج ہم ہندستان میں جس زبردست اینٹی سیکولر انقلاب سے دوچار ہیں اس وقت ایک مخصوص دینی مدرسہ فکر کی طرف سے درگاہی کلچر کی مخالفت کوئی دانش مندی نہیں۔ تعزیہ داری کی طرح درگاہوں نے اسلامی رواداری کی سیکولر روایات کو برقرار رکھا ہے اور شدید تنگ نظری کے اس موجودہ ماحول میں بھی دوسرے فرقوں کے افراد کے لیے پرکشش ہیں۔ ذرا اس نکتے پر غور کیجیے گا۔ میری ناقص عقل میں تو یہی آتا ہے۔

آخر میں حضرت موسیٰ کے متعلق غلطی کی نشاندہی کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔ دراصل جب لکھ رہی تھی تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ سوچا تھا ابھی چیک کر لوں گی۔ لیکن نظر ثانی کرتے وقت یاد نہ رہا۔

میں اپنے ادب کے متعلق از خود کبھی بات ہی نہیں کرتی۔ دوران گفتگو کوئی اس کا تذکرہ چھیڑ دے تو ہمیشہ ٹال جاتی ہوں۔ کیونکہ مجھے اپنے متعلق بات کرنا بہت ہی عجیب لگتا ہے (فیض صاحب کا بھی یہی معاملہ تھا) کبھی کبھار ادبی جلسوں وغیرہ میں البتہ بولنا پڑتا ہے۔ میں T.V پر بھی کبھی نہیں جاتی۔ حال ہی میں بہ حالت مجبوری مارے باندھے چند انٹرویو T.V پر دینے پڑے تھے۔ ایک انٹرویو حیدر آباد کا بہت معقول تھا ایک اور انٹرویو ایک اور جگہ پر جن صاحب نے لیا (وہ بھی ایک نامور اسکالر تھے) وہ مستقل مصر رہے کہ آپ انگریزی الفاظ کیوں استعمال کرتی ہیں۔ ہر دو منٹ بعد وہ یہی سوال دہراتے۔ ان کا دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ موڈرن اوپری طبقے کے متعلق کیسے لکھتی ہیں؟ آپ کو اس کے متعلق کیسے معلوم ہے؟

آپ انگریزی الفاظ کیوں۔

افوہ! اب جا کے مجھے پتا چلا کہ وارث علوی اتنے طویل مضمون کیوں لکھتے ہیں۔ گو ابھی میں نے ان سے تو پوچھا ہی نہیں کہ انھوں نے ایک سوانح حیات یعنی ''یادوں کی بارات'' اور میرے ایک ناول یعنی دو مختلف اصناف کا موازنہ مغربی تنقید کی کس تھیوری کی رو سے کیا۔ آداب عرض ہے۔

(ماہنامہ ''ایوان اردو'' دہلی، اکتوبر 1991)

طوطا کہانی

کرسمس سیزن 1994 عیسوی کے لندن میں ایک تحفہ بہت مقبول ہوا۔ یہ پچیس پاؤنڈ میں بکنے والا ایک بڑا سا طوطا تھا جس کے اندر ایک طاقت ور ٹیپ ریکارڈر پوشیدہ تھا۔ اس کے پنجرے کو کمرے کے کسی گوشے میں آویزاں کر دیجیے اور کسی فاصلے سے بات کیجیے وہ اس کو فوراً دہرا دیتا تھا۔ اہل فرنگ کی اس پر لطف ایجاد سے بہت قبل سے ہم نے ایک طوطا پال رکھا ہے۔ پہلے وہ جیک لندن، جیک لنڈن، ہاروڈ فاسٹ، ہاورڈ فاسٹ، پابلو نرودا، پابلو نرودا ہرایا کرتا تھا۔ راقم الحروف کے لیے وہ ''فیوڈل سماج کے نوحہ گر، بورژوا طبقے کا کھوکھلا پن فیوڈل نظام اپنی موت آپ مر گیا۔ اسے مرنا ہی تھا،'' وغیرہ بے تکان رٹتا تھا۔ پھر اس نے اچانک بڑی طوطا چشمی دکھلائی اور اچھے اور برے ہر قسم کے پروگریسو لٹریچر کی اینٹی بٹوا دی۔[1]

یورپ دیس میں ارسطوئے آخر الزماں کا ظہور ہوا، جو کیسٹ وہ لگا دیتے طوطا وہی دہراتا۔ کبھی کبھی عقب سے موصوف کی اپنی آواز بھی سنائی دے جاتی۔

''مستند ہے میرا فرمایا ہوا''۔

لیکن ارسطوئے آخر الزماں کے ارشادات عالیہ فرامین اور فتوے نہایت ادق ثابت

ہونے لگے تو طوطا گڑبڑا گیا۔ وہ ان کے چارٹ بھی نہ سمجھ پایا اور اڑنگ بڑنگ اڑانے لگا۔ کئی برس تک قارئین با جماعت اس طوطے کے نئے تجریدی علامتی وغیرہ اسٹائل کی تعریف کرتے رہے۔ اب با جماعت انھوں نے اعلان کر دیا کہ طوطا نا قابل فہم ہو گیا ہے۔ ارسطوئے آخر الزماں شاید اسی طرح مسکرائے ہوں گے جس طرح ٹی ایس ایلیٹ نے ایک عالم کو اپنی پے چیدہ شاعری کے چکر میں ڈال کر بعد میں کہہ دیا تھا کہ میں تو مذاق کر رہا تھا۔

بہر حال تو یہ مجہول اور مضمحل طوطا تبدیل آب و ہوا کی غرض سے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو چند لیٹن امریکن نام ور زبان تھے۔

طوطا بہت اچھا مترجم بھی ہے۔ جب سے مغرب سے Post modernism کی اصطلاح یہاں پہنچی ہے وہ مابعد الجدیدیت کا وظیفہ کر رہا ہے۔

کبھی کبھی طوطا ترقی پسند قدما کی Simplistic تنقید کے کلیشے دہرانے لگتے ہے۔ تازہ مثال: ''چاندنی بیگم۔ ایک انداز نظر میرا بھی ہے'' از خالد اشرف (ایوان اردو۔ مارچ 1995ء)

یہ مضمون نگار اس میدان میں نو وارد معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے آئندہ مقالوں میں چند اصولوں کا خیال رکھیں تو بطور نقاد ان کے لیے مفید رہے گا۔

سیاق و سباق سے علاحدہ کر کے اپنا موقف ثابت کرنے کے لیے متن کے کسی ایک جملے یا مکالمے یا پیراگراف کا حوالہ دینا ادبی دیانت داری کے منافی ہے۔

مثال (1) کلچر ہیرو سوسیولوجی کی ایک اصطلاح ہے۔ خالد اشرف نے وکی میاں اور اوکسفرڈ ٹرنڈ قلندر کے اقتباسات دیے ہیں۔ لیکن غازی میاں کے میلے کے مابعد الطبعیاتی تاویلات کے متعلق پنکی اور فیروزہ کے ردعمل اور ان کے مکالمات کا حوالہ نہیں دیا۔

دلیپ کمار رائے کے بھجن۔ میں نیر پیون ہیت گئے سندھو کے کنارے سندھو بیچ بست گراہ چرن دھر پچھارے۔ ''لوگ تو پانی پینے گئے مگر مچھ انھی کو کھا گئے۔'' ''وکی میاں کی آواز بلند ہوتی۔''

یہاں سندھ کے موجودہ سیاسی حالات کے متعلق جو کنایہ پوشیدہ ہے اسے بے چاری فیروزہ کیا سمجھتی، بڑے بڑے ناقدین کے اوپر سے گزر گیا۔

''روحانیت'' ہی کے سلسلے میں ایک مشہور ناقد ''سینٹ مونی کانونٹ'' کی ڈیجک تلخی کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے اور اسے میرے ''تصوف کے دھندلکے پر'' محمول کیا تھا۔ میں عصر حاضر کی ایک وقائع نویس ہوں عرصے سے ایسے Docu.dramas تصنیف کر رہی ہوں، گو اس صنف کو حال ہی میں مغرب کی ایک درآمد سمجھا گیا ہے۔ جعلی کانوٹ اسکول ہمارے موجودہ تعلیمی زوال اور بے علمی کی ایک تصویر پیش کرتے ہیں۔ میری چچی جان مرحومہ کا اسم گرامی حمیدہ بیگم تھا۔ الہ آباد میں ان سے ایک ایم اے بی ایڈ لڑکی نے کہا ''نہٹور میں آپ کی ایک کوٹھی خالی پڑی ہے۔ اس میں سینٹ حمیدہ کانونٹ کھول لیجیے۔ میں اس کی پرنسپل بن جاؤں گی''۔ اس کو اس جہالت پر بہت سمجھایا گیا مگر وہ نہ مانی۔ پھر اتر پردیش کے ایک نئے Upwardly mobile مسلمان سرمایہ دار نے اپنی بیوی کے نام پر ''سینٹ رضیہ کانونٹ'' ایک پہاڑی مقام پر قائم کر لیا اور اس بچی کو وہاں ملازمت مل گئی۔ (میں نے اس مضمون میں اس ''کانونٹ'' کی سینٹ'' کا نام تبدیل کر دیا ہے۔

مثال (2) چاندنی بیگم صفحہ 371۔

''شیخ فیل فروش'' شاہی امام باڑے میں ایک عجب دل دوز منظر دیکھا۔ بادشاہ کی تربت کے سامنے ایک سینی میں چند سکے پڑے ہوئے تھے۔ ایک غریب برقعہ پوش عورت منّت ماننے میں مصروف تھی۔ لو صاحب، جان عالم بھی پیر بن گئے۔

''ارشد حسین'': بھائی جان کہتے ہیں واجد علی شاہ نے ساری عمر نماز فجر قضا نہیں کی۔ انگریزوں نے انھیں بدنام بہت کیا ہے۔ آپ ابھی فرما رہے تھے کہ تاریخ فاتح لکھواتا ہے۔ کیا پتہ وہ مرحوم پہنچے ہوئے بزرگ رہے ہوں۔ یہ روحانی معاملات ہیں۔

''شیخ فیل فروش'': بے شک۔ بے شک تمھاری مطلقہ بیوی رومیلا کا بھی تو یہی کہنا تھا کہ تم اس کی چتر کار آتما نہیں پہچان پائے اور وہ تمھاری لیڈر بزنس کی اسپرٹ نہ سمجھ سکی۔ یہ سب روحانی معاملات ہیں۔''

مندرجہ بالا مکالمے میں خالد اشرف نے محض ارشد حسین کی بات سیاق وسباق سے نکال کر پیش کی ہے۔ صفحہ 339 پر کھجور اور گیندے کی سمبلوم خالد اشرف کی دانست میں Balanced

communalism ہے۔اسی پیراگراف میں ''گومتی کے خربوزے زندہ رود کے خربوزوں کا رنگ پکڑ چکے ہیں'' کا اشارہ شاید سمجھ نہیں پائے۔لہٰذا اس کا ذکر نہیں کیا۔

مثال (2): جاپان کے کابکی تھیٹر میں شوگن یعنی فیوڈل عہد کے سورمائی قصے ٹوکیو کے عالی شان تھیٹر میں تازہ ترین اسٹیج تکنیک کے ساتھ روایتی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔ڈرامہ ختم ہونے کے بعد اداکار حسب روایت حاضرین کے سامنے بہت دیر تک سجدے میں پڑے رہتے ہیں۔یہ کابکی اداکار جاپانی معاشرے میں بے اندازہ عزت اور دولت کے مالک ہیں اور جاپانی کلچر کا ایک بیش قیمت قومی سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔چاندنی بیگم میں میں نے لکھا: ''وہ سب دبکے کھڑے رہے۔چار سامنے آئے، کابکی ایکٹروں کے مانند اور دستور قدیم کے مطابق وہ راجہ تین کٹوری کے سامنے زمین بوس ہوئے۔

''جاپانی سمورائے اور ہندستانی سورما اپنے پیچھے کیا چھوڑ گئے؟

''کروڑپتی'' اداکار۔

''اور فاقہ کش'' بھاٹ۔

(صفحہ 334)

اس اندوہناک منظر کے متعلق خالد اشرف نے لکھا ہے۔''کیوں کہ مصنفہ کو ان طبقوں کی محرومیوں اور سماجی تلچھٹ والی ذلتوں کا گہرا تجربہ نہیں ورنہ وہ راجہ صاحب تین کٹوری کے سامنے ان کلاکاروں کو زمین بوس نہ ہونے دیتیں۔''

اس کے آگے تین سطریں انھوں نے جان بوجھ کر حذف کر دیں۔یہ Motivated تنقید ہے۔جس ناول میں ''سماج کی تلچھٹ'' کلاکاروں کو Homage پیش کر کے ان کے فن کو Celebrate کیا گیا ہو اس کے متعلق مندرجہ بالا الفاظ مضمون نگار کی دیانت کی اچھی مثال نہیں۔

''گہرا تجربہ'' قسم کے الفاظ سوچ سمجھ کر استعمال کرنے چاہئیں۔کیا خالد اشرف کو بھاٹوں کی زندگی کا گہرا تجربہ ہے؟ کیا وہ خود کو بھاٹوں سے Identify کر سکتے ہیں؟ انھوں نے کتنے بھاٹوں اور بھانڈوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا ہے یا ان کی کیس ہسٹری سے واقف ہیں؟

غالباً خالد اشرف کسی نام نہاد ''ترقی پسند'' گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور شاید ابھی ان کو علم نہیں ہوا کہ ''ترقی پسندوں'' کے اسی Holier than thou رویے نے اس تحریک کو کتنا زبردست نقصان پہنچایا ہے۔

ایک افسانے میں میں نے لکھا کہ مراد آباد کے فسادات کے بعد وہاں کے ایک بوڑھے رکشہ والے کو خاک روب بننا پڑا۔ (''دریں گردوارے باشد'') کیونکہ اس ماحول اور اس ایریے سے بہت اچھی طرح واقف تھی، گو مجھے خاک روبوں کی زندگی کا ''گہرا تجربہ'' نہیں تھا۔ آپ لوگ اس قسم کی بوگس باتیں کب تک کیے جائیں گے؟

کیا آپ آرام چیئر لفٹسٹ حضرات کے بارے میں ایک مضمون لکھنا پسند کریں گے؟ یا ایسے منافقین کے متعلق ایک مقالہ قلم بند کرنے کی جرأت رکھتے ہیں جو Establishment کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں اور منتریوں اور اہل ثروت سے میل جول فخر سمجھتے ہیں؟ آپ مجھے بتلانا کیا چاہتے ہیں؟

میں نے ایک بے حد محنتی ورکنگ جرنلسٹ کی زندگی گزاری ہے اور بڑے بڑے دانشوروں اور نامور اہل قلم کو اپنی ذاتی پبلسٹی کے لیے تگ و دو کرتے بہت قریب سے دیکھا ہے Media Explosion تو اب ہوا ہے، میں عرصہ دراز سے انگلش جرنلزم سے وابستہ رہی ہوں اور بہت دنیا دیکھ چکی ہوں۔ میرے بارے میں لکھتے وقت ذرا سوچ لیا کیجیے کہ آپ کس فرد کے متعلق اظہار خیال فرما رہے ہیں۔

''گہرے تجربے'' کی نوع کے کلیشے استعمال کرنے سے پہلے یہ بھی سمجھ لیجیے کہ کسی فرقے یا گروہ یا افراد کے ایسے کو دوسرا شخص اپنی جان پر نہیں جھیل سکتا تاوقتے کہ وہ بذات خود اس گروہ میں شامل ہو اور ان اجتماعی تجربات میں شریک ہو۔ Shared Experience کے بجائے محض اس کا ادراک یا احساس ہی کر سکتا ہے۔ اور یہ اپنے اپنے مزاج پر منحصر ہے۔

مجھے مصوروں کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حالانکہ میں خود کبھی کبھی تصویریں بناتی ہوں۔ کچھ عرصے میں لندن کے قدیم ترین اور تاریخی آرٹ اسکول ہیدر لیز میں جاتی رہی۔ وہاں

لنچ بریک میں بھکاریوں اور اسٹریٹ واکرز اور کوچہ گرد گویوں کے پاس جا بیٹھتی تھی اور ان سے ان کا حال احوال پوچھتی تھی۔ وہ سب سے الگ تھلگ ایک بنچ پر بیٹھ کر لفافوں میں سے بن نکال کر کھاتے تھے۔ کوئی ان سے بات کرنے کا روادار نہیں تھا۔ یہ سب ''سماج کی تلچھٹ'' افراد لائف کلاس کے موڈل تھے۔ ایک گوری اسٹریٹ واکر اپنا کنیری کا پنجرہ ساتھ لاتی تھی۔ ایک سیاہ فام نا بجیرین لڑکی جو لائف کلاس میں ماڈلنگ کر کے اپنا تعلیم کا خرچ چلا رہی تھی، اس کے چہرے پر زخموں کے گہرے نشان تھے۔ اس کے قبیلے میں لڑکیوں کے رخسار گرم سلاخوں سے داغے جاتے تھے۔ آج سے چالیس سال قبل کے برطانیہ میں کلاس سسٹم بہت شدید تھا۔ اور اس قدیم اسکول کے ضابطے کے مطابق طلبا کو لائف کلاس کی ماڈلز سے بات چیت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس وکٹورین اسکول میں پیرس کے نگارخانوں والا بوہیمین ماحول نہیں تھا۔ میں اس اسکول کی واحد ایشیائی طالب علم تھی اور میں نے اس ضابطے کی پروا نہیں کی۔ یہ جان کر کہ میں ایک رائٹر بھی ہوں استادوں نے ان چاروں سے میری دوستی پر باز پرس نہیں کی۔

ہندستان کے نامی گرامی مصوروں کے حلقے میں میں نے جس آپا دھاپی کا مشاہدہ کیا اور ان میں سے اکثر کو Megaliomania یعنی اپنی ذات سے شدید عقیدت میں مبتلا دیکھا۔ اس وجہ سے میں نے ان میں سے اکثر کو پرکشش نہیں پایا۔ میں ساہتیہ اکادمی کی نمائندہ کی حیثیت سے ایک سال للت کلا اکادمی کی ممبر رہی وہاں بھی آرٹسٹوں کی آپسی چشمکوں کے پیچھے سارا کھیل پیسے کا ہے کیوں کہ آج کل ایک ایک پینٹنگ لاکھوں روپے میں بکتی ہے۔ آرٹ ہے نہ کلچر بھیا۔ سب سے بڑا روپیا۔

پرفارمنگ آرٹسٹوں سے میری Empathy کی وجہ محض یہی نہیں ہے کہ میں کلاسیکل سنگیت سیکھ چکی ہوں اور ہمارے ہاں کلاسیکل موسیقی کا بہت چرچا رہا ہے۔ (ہمارے ہاں بیگمات طوائفوں سے پردہ کرتی تھیں۔ میں نے اس موضوع پر ایک تقریباً سچی کہانی بعنوان ''جن بولو تارا تارا'' لکھی تھی۔ لیکن میراثنیں زنان خانے کے کلچر کا ایک جز و تھیں)۔ مجھے ان ماہرین فن میں سے اکثر کی کسمپرسی نے اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر بھانڈ۔ جو کتنے بڑے فن کار

تھے لیکن ''بھانڈ ڈوم دھاڑی'' ہمارے ہاں ذلالت کے محاورے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خستہ حال قوال بھی ٹاٹ باہر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ایک قوال پارٹی کامیاب ہو جائے تو ان کو عزت مل جاتی ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں دھوم مچاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں نے بڑے بڑے موسیقاروں کو مصوّروں اور بعض مدغ اہل قلم کے برعکس بے حد منکسر المزاج پایا۔ استاد بسم اللہ خان، استاد امین الدین، ڈاگر، استاد متو رعلی خان، استاد بڑے آغا، استاد لطافت حسین خان، استاد اسد علی خان صاحب، پنڈت روی شنکر، استاد اللہ رکھا اور بہت سے۔

میں استادوں اور سازندوں کے حالات سے واقف ہوں۔ سبھی موسیقار فائیو اسٹار ہوٹلوں میں نہیں ٹھہرتے نہ لندن اور پیرس میں کونسرٹ دیتے ہیں۔ بے حد خوشی کی بات یہ ہے کہ اب درباروں سے نکل کر عام معاشرے میں بھی ان کی پذیرائی کی جاتی ہے اور ان کو عزت حاصل ہے۔ لیکن سماج کے کنارے پر بسنے والے کلاکار، میراثی، ڈومنیاں، بھاٹ، نوٹنکی اور سرکس والے ان کو کون پوچھتا ہے۔ بھانڈ تو معدوم ہو چکے۔ چند افراد جو مشہور استادوں کے بیٹے اعلیٰ مغربی تعلیم حاصل کر چکے ہیں اب اپنے کو گویوں کی اولاد نہیں بتاتے۔

ہمارے معاشرے کا قدیم کاسٹ سسٹم اس رویے کی عمرانی بنیاد ہے۔ ایک نامور گائیکہ جو گندھرو کاسٹ (پاتر) سے تعلق رکھتی تھیں ان کی بیٹی اب ایک یونیورسیٹی گریجویٹ خاتون ہیں۔ میری ایک بلند پایہ موسیقار دوست شریمتی مالتی گیلانی جو استاد بڑے غلام علی خان کی شاگرد رشید رہ چکی ہیں۔ انھوں نے بڑے فخر سے ان خاتون کو لوگوں سے ملوایا کہ یہ فلاں نامور ٹھمری سنگر کی بیٹی ہیں۔ اس خاتون نے بعد میں مالتی سے کہا پلیز آپ میرے بارے میں یہ نہ بتایا کریں۔

جب میں ''گردش رنگ چمن'' کے لیے بیک گراؤنڈ ریسرچ کر رہی تھی تو چوک کے گلی کوچوں میں چند سابقہ مشہور گائیکاؤں سے ملی۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ ''بیٹا ہم تو کبھی اس لائن میں رہے نہیں۔ آپ کو کیا بتا دیں۔'' پھر بھی میں نے اپنی تفتیشی صحافت کے تجربے کی بدولت کافی میٹریل جمع کر ہی لیا۔

گویا ایک نامعلوم سماجی Barrier پیشہ ور موسیقاروں اور عام سماج کے درمیان اب بھی

موجود ہے تاوقتیکہ وہ بے حد شہرت اور دولت حاصل کر لیں۔ میں نے اپنے ناولٹ ''ولربا'' میں بھی معاشرے کی ان بدلتی ہوئی اقدار کو پیش کیا ہے۔ سارا کھیل پیسے اور گلیمر کا ہے۔ سابق کی چند خستہ حال لکھنوی میراثنیں اب لندن میں مقبول اور فیشن ایبل سنگرز ہیں اور ان کی سماجی حیثیت بتدیل ہو چکی ہے۔ مگر سبھی ایسے خوش قسمت نہیں۔

بچپن میں دہرہ دون میں موت کے کنویں کے اندر موٹر سائیکل چلانے والی لڑکی زہرہ ڈربی مجھے بے حد پراسرار معلوم ہوئی اور اس کے تماشے نے مجھے بہت متحیر کیا کہ روز شام کو تین چار بار موت کے منہ میں جاتی ہے یہ اسکول یا کالج کیوں نہیں جاتی اور اس کے ماں باپ نے اسے ایسا خطرناک کھیل کھیلنے کی اجازت کیسے دے رکھی ہے۔ وہیں دہرہ دون ڈالن والا ایک کالج میں ایک مفلوک الحال اینگلو انڈین رہتا تھا جس کی لڑکی ایک اور نادار مسکین انڈین کرسچین مسٹر سائمن سے ستار بجانا سیکھ رہی تھی۔ والدہ مرحومہ مسٹر سائمن سے ستار سیکھتی تھیں ایک روز وہ نہایت منکسر المزاج بزرگ اس لڑکی کو ساتھ لائے اور اس نے ستار بجایا۔ والدہ نے پوچھا تم یہ ستار بجانا کیوں سیکھ رہی ہو۔ اس نے اردو میں کہا ''تاکہ انگریز لوگ غور کریں۔'' مجھے اس کا یہ جملہ یاد ہے۔ اسی طرح میرے ذہن میں ان گنت مناظر، واقعات، مکالمے انتہائی Clarity کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اگر میں ان کو قلم بند کرنے پر آؤں تو ایک طلسم ہوشربا تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ممکن ہے۔ بہر حال تو میں نے سنہ 62 عیسوی میں زہرہ ڈربی اور مسٹر پیٹر رابرٹ خاں، ہومیو پیتھک لیڈی ڈاکٹر اور اس یوریشین لڑکی اور مسٹر سائمن کی یادوں پر مبنی ایک افسانہ ''ڈالن والا'' لکھا۔ لنگڑی ریشم بلی بھی اس افسانے کا ایک سچا کردار تھی۔ اور فقیرا اور اس کی بھاوج بھی۔ یوریشین لڑکی کو تو میں نے سرکس میں شامل کر کے اس کی ٹانگیں توڑ دیں اور مسٹر سائمن کو سردی سے ٹھٹھرا کر مار دیا لیکن فقیرا کی بھاوج سچ مچ مری تھی اور وہ اس کی راکھ کے کونڈے پر گوریا کے پنجوں کے نشان سب کو بتلاتا پھرا تھا۔ یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔ اب کہہ لیجیے کہ میں آواگون پر یقین رکھتی ہوں۔ کیونکہ افسانے کے آغاز کا ایک جملہ ہے ''فقیرا کی بھاوج گوریا بن گئی''۔

فکشن کو سمجھنے کے لیے جس ذہنی ٹریننگ کی ضرورت ہے وہ ہمارے یہاں افسوس کہ

بہت زیادہ پائی جاتی ۔ اسی وجہ سے ناول اور افسانے پر تنقیدی مضامین اکثر مضحکہ خیز ہوتے جارہے ہیں۔

جب میں نے سرکس کے یوریشین اور ملیالی بازی گروں کے استحصال کے متعلق ایک مضمون اپنے انگریزی رسالے کے لیے لکھا اور ساتھ ہی ایک افسانہ بعنوان ''تار پر چلنے والی'' تو پہلے مجھے خود قلابازی اور تار پر سائیکل چلانے کی ٹریننگ حاصل کرنی چاہیے تھی ورنہ ''گہرے تجربے'' کے بغیر میں نے یہ سب کیوں لکھا؟

آخر خالد اشرف اور ان کے قبیل کے لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آٹھ سال تک ایک فاؤنڈیشن اور اس کی مجلس عاملہ کے ذریعے کتنے گویوں، سازندوں اور دوسرے عسرت زدہ پرفارمنگ آرٹسٹوں فن کاروں کی مالی امداد کی ہے؟ ان کے علاج معالجے اور جائے رہائش کا بندوبست کیا ہے؟ ان کی بیواؤں کے لیے وظائف مقرر کروائے ہیں؟ ایک نامور لیکن مفلس استاد کے گھر میں اس وقت پہنچی جب وہ سرطان کے آخری اسٹیج پر تھے۔ پھر بھی اس فاؤنڈیشن کے محدود فنڈ کی طرف سے جس حد تک امداد بہم پہنچائی جاسکتی تھی وہ حاجت مند فن کاروں کے لیے ہم لوگوں نے پہنچائی۔ میں نے آج تک اس بات کا تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن اس قسم کی باتیں سنتے سنتے اب میں عاجز آچکی ہوں اور مجبوراً لکھنا پڑ رہا ہے۔

ہمارے اخلاقی زوال کا یہ عالم ہے کہ جس زمانے میں یہ فاؤنڈیشن چلا رہی تھی میرے خلاف یہ افواہ اڑائی گئی تھی کہ لوگوں کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آتی ہوں بلکہ ان کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتی ہوں۔ چند افراد شاید چاہتے تھے کہ چند اور افراد (جن میں معروف اہل قلم شامل تھے) کو اس فاؤنڈیشن کی طرف سے کچھ مالی امداد نہ ملے۔ یہ محض بدنفسی تھی۔ بہرحال ایک روز ایک حاجت مند کلاکار نے مجھے فون کیا کہ ہم آپ کے پاس آتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ ہم کو یہ بتلایا گیا ہے ''مصلحہ کا مشاہدہ خانگی ملازمین سے آگے نہیں بڑھا ہے۔'' خالد اشرف کے اس بیان میں بھی طوطا بول رہا ہے اور یہ جملہ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ پہلے میں اس نوع کے

Mindless اور مضحکہ خیز اعتراضات کی پروا نہیں کرتی تھی کیونکہ میں دیس دیس گھوم کر تفتیشی صحافت میں منہمک تھی۔ Investigative Journalism کا آج کل بہت چرچا ہے جس میں گزشتہ تیس پچیس سال تک مصروف رہی۔ میں نے سلہٹ کے چائے گان کے Stateless مزدوروں، سری لنکا کے Stateless ہندستانیوں، برطانیہ کے کالوں، کمایوں، ہماچل، گڑھوال، پنجاب اور بنگال کے مزدور اور کسانوں کے متعلق نہ صرف In-depth لکھا ہے، میں چکر قبائل اور پنجاب اور بنگال کے کسانوں کے گھروں میں جا کر رہی ہوں اور ان کے متعلق دستاویزی فلم بنائے ہیں۔ میرے ان انگریزی مضامین کا پورا مجموعہ شایع کیا جا سکتا ہے مگر میں نے اپنی افسانوی ''کلیات'' ہی شایع کروانے کی پروا نہیں کی اخباری انگریزی مضامین کتابی صورت میں کیا چھپواؤں گی۔

1975 عیسوی میں میں نے لکھنؤ کی کوچہ گردگانے والیوں اور چکن کاڑھنے والیوں کے شدید استحصال کے متعلق ایک ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' لکھا تھا۔ چکن انڈسٹری کا مطالعہ کیا اور معلوم ہوا کہ عورتوں کو ایک نیا پیسہ فی مُری پتی اُجرت ملتی ہے۔ اور سوگنا منافع بیوپاری حاصل کرتا ہے۔ میں نے بیگم سلطانہ حیات مرحومہ سے کہا کہ وہ چکن کاڑھنے والیوں کی ایک کوآپریٹو بنائیں۔ مظفر علی نے بھی شبانہ اعظمی اور فاروق شیخ کو لے کر ایک بہت موثر فلم ''انجمن'' اس موضوع پر ڈائریکٹ کی جو آج تک ریلیز نہیں ہو سکی کیوں کہ اس میں ''مسالہ'' نہیں تھا۔ بہر حال اب چند سال سے لکھنؤ میں ایک کوآپریٹو سیوا[2] کے تحت قائم ہو چکا ہے۔ جس میں عجیب اتفاق ہے ایک ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' کی لنگڑی جمیلن کی طرح ایک معذور سوزہ کارلڑکی بھی شامل ہے۔

استحصال ہر سطح پر ہو رہا ہے۔ علی گڑھ کا ''پھول پتی کا کام'' نہایت محدود پیمانے کی گھریلو صنعت ہے اس میں بھی کام کرنے والی عورتوں کو بہت قلیل اُجرت ملتی ہے۔

چند سال قبل میں نے قصبہ سنبھل کے ایک عسرت زدہ محلّے میں دیکھا کہ عورتیں اُپلے تھاپ رہی تھیں اور غلیظ رنگین پانی کے حوض میں سوت اور کپڑے رنگتی تھیں۔ واپسی پر میں ریلوے

اسٹیشن سے سیدھی ایک گرلز کالج کے سیمینار میں پہنچی جہاں مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں سارے ہندستان سے آئی ہوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بڑھیا ساتھنک ساڑیوں میں ملبوس، حقوق نسواں پر دُھواں دھار تقریریں کر رہی تھیں۔ جب میری باری آئی تو میں نے صرف اتنا کہا کہ میں ابھی جہاں سے آ رہی ہوں ان عورتوں سے آپ خود کو کس طرح Relate کرتی ہیں اور آپ کے یہ تجزیے اور بلند خیالات چھن کر ان عورتوں تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں اور اس سیمینار کا انھیں کیا فائدہ ہوگا؟

زیادہ عرصہ نہیں گزرا نئی دہلی میں صوفی ازم پر ایک انٹرنیشنل سیمینار منعقد ہوا۔ اس کی پلاننگ کمیٹی میں میں بھی تھی۔ میں نے میٹنگ میں کہا کہ اس کانفرنس میں جو مقالے پڑھے جائیں گے ان کو میڈیا خصوصاً لینگویج پریس کے ذریعے عوام تک پہنچانے کا باضابطہ انتظام نہ کیا گیا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میری اس تجویز کی قطعی سنی ان سنی کر دی گئی۔ سیمینار ہوا، یورپ اور امریکہ سے ماہرین آئے۔ ایئر کنڈیشنڈ ایوانوں میں پیپر پڑھے گئے اور ڈنر ہوئے، پھر سب نے اپنی اپنی راہ لی۔ یعنی چند دانشوروں نے چند دوسرے ہم خیال دانشوروں سے گفتگو کی اور صوفی ازم کی انسان دوستی کا جو پیغام جنتا کے ذہن نشین کروانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی گئی۔

خالد اشرف نے ایک اور عجیب و غریب اعتراض کیا ہے "بہار پھولپوری کا اردو شاعری کے ذریعے اس قدر ترقی کرنا کہ موصوف مہینوں مغربی ممالک میں رہیں ناقابل یقین نظر آتا ہے۔" گزشتہ دس بارہ سال سے ہندستان کے کم از کم ایک درجن شعرا جن میں ترقی پسند، فلمی، غیر فلمی (ایک صاحب تبلیغی جماعت سے بھی تعلق رکھتے ہیں) سال کا بیش تر حصہ باہر مشاعرے پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک یورپ اور امریکہ میں مہینوں اپنے مقبول پرستاروں کے گھروں پر قیام کرتے ہیں۔ اگر خالد اشرف شعر کہتے ہوں اور خوش گلو بھی ہوں تو ذرا سی کوشش سے اس انٹرنیشنل مشاعرہ سرکٹ میں شامل ہو سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ تشویش ناک بات مجھے یہ معلوم ہوئی کہ آج تک اردو فکشن کے لیے نہیں

کہا گیا کہ ہندو یا مسلم کردار شامل کر کے فلاں ناول نگار نے اپنے سیکولرزم کا ثبوت دینے کی کوشش کی ہے۔ اس قسم کا بیان اگر پاکستانی ناقدین دیں تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ وہ ایک مخلوط معاشرے کے عادی ہی نہیں ہیں۔ میں خالد اشرف کی عبارت کا پورا اقتباس دیتی ہوں۔

مصنفہ نے (غازی میاں کے) میلے کی تصویر کشی کی شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ''آج ہم ہندستان میں جس زبردست اینٹی سیکولر انقلاب سے دوچار ہیں اس وقت ایک مخصوص دینی مدرسہ فکر کی طرف سے درگاہی کلچر کی مخالفت کوئی دانش مندی نہیں''۔

(چاندنی بیگم کی واپسی۔ ایوان اُردو اکتوبر 1991)

''مصنفہ کی نیک نیتی قابل تحسین لیکن سیکولرزم کے فروغ کا مشن اس میلے کی ناقابل یقین توضیحات کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا؟ یہ کام تو رگھوبیر پرساد سنگھ، نارائن بخش سنگھ، بھوانی شنکر سوختہ، کالی چرن، بھگوان دین، سونا کلی درگا پرساد مصرو غیرہ خوب صورتی سے پورا کر ہی چکے تھے۔ اسی ''سیکولرزم'' کے پروپیگنڈے کی ایک کڑی مانگ بائی ڈھونڈی اور ان کا بیٹا فرہاد ہے جو اس قصے پر بارگراں کی طرف مسلط کیے گئے ہیں''۔

یہ تجزیہ مبتدیانہ مارکسزم بھی نہیں ہے۔ یہ ایک کنفیوز ڈیار جعت پسندی سوچ کا غماز ہے۔ مضمون نگار نے سیکولرزم کو دادین کے اندر پیش کیا ہے۔ اسی طرح ایک جانب سے سیکولرزم کو Pseudo کہا جاتا ہے۔ یعنی دائیں بازو کے دو مختلف سمتوں کی آوازیں اس ایک لفظ سیکولر کی متضاد توضیح میں یکجا ہو گئی ہیں اور خود خالد اشرف نے نادانستہ اپنے مندرجہ ذیل قول کی نفی کی ہے۔

''رائٹ ونگ جماعتوں کی ایکتا والی تھیوری بھی حقائق پر مبنی نہیں ہے۔''

اس قسم کے حقائق مع ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن اس کا یہ موقع نہیں ہے۔

برسبیل تذکرہ ''ڈھونڈی خاندان'' کی طرح کا ایک پارسی کنبہ بالکل اسی وضع قدیم کی کوٹھی میں لکھنؤ میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کانپور، لکھنؤ یا بمبئی کے پارسیوں سے خالد اشرف کی ملاقات نہیں ہے۔

خالد اشرف کا مزید اعتراض ہے کہ Cowbelt کے مسلم متوسط طبقے کی Upward

mobility کی تصاویر۔ پری خانہ بیوٹی پارلر، فٹافٹ لانڈری، کنگ فو ریستوران اور شہر کے نمبر ون بلڈر محمد معروف وغیرہ بہت زیادہ خوش فہمی پر مبنی معلوم ہوتی ہیں۔

خالد اشرف غالباً لکھنؤ سے بالکل ناواقف ہیں۔ لکھنؤ اور نینی تال کے کامیاب ترین اور نوجوان محمد عارف بلڈرز کو میں نے ''محمد معروف'' بنادیا۔ شہر کی مشہور وکٹ لانڈری کے مالک مسلمان ہیں اور اس طرح کے متعدد کاروبار ہیں۔ اصغر علی کا کارخانہ ان کے آپسی جھگڑوں کی وجہ سے بند ہونے کے باوجود ان کے خاندان کی ایک شاخ نے اپنا کاروبار جاری رکھا ہے۔ لکھنؤ کے ''مچھلی والوں'' کی نئی خوشحالی ضرب المثال بن گئی ہے۔ الہ آباد کی مشہور جیپ فلیش لائٹ فیکٹری شیروانی خاندان کی ملکیت ہے۔

ایک نئے اپارٹمنٹ بلاک ''روز ہاؤس'' کی گراؤنڈ فلور پر چھوٹی چھوٹی دکانیں، بوتھ، اسٹال یا ریستوران کھولنا کون ایسی محیر العقول بات ہے؟ ایسی دکانیں آپ کو ہر جگہ مل جائیں گی۔ داؤد، سپلا، ہمالیہ ڈرگ کمپنی، شہناز حسین تو خیر بہت بڑے نام ہیں۔ حبیب کے فائیو اسٹار ہیر ڈریسنگ سیلون بہت سے شہروں میں کھل چکے ہیں۔

دراصل ''Cowbelt'' میں مسلمانوں کی زبوں حالی'' میں بھی طوطا بول رہا ہے۔ مرزاپور بھدوئی، مئوناتھ بھنجن، بنارس، کانپور، شاہجہاں پور، فیروز آباد، مراد آباد، سہارنپور کے بڑے کاروباری ''آم کی پٹی والے'' پنجابی سوداگر برادری اور نینی تال وغیرہ کے بوہرے زبوں حالی کے نمائندے نہیں نئے سرمایہ دار ہیں جو اب خود بھی ''خواجگی'' کا رول ادا کر رہے ہیں۔ فسادات بھی انھی شہروں میں ان کو اسموک آؤٹ کرنے کے لیے ہوتے رہے ہیں۔ مشرقی اضلاع اور بہار میں حالت ابتر ہے، بھاگل پور کی ریشم کی انڈسٹری ختم کی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی جہاں پہلے زمین دار کلاس اور ''سروس جنٹری'' کا طالب علم پڑھتا تھا اب وہاں ہزار ہا لڑکی لڑکا نئے تجارت پیشہ مسلم مڈل کلاس کا تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ پرانی دہلی کا نیا متمول کر خندار نئی دلی میں کوٹھیاں بنوا رہا ہے اور ذاکر نگر کو ایک دولت مند Ghetto میں تبدیل کر چکا ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ نیا طبقہ ''دبئی کلچر سنڈروم'' اور مذہبی جماعتوں سے متاثر ہو رہا ہے اور

اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے حق میں نہیں ہے ان کو تجارت میں لگا رہا ہے۔ ڈائجسٹ قسم کے رسالے جن کو میں دو نمبر کا ادب کہتی ہوں اسی نئے طبقے کے لیے شایع کیے جا رہے ہیں۔ میں مغربی اضلاع اور اودھ کے قصبات اور دیہات میں اکثر جاتی ہوں جہاں کا لینڈ اسکیپ رفتہ رفتہ بدل رہا ہے۔ مڈل ایسٹ کی کمائی اور گھریلو صنعتوں کے فروغ، گوشت کے کاروبار وغیرہ سے اب اس طبقے کی اقتصادی حالت سدھر رہی ہے۔ طبقاتی نظام بدل گیا ہے۔ خود نہٹور میں ہماری جاگیری دور کی تاریخی مسجد کو گرا کر بنکروں نے اس کی جگہ نئی مسجد تعمیر کر لی ہے۔ اس نئے کاری گر نے زمین دار کلاس کی ساری اقدار کو مع ان کی مذہبی رسومات کے مسترد کر دیا ہے۔ نو رباف یا بنکر جو سب سے زیادہ ستم رسیدہ تھے اب ان کے نوجوان اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں اور ان کے ہاں وہابیت بھی بڑھ رہی ہے۔ سید احمد دہلوی کے زمانے سے یہ سیاسی شعور کے مالک رہے ہیں آزادی سے قبل قوم پرست تحریک میں بھی یہ شامل تھے۔ گزشتہ برسوں میں معاشی نقصان انھوں نے بہت اٹھائے ہیں۔ اور Resilence بھی سب سے زیادہ انھی میں ہے۔

میرے فکشن کی مختلف النوع[3] آوازوں میں سے ہر آواز کو میرا ہی ترجمان سمجھنا ہمیشہ سے ہماری تنقید کی کمزوری رہی ہے۔ شکر ہے خالد اشرف نے تو اسی پر اکتفا کی، مجھے وکی میاں اور اوکسفرڈ ٹرنڈ قلندر سمجھا ورنہ ایک صاحب نے مجھ سے پاکستان سے خط لکھ کر استفسار کیا تھا کہ رابعہ دل شاد علی خاں میں خود ہوں۔ کوئی ترمذی صاحب ہیں جنھوں نے چاندنی بیگم پر ''ماہ نو'' میں مضمون لکھا تھا، فرمایا: ''صفیہ سلطان کی زندگی دراصل مصنفہ کی روداد حیات ہے۔'' وہ ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' میں لکھنؤ کی ایک سابق اسٹریٹ سنگر اور خانگی رشک قمر چند سال کے لیے پاکستان جاتی ہے اور پھر واپس آ جاتی ہے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ادیب نے مجھ سے پوچھا کیا یہ آپ ہی کی زندگی کی کہانی ہے؟

فکشن کو نہ سمجھ سکنے کا المیہ قاری اور ناقد دونوں کا ہے۔

ترقی پسند تنقید کا ایک Anti-Scholastic رویہ بھی ہمیشہ سے رہا ہے۔ لیکن خالد اشرف کو شاید اب تک علم نہیں ہوا کہ ہمارے پرانے اور جید مارکسی نظریہ ساز بھی اب اپنے گزشتہ فتووں پر

نظر ثانی کر رہے ہیں اور زوال پرستی کا لیبل لگانے میں بھی محتاط ہو چکے ہیں۔ یورپ کے جن ادیبوں کو وہ زوال پرست کہتے تھے وہ زمانہ بھی ہوا ہو گیا۔ لیکن آج سے بہت قبل احتشام صاحب جیسے معقولیت پسند مارکسی نقاد بھی ہمارے ہاں موجود تھے۔ ایک بار 1972 عیسوی میں انھوں نے ہندستانی اکیڈمی الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے ایک سیمینار منعقد کیا۔ کتابوں کی اشاعت کے متعلق ایک سیشن تھا۔ میں نے اردو کتابوں کی محدود اشاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ہم مغرب یا سوویت یونین سے اپنا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے کیونکہ ہمارے بیش تر عوام جاہل ہیں۔ یشپال آگ بگولہ ہو گئے اور میری بات کاٹ کر برس پڑے آپ نے عوام کو جاہل کہا؟ آپ نے جنتا کی توہین کی۔ آپ بورژوازی کا ہمیشہ سے یہی رول رہا ہے۔ عوام آپ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ آپ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہیں؟ آپ عوام کو جاہل کہتی ہیں؟

میں خاموش، بھونچکی، چوروں کی طرح بیٹھی رہی۔ یشپال گرجا کیے سیشن کے بعد احتشام صاحب نے بڑی ندامت کے ساتھ مجھ سے کہا کیا کیا جائے یہ اندھی مارکسزم ہے۔

مگر خالد اشرف کے ہاں اندھی مارکسزم بھی نہیں ہے انھوں نے محض بہت زیادہ Smart Alec بننے کی کوشش کی ہے۔

گویا طوطا ابھی ریٹائر ہونے پر آمادہ نہیں۔

(ماہنامہ ''ایوان اردو'' دہلی، جون 1995)

حواشی:

1. یہ علی گڑھ والوں کا ایک بلیغ محاورہ ہے۔
2. Self-Employed Women's Association
3. "In several of her works she has done some astonishing things creating multiple voices with a precision of tone. Her novels are permeated with insights and details that reflect a life-long interest in a wide variety of subjects." (C.M. Naim in "Edabiyat")

آرٹ کی کہانی

فن مصوّری کے ارتقا کی داستان سنانا بڑی ہمت اور بڑی الجھن کا کام ہے۔ کیوں کہ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے یہاں ایک عام پڑھے لکھے انسان کو ظاہر ہے کہ اس سے کوئی غرض نہیں کہ چینی آرٹ نے ایرانیوں پر کیا اثر ڈالا یا متھرا کے جینیوں کے بنائے ہوئے مجسّموں اور کاٹھیاواڑ کے گندھرو میں کیا فرق تھا۔ (اور بہر حال ہندوؤں کی بت پرستی سے ہم کلمہ گو غازیوں کو ویسے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے) اور یہ تو مائیکل اینجلو اور داونچی کی خوش قسمتی ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگوں نے کیلنڈروں کے رنگین پرنٹ دیکھ کر ان کے نام سے واقفیت حاصل کر لی ہے اور زیادہ انٹلکچوئیل قسم کی گفتگو میں ٹی ایس ایلیٹ کے ساتھ پکاسو کا نام بھی ادبدا کر لے لیا جاتا ہے۔ یہ تو ہمارے بہت زیادہ پڑھے لکھے طبقے کا حال ہے۔ اور یہ بھی ایک خوش فہمی ہے کہ حکومت پاکستان کی طرف سے جو گاہے گاہے ''پاکستانی آرٹ'' کے بارے میں پمفلٹ اور مضمون شائع کیے جاتے ہیں یا ''ماہ نو'' اور دوسرے سرکاری رسالوں میں چغتائی صاحب پر مختلف زاویوں سے تنقیدیں چھپتی رہتی ہیں ان کی وجہ سے ہم پاکستانی Art minded ہو جائیں گے۔

''اسلامی تاریخ کے عہد زرّیں'' وغیرہ کی بات چھوڑیئے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہمارے

متوسط طبقے کو اب بہت زمانے سے آرٹ سے کوئی لگاؤ نہیں رہا۔ رقص اور موسیقی کو تو خیر طوائفوں اور میراثیوں کا کام سمجھا جاتا تھا (اور اب بھی سمجھا جاتا ہے) مصوری محض بنگالیوں کا ہنر تھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ایک مخصوص قوم دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ آرٹسٹک ہوتی ہے اور صرف بنگالی یا اطالوی ہی موسیقی اور آرٹ میں اتنے ڈوبے رہ سکتے ہیں اور ہمارے شاہین بچوں کو تو محض تلواروں سے کھیلنا چاہیے۔

ہندستان میں اس وقت اپنی پرانی تہذیب اور آرٹ کی روایت کو اجاگر کرنے کے لیے وسیع اور اعلیٰ پیمانے پر فنون لطیفہ کا پرچار کیا جا رہا ہے۔ انگلستان اور فرانس کی اکیڈیمیز کی طرز پر حکومت کی طرف سے سنگیت اور ناٹک کی اکادمی قائم کی گئی ہے۔ حکومت مصوروں، رقاصوں، ادیبوں، موسیقاروں اور ایکٹروں کو قومی اعزاز دے رہی ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے سات سال میں ایک عام ہندستانی کو یہ اچھی طرح محسوس کرایا جا چکا ہے کہ اجنٹا اور ایلورا بلکہ تاج محل اور فتح پور سیکری بھی اس نے تخلیق کیا تھا۔ (یہ ایک اور ٹیڑھا مسئلہ ہے جس کی حدیں کافی خطرناک طریقے سے سیاسیات کو چھو لیتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ آرٹ کی میراث کو کس طرح اور آرٹ کے کن نظریوں کے ماتحت تقسیم کیا گیا ہے) اس کے علاوہ انڈسٹریل ڈیزائن کے ذریعے بھی اب خالص ہندستانی آرٹ (کلاسیکل، جدید، عوامی) کافی غیر محسوس طریقے سے گھر گھر پہنچ چکا ہے۔ چھپے ہوئے کپڑوں، پردوں، ساریوں، اور چپلوں وغیرہ کے علاوہ انٹیریر ڈیکوریشن Interior Decoration کے لوازمات کے ذریعے ایک اوسط درجے کے ہندستانی گھر میں اجنٹا و ایلورا کے کنولوں اور سیاہ شہزادیوں کے Motif سے لے کر جیمنی رائے تک ہر طرح کے نقوش کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ ہمارے یہاں اس کے برعکس ابھی اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آرائش Decor اور طرز رہائش کے سلسلے میں ایک قومی مزاج کی تخلیق کی جائے اور بہرکیف یہ قومی مزاج کیا ہوگا۔ مڈل ایسٹرن۔ الف لیلوی یا ''مسلم بنگالی''؟

یہ سوال کہ سات سال میں آخر کیا کیا ہو سکتا تھا ابھی تو ہمارے سامنے اتنے مسائل ہیں۔ نہرو نے نہروں کا پانی بند کر رکھا ہے۔ قضیہ کشمیر طے نہیں ہوا۔ مہاجرین ہیں کہ بسائے نہیں بستے۔

ہمیں اتنی فرصت کہاں کہ آرٹ گیلریاں یا کتب خانے یا قومی اسٹوڈیو قائم کریں یا حکومت طبلہ سارنگی کی اکادمی قائم کرتی پھرے۔ (جی ہاں، یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ ابھی تو وہ، سادی، بی اے، ایم اے والی یونیورسٹیاں ہی ڈھنگ سے چل جائیں تو بڑا خدا کا شکر ہے۔) اور یوں تو ہماری کلچرل گہما گہمی کا ثبوت مشاعروں، قوالیوں اور دنگلوں سے مل ہی جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور آپ کو کیا چاہیے۔ بہر حال اب کہاں تک ان باتوں کا رونا رویا جائے، ہٹائیے۔ جانے دیجیے۔

اب یہاں سے اصل مضمون پڑھیے۔

بات یہ ہے کہ انسانی تمدن کی تاریخ ساری کی ساری انسانی خون سے بھی رنگی ہے جو بڑے ذوق وشوق سے طرح طرح کی جنگوں اور معرکوں میں بہایا گیا۔ قوموں نے ایک دوسرے کے تہذیبی خزانوں کو تباہ و برباد کیا۔ مسجد قرطبہ عیسائیوں کے ہاتھ میں چلی گئی اور سینٹ صوفیہ کا گرجا مسلمانوں کے قبضے میں آیا لیکن آرٹ کی روایت ہمیشہ آرٹ کی روایت رہی۔ یہ کبھی قومی اور ملکی حد بندیوں اور آپس کی نفرتوں کی روایت نہ بن سکی۔ کہتے ہیں کہ آرٹ یعنی رنگوں سے مختلف نقوش اور شکلیں بنانے کا فن قدیم مصر میں پیدا ہوا۔ یہاں سے اس فن نے بحیرہ میڈی ٹرینن کے جزیروں کا رخ کیا۔ یونان آکر مصوری اور سنگتراشی کے فن اپنی تکمیل کو پہنچے۔ پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح یونان کا عہد زریں تھا۔ تیسری صدی قبل مسیح میں ہندستان کے مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں میں راہب مصوروں کے ایک گروہ نے اجنٹا کی تصویریں شروع کیں۔ (یہ سلسلہ ایک ہزار سال تک چلا اور اس عرصے میں پہاڑوں کے اُنتیس غار کھود کے جو تصویریں اور مجسمے ان گمنام بدھ اور ہندو آرٹسٹوں نے بنائے وہ دنیا کے آرٹ کے مجموعی ذخیرے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے) بدھ سنگتراشوں نے جو مجسمے برصغیر کے شمال مغرب میں بنائے (جواب پاکستان ہے) ان میں یونانی فن کی جھلک ہے۔ گپتا بادشاہوں کے زمانے میں وشنو دھرم کے پجاریوں نے دیومالا کے کرداروں کو فن کے شہ پاروں کی شکل میں پیش کیا۔ اجنٹا کا اثر جاپان، چین اور انڈونیشیا پر بھی پڑا۔

قدیم روم یونان ہی کا چیلا رہا اور اس نے اپنی الگ راہ نہیں نکالی۔

یہ تو قصہ ایشیا اور یورپ کی قدیم تہذیبوں کے فنون لطیفہ کا تھا۔ لیکن اس دنیا سے واقعتاً

بہت دور اس دوسرے نصف کرّے میں جو کولمبس کی دریافت سے قبل ادھر کی متمدن دنیا کی نظروں میں گویا مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا ایک زبردست سلطنت اور اس کی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ یہ میکسکو کی مایا اور ازٹک تہذیبوں کا آرٹ تھا جس میں ناقابل یقین طور پر ہم عصر جنوبی ہند سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ میکسکو کے آرٹ کی عمر تقریباً ساڑھے تین ہزار سال ہے۔ مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال قبل سے لے کر ہسپانیوں کے میکسکو میں آمد تک اس ملک کے آرٹ نے جو ترقی کی اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ سنگ تراشی کے ان کے شاہ کاروں کے لیے صرف ایک لفظ میرے ذہن میں ہے یعنی Colossal۔ ان کی زمین اور موت اور بارش کی دیویاں جنوبی ہند کے مندروں کی یاد دلاتی ہیں۔ میں نے قدیم میکسکو کے باشندوں کے تخیل میں موت اور Morbidity کا بہت عمل دخل تھا۔ ان کے جو مجسمے اور تصویریں میں نے دیکھی ہیں ان سب میں قدیم ہندستان کے دراوڑ مندروں سے حیرت انگیز مشابہت کے علاوہ ہر چیز میں موت اور تباہی کے اس تصور کو کار فرما پایا۔ انھوں نے پھولوں، موسیقی، مسرت اور رقص کی دیبیوں دیوتاؤں کے بت بنائے ہیں اور اپنے زمانے کے عام لوگوں کی زندگی کی بھی عکاسی کی ہے۔ مگر ہر چیز پر فنا اور موت اور بے پایاں اندوہ کا سایہ منڈلاتا نظر آتا ہے۔ گویا ان ذہین لوگوں کو احساس تھا کہ دوسری دنیا سے ایک اجنبی سفید قوم آ کر ان کا نام و نشان ہمیشہ کے لیے مٹا دے گی۔ (یہ تو ہم ایشیائیوں کے لیے ایک پرانی کہانی ہے۔ اسٹاک ہالم اور لندن کی آرٹ کی نمائش میں رکھی ہوئی اس قدیم اور عظیم الشان تہذیب کی یہ یادگاریں عجب بے بس سی معلوم ہوتی ہیں۔)

قدیم میکسکو سے اب ہم دوبارہ اپنی پرانی دنیا کی طرف واپس آتے ہیں۔ ہماری پرانی دنیا میں ابھی سلطنت روما اپنے عروج پر تھی کہ فلسطین کے ایک گاؤں میں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔

اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی پیدائش کے ساتھ مغربی آرٹ کی تاریخ کا ایک بالکل نیا اور انوکھا باب شروع ہوتا ہے۔ یہ آرٹ یونان اور روم کے آرٹ سے بالکل مختلف تھا۔ یونانی جسم کی خوب صورتی کے پرستار تھے۔ مسیحی کلیسا نے روحانیت اور اس کی سمبلوم کو آرٹ میں متعارف کیا۔ اب جسم کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی لہٰذا بازنطینی تصویریں بھی قدیم مصر کی تصاویر کی طرح

ہمیں ساکت، منجمد اور علامتی نظر آتی ہیں۔ (اس کے برعکس اجنٹا اور دوسرے قدیم ہندو آرٹ میں جو اس وقت یونان اور بعد میں بازنطینیوں کا ہم عصر تھا، روحانیت کے تصور اور انسانی جسم کے مکمل حسن دونوں کو سمو دیا گیا تھا۔)

تیرھویں صدی عیسوی تک مقدس سلطنت روس اور سارے مغربی یورپ میں بازنطینیوں کا بول بالا رہا۔ روس نے دسویں صدی عیسوی میں پہلی بار مسیحی مذہب کو سرکاری طور پر اختیار کیا۔ اس وقت تک نصف یورپ اور ایشیا پر پھیلا ہوا یہ ملک حضرت عیسیٰ کے مذہب سے ناواقف تھا لیکن جنوبی روس کے تجارت پیشہ باشندے جو بحیرہ اسود کے ساحلوں پر رہتے تھے، بازنطینی سلطنت، یونان، ایران وغیرہ سے تجارت کرتے تھے۔ ان ممالک کے فنون لطیفہ اور ان کی تہذیبوں سے متعارف ہو چکے تھے۔ دسویں اور گیارہویں صدی میں بازنطینی کلیسا کے زیر اثر آنے کی وجہ سے بازنطینی آرٹ کی روایت کا عمل دخل روس میں بھی ہو گیا۔ روس نے پاپائے روم کے بجائے پطریخ قسطنطنیہ کی روحانی اطاعت اختیار کی تھی۔ اس وجہ سے یہ ملک ذہنی طور پر مغربی یورپ کی طرف جانے کے بجائے مشرق سے زیادہ قریب ہو گیا۔ سترھویں صدی میں پیٹر اعظم نے اپنے ملک کو زیادہ یورپین بنانے کا ارادہ کیا۔ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے مصوروں کو اٹلی، فرانس اور ہالینڈ بھیجا گیا اور Icons کی بجائے مغربی طرز کے پورٹریٹ بنوانے شروع کیے۔ کیتھرین دی گریٹ (1762 تا 1796 عیسوی) نے اپنے دور میں اور زیادہ مغربیت ملک میں پھیلائی اور اس وقت سے لے کر 1917 عیسوی تک روس کی مصوری اور باقی مغربی یورپ کی مصوری میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ (انقلاب کے بعد سے لے کر آج تک کا سوویٹ آرٹ ایک علاحدہ موضوع ہے۔)

چنانچہ قصہ مختصر یہ کہ عیسیٰ کی پیدائش سے گیارہ صدیوں بعد تک مغرب میں اسی طرح بازنطینی طرز کی مذہبی تصویریں بنتی رہیں۔ حتیٰ کہ صلیبی جنگوں کے خاتمے، زوال بغداد اور عربوں کے اسپین سے اخراج کے بعد مغربی آرٹ کی تاریخ نے پھر ایک نیا ورق پلٹا اور اٹلی میں سب سے پہلے نشاۃ ثانیہ کی روشنی پھیلی۔

یہ روشنی کہاں سے چلی تھی۔ مشرق میں بہت سی آندھیاں اٹھی تھیں جن سے چراغ جل

جل کر بجھ رہے تھے اور بجھے چراغ پھر جل اٹھے تھے۔ بات یہ تھی کہ مشرق میں بھی بڑا ہنگامہ تھا۔ یہاں ساتویں صدی عیسوی میں ایک نئی قوم پیدا ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰ کی امت کی طرح اس قوم کو بھی یہ آسمانی حکم ملا تھا کہ دیکھو تصویر کبھی نہ بنانا لیکن فن کارانہ تخلیق کی لگن نے ان لوگوں کو نچلا نہ بیٹھنے دیا اور جس ندی میں چینی، ہندستانی، ساسانی اور بازنطینی دھارائیں بہہ رہی تھیں ایک نئی دھارا بھی اس میں آن ملی۔

بعد میں یہ نئی دھارا مسلمانوں کے آرٹ کی روایت کہلائی۔ یہ گپ ہے کہ مسلمانوں کی جینئس کا اظہار زیادہ تر محض فن تعمیر میں ہوا کیونکہ مذہباً ان کے لیے تصویریں بنانا گناہ تھا۔ سب سے پہلی تصویریں جو انھوں نے بنائیں، اس وقت ابھی غالباً دوسری صدی ہجری ہی تھی۔ یعنی آٹھویں صدی عیسوی۔ یہ عراق کے ایک محل میں انھوں نے دیواروں پر فریسکوز بنائے تھے جن میں اس زمانے کے چھ بڑے بڑے بادشاہوں کی تصویریں تھیں اور غالباً یہ عرب مصوروں کی اوّلین پورٹریٹ تھے۔ قسطنطنیہ کا بازنطینی شہنشاہ، اسپین کا شاہ روڈرک (جسے کچھ عرصے قبل 711 عیسوی میں عربوں نے شکست دی تھی) قیصر روم، ابی سینیا کا نیگس، وسط ایشیا کا خاقان اور سندھ کا وہ ہندو راجہ جسے محمد بن قاسم نے ہرایا تھا، ان تصویروں میں پیش کیے گئے تھے۔ ان کے علاوہ ''فتح''، ''فلسفہ''، ''شاعری'' وغیرہ کو بھی انسانی شکلوں میں دکھایا گیا تھا۔ ان فریسکوز کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے برٹش میوزم لندن میں موجود ہیں جن کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان عربوں نے بھی بازنطینیوں کو اپنا گرو بنایا تھا۔ نویں صدی عیسوی کے جو عباسی عہد کے محلات بغداد کے نزدیک دریافت کیے گئے ہیں ان میں بھی فریسکوز موجود ہیں جن میں شکار کے مناظر اور بانسری بجانے والیاں ہیں۔ ساتھ ہی عربی اور یونانی تحریریں منقش ہیں جن سے پتہ چلا کہ شروع میں مسلمانوں کو بازنطینیوں کے علاوہ یونانیوں نے بھی متاثر کیا تھا۔

یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ الحمرا کے مرمریں شیروں کے علاوہ عبدالرحمٰن سوئم (912 عیسوی-961 عیسوی) کے خوبصورت دارالخلافہ مدینۃ الزہرا میں اور مجسمے بھی تھے۔ اور معتمد، شبیلہ کا بادشاہ بھی سنگ تراشوں کی ہمت افزائی کرتا تھا۔ ادھر دسویں صدی عیسوی کے سمرقند و بخارا کے

حکمراں چینی مصوروں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کی طرح امیر تیمور صاحبِ ذوق اور آرٹ کے قدر دان تھے۔ انھوں نے 1397 عیسوی میں سمرقند کے پبلک باغات میں فریسکوز سے مزین بنگلہ بنوایا تھا۔ جس طرح آج کل مغربی ممالک میں میونسپل آرٹ گیلریاں تعمیر کی جاتی ہیں۔ (فتح پور سیکری کی دیواروں پر جو تصویریں منقش ہیں ان کے سولھویں صدی کے راجپوت ایرانی طرز کے باوجود ہلکی سی جھلک سینٹرل ایشیا کی نمایاں ہے جو اکبر اعظم کے باپ دادا کا دیس تھا۔) صفوی خاندان کے ایرانی بادشاہوں کے یہاں بھی فریسکوز کا عام رواج تھا۔ اسلام کی آمد سے پہلے ایران میں مانی صاحب تو خیر موجود ہی تھے ان کے علاوہ ساسانی بھی تھے (مانی صاحب کا قصہ بعد میں مسلمانوں کو بہت ہی بھایا، جو تیسری صدی عیسوی میں پیدا ہوئے تھے اور بہ یک وقت مصور بھی تھے اور پیغمبر بھی اور دور دراز کے قرطاجنہ کے بانی سینٹ آگسٹین کو بھی بہت پسند آ گئے تھے اور پھر زرتشتیوں کے بادشاہ بہرام کے ہاتھوں آپ کا انتقال ہوا۔ بہرحال شاعری میں اس قدر اس کا ذکر ہوا ہے کہ کم از کم میں بہت بور ہو چکی ہوں۔) ایرانی فخریہ کہتے ہیں کہ مانی دنیا کے عظیم ترین مصور تھے۔ ساسانی چٹانیں کاٹ کاٹ کر مجسمے بنایا کرتے تھے۔

اس زمانے میں چینی آرٹ بھی اپنے عروج پر تھا۔ لیکن سر طامس آرنلڈ کا کہنا ہے کہ اس کے متعلق ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ تاتاریوں کے حملے سے پہلے چینی آرٹ کا ایران پر کچھ اثر ہوا تھا یا نہیں۔ (نگار خانہ چین کا تو مستقل شاعری میں ذکر ہے۔) منگولوں کی یلغار کے بعد چینیوں کے فن مصوری کا بہت گہرا اثر ایرانیوں پر ہوا اور ایران کے ذریعے چین کا یہ اثر ہندستان میں داخل ہوا۔ (پتوں، اژدھوں، درختوں کی شاخوں اور بادلوں کا طرز ایرانی تصویروں میں حملے کے بعد بہت زیادہ چینی ہو گیا تھا۔) پندرھویں صدی سے قبل کا ایرانی آرٹ زیادہ تر داستانوں، سائنٹیفک مقالوں، طب، نباتات وغیرہ کی کتابوں کی تزئین پر مشتمل تھا۔ فردوسی، نظامی اور سعدی کی تصانیف کو مستقل مصور کیا جاتا رہتا تھا۔

اس تمام عرصے کے دوران یونانی، بازنطینی، چینی اور ایرانی طرز میں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہیں۔ اس کی ایک وجہ تو وہی قسطنطنیہ کا کلیسا تھا دوسری وجہ تجارتی تعلقات تھے۔

ایک مزے کی بات ایرانی آرٹ کے ضمن میں یہ قابل ذکر ہے کہ گو اسلام نے پیغمبروں کی تصویریں بنانے کی سختی سے ممانعت کی تھی لیکن ایرانی مصوروں نے اس کی بالکل پروانہ کی۔ جن کی تخلیق کے سامنے مذہبی احکام ایک ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ ایران نے شیعہ مذہب اختیار کیا تھا اور کٹر راسخ العقیدہ سنّی اسلام کے مقابلے میں یہ شیعہ کچھ کچھ ایسے ہی رہے ہوں گے جیسے بعد کی صدیوں میں پروٹسٹنٹ Puritan عیسائیوں کے مقابلے میں کلیسائے روم کے کیتھولک تھے۔ بہر حال ان ایرانیوں نے زوال آدم سے لے کر نوحؑ، یونسؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ و مریمؑ، بلقیس و سلیمانؑ، یوسفؑ و زلیخا، سکندر اعظم، یاجوج ماجوج اور اصحاب کہف تک سبھی کی تصویریں بنا ڈالیں۔ ان تصویروں میں ان مقدس ہستیوں کے سروں کے گرد مسیحی طرز کے گول نور کے ہالے کے بجائے شعلوں کے ہالے ہیں اور ان شعلوں میں چین کا اثر صاف طور پر نمایاں ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا قصہ جو انھوں نے مصور کیا ہے وہ مسیحی روایت سے بالکل مختلف اور قرآن شریف پر مبنی ہے۔ لہٰذا ان تصویروں میں اصطبل، بھوسے کے ڈھیر وغیرہ کا کہیں ذکر نہیں بلکہ ہر جگہ مقدس ماں اور بیٹے کو ریگستان میں کھجور کے درخت کے نیچے دکھایا گیا ہے۔ چونکہ قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ کے بپتسمے کا کوئی ذکر نہیں لہٰذا یوحنا پیغمبر کی صرف ایک تصویر ہے اور اس میں یوحنا صاحب بڑے ٹھاٹھ سے سینٹرل ایشیا کا لباس پہنے بیٹھے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصاویر بازنطینی آرٹ کے زیر اثر قطعی نہیں بنائی گئی تھیں بلکہ یہ ان مصوروں کی اپنی اپج تھی۔ ان کے علاوہ ایران اور ہندستان کے صوفیوں کی بھی ان گنت تصویریں بنائی گئیں۔ رضا عباسی ان تصویروں کے بنانے میں پیش پیش تھے۔

عراق کے ان فریسکوز کے علاوہ جن کا اوپر میں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے، اسلام کی اوّلین شبیہیں ساتویں صدی عیسوی کے خلفا کے سکوں پر ملتی ہیں جنھوں نے روم کے سکوں کی روایت کو قایم رکھا تھا۔ لیکن تاتاریوں کی یورش کے بعد پندرھویں صدی سے سلطان حسین مرزا (1473 - 1506ء) شاہ طہماسپ (1529 - 1576ء) اور شاہ عباس (1587 - 1629ء) کے زمانوں میں ایران میں پورٹریٹ پینٹنگ کے فن کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

ان مسلم ممالک میں آرٹسٹ کی بڑی قدر تھی۔ عموماً اس کا اسٹوڈیو دربار شاہی سے منسلک ہوتا تھا۔ شاہی کتب خانوں کے اسٹاف میں بھی مصوروں کی بڑی تعداد کا تقرر کیا جاتا تھا۔ شاہ اسماعیل نے 1522 عیسوی میں ایک خاص فرمان کے ذریعے فخر دوراں استاد کمال الدین بہزاد کو امپریل لائبریری کا ڈائرکٹر مقرر کیا۔

ایرانی صورت گروں کی کہانی بڑی دلآویز ہے۔ مثال کے طور پر حاجی محمد نقاش تھے جو مائیکل اینجلو کی طرح بیک وقت موجد، انجینئر اور مصور تھے۔ ان کے علاوہ میرزین العابدین، علی اصغر کاشانی، مرزا محمد اصفہانی (پاکستان کے ہائی کمشنر متعینہ لندن نہیں) تھے۔ ایک چینی آرٹسٹ تھے جن کا نام محمدی تھا۔ اور رضا عباس تو تھے ہی۔ شاہ عباس نے پیٹر اعظم کی طرح اپنے ہاں کے ایک مصور محمد زماں کو مزید تعلیم کے لیے روم بھیجا۔ روم میں محمد زماں صاحب سینور پاؤلو زماں کہلائے اور بہت نام پیدا کیا۔ اٹلی سے واپسی پر سینور پاؤلو ہندستان تشریف لائے اور شاہجہاں کے مصوروں کے ساتھ کام کرتے رہے۔

ہندستان میں اس وقت یہ سلسلہ تھا کہ کلاسیک بدھ آرٹ اور برہمن آرٹ کے دور اور سولھویں صدی عیسوی کے جدید اسکولوں کے قیام کے درمیان کے زمانے میں خاصا فاصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ گو ملک کے مختلف حصوں میں، خصوصاً جنوبی ہند اور گجرات وغیرہ میں سنگ تراشی کی روایت بڑے زور شور سے زندہ تھی۔ نٹ راج کا مجسمہ گیارہویں صدی عیسوی میں ڈھالا گیا) مختلف طرح کے پتھروں اور دھاتوں سے مجسمے بنائے جاتے رہے مغلوں کی آمد سے بہت قبل ہی ایرانی آرٹ نے گجرات کے فن مصوری کو متاثر کر دیا تھا۔ گجراتی Miniatures اور کتابوں کے سرورق، پر ایرانی اثر کافی حد تک نمایاں ہے۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہوئی کہ ایران سے کاغذ کے استعمال کو پندرھویں صدی میں ہندستان میں متعارف کیا گیا اور ایرانی رنگوں کی درآمد (خصوصاً استعمال کو پندرھویں صدی میں ہندستان میں متعارف کیا گیا اور ایرانی رنگوں کی درآمد (خصوصاً Lapis Lazuli) کی وجہ سے ملک میں گہرے اور شوخ رنگوں کا چرچا ہوا۔ ایرانی کاغذ اور ایرانی رنگوں کی دریافت نے ہندستانی مصوری کو گویا نئی جلا بخشی۔ مغلوں سے قبل کے گجراتی آرٹ

میں ایرانی Decor دیکھ کر تعجب سا ہوتا ہے مغلوں سے قبل کے ہندستان میں ایک اور اسکول اپنے عروج پر تھا۔ یہ احمد نگر، بیجاپور، بیدر اور گولکنڈہ کے سلطانوں کی سرزمین میں پروان چڑھنے والا دکن کا مدرسہ تھا۔ احمد نگر کے سلطان حسین شاہ اور بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ، دونوں آرٹ کے بڑے پرستار تھے۔ شمالی ہند میں مغلوں کے زیر اثر جو نیا اسکول قائم ہوا اس کے ارتقا میں دکن کے اسکول کا بہت بڑا حصہ ہے۔

شہنشاہ ہمایوں نے شاہ طہماسپ کے دربار کے استاد میر سید علی کو امپیریل لائبریری کی کتابوں کو مزین کرنے کے لیے مدعو کیا۔ اس عظیم مصور اور اس کے ساتھیوں نے داستان امیر حمزہ کے لیے چودہ سو تصویریں بنائیں اور یہاں سے وہ اسٹائل شروع ہوتا ہے جو خالص ایرانی ہونے کے بجائے زیادہ ''مغل'' ہو گیا تھا۔ (ان دونوں میں کیا نمایاں فرق تھا؟ دراصل میں اس سیدھی سادی کہانی کو آرٹ کے Jargon استعمال کر کے دقیق نہیں بنانا چاہتی، لیکن بہرحال، مغل طرز جو پیدا ہوا اس میں رنگوں میں زیادہ Unity تھی۔ پس منظر میں بجائے ایک سطح کے کئی سطحیں تھیں اور مجموعی طور پر لوچ اور نزاکت کے بجائے زیادہ جان اور حرکت تھی) عین اس زمانے میں چینی مصور محمدی کا اسکول ایران میں مقبول ہو رہا تھا۔ اور چین کے نازک، لہراتے ہوئے نقوش ایرانی نگار خانوں میں جگہ پا رہے تھے۔

سولھویں صدی میں راجپوت اسکول نے بھی ہندستان میں ترقی کی۔ لازمی بات تھی کہ مسلمانوں نے اس اسکول کو بھی متاثر کیا۔ لہٰذا کرشن کنہیا ان تصویروں میں چوڑی دار پاجامہ اور عبا پہنتے تھے اور گوپیاں مستقل مغل شہزادیوں کے لباس میں کلیلیں بھرتی پھرا کرتی تھی۔

مغل دربار کی شدید آرٹسٹک گہما گہمی نے سارے برصغیر کے مصوروں کو اپنی اور کھینچا۔ بابر نامہ رام داس نے اکبر اعظم کے لیے مصور کیا۔ بشن داس نے مہابھارت کے فارسی ترجمے رزم نامہ کے لیے تصویریں بنائیں۔ نار سنگھ نے رانی درگا دتی اور آصف خاں کی جنگ کو ریکارڈ کیا۔ عہد اکبری کے دوسرے مصور مسکین، بھگوان، تلسی، مکند، فرخ بیگ تھے۔ یہ تصویریں ہمارے یہاں نہیں ہیں۔ جو یورپ اور طربانیہ کی آرٹ گیلریوں میں وقتاً فوقتاً ان کی نمائشیں ہوتی ہیں۔

ان ملکوں میں مقیم ہمارے ہم وطن اپنے ان تہذیبی خزانوں میں کوئی دلچسپی لینے کے بجائے اپنا وقت نائٹ کلبوں میں گزارتے ہیں۔)

اسی عہد اکبری میں ہندستانی مغل اسکول کا ارتقا ہوا۔ چینی مصوروں سے انھوں نے ''فاصلے'' کا احساس حاصل کیا۔ اکبر کے دربار میں Jesutis نے یورپین مصوری کے نمونے مہابلی کی خدمت میں پیش کیے۔ یہ اٹلی کے نشاۃ ثانیہ کے شاہکار رہے ہوں گے۔ ہندستانی مغل مصوروں نے ان تصویروں کو دیکھا تو ان کو معلوم ہوا ایک چیز Perspective ہوتی ہے۔ جس کی طرف چینی کے علاوہ مشرقی مصوروں نے کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا۔ برٹش میوزیم میں ایک یورپین سیاح کی تصویر ہے جو عہد اکبری کے کسی مصور نے بالکل مغربی تکنیک کے ساتھ بنائی ہے۔ جہانگیر کے دور میں مغربی اثر زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ ایک عیسائی پادری کی لکھی ہوئی کتاب داستانِ مسیح کو مصور کیا گیا اس میں سارے کردار پرتگالی لباس پہنے ہیں۔ ''سینٹ سیلیا کی شہادت'' تو عین مین اطالوی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ ''گٹار بجانے والی بھی یورپین آرٹ کے زیر اثر بنائی گئی تھی۔ یہی حال مشفق صاحب کی تصویروں کا تھا جو دربار جہانگیری سے منسلک تھے۔ ان کی ایک تصویر The Musea اطالوی طرز میں ہے۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ کوئی ان کا ہم عصر اطالوی آرٹسٹ یہی تصویر کم از کم تین چار فٹ لمبی اور چوڑی بناتا۔ لیکن Miniatures کے بادشاہ اس ہندستانی مغل مصور نے چند انچ کی لمبائی چوڑائی میں سارا قصہ نپٹا دیا۔ جہانگیر کے عہد میں پورٹریٹ کو بھی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ ایران اور ترکی میں بھی اس وقت پورٹریٹ پر دھیان دیا جا رہا تھا۔ جہانگیر کے عہد کے مشہور مصور منوہر، استاد منصور، نادرالزماں، ابوالحسن، مرزا فرخ بیگ وغیرہ تھے۔ عنایت پر بھی یورپ کے ہم عصر Baroque آرٹ کا اثر پڑا۔ سترھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے روشنی اور سائے کے ہلکے سے امتزاج کے ساتھ جنگلی جانوروں کا شکار کھیلنے کے رات کے مناظر زیادہ دلچسپی کے ساتھ پینٹ کیے جانے لگے۔ شاہجہاں کے دور میں بالچند، گوردھن، بچتر، لال چند اور چترامن کام کر رہے تھے۔

اس زمانے کے کانگڑہ اور راجستھانی (مغل پرونشل اسکول) تصویروں کے نقوش اور

ڈرائنگ قابل ذکر ہیں۔ یہاں کرشن کنہیا کے علاوہ سادھوؤں اور جوگنوں کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ دکن اسکول والے پورٹریٹ خوب بناتے تھے۔ اور سال کے مختلف موسم اور موسیقی کے راگ، راگنیوں کی تصویریں بنانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اٹھارھویں صدی کی خانہ جنگیوں اور مرہٹوں کے حملے نے ہندستانی آرٹ کے اس خوب صورت دور کو یک لخت ختم کر دیا۔ ویسے تو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی بنائی ہوئی تصویروں میں ہی شوخی اور زندگی کی جگہ ایک سنجیدگی اور ٹھہری ہوئی کیفیت آچلی تھی۔ لیکن مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ مغل مصوری کا عہد زریں بھی رخصت ہوا۔ الگ الگ صوبوں میں مصوری کے صوبے جاتی اسکول قائم ہو گئے۔ تصویریں تو جہاں دار شاہ، محمد شاہ کے عہد میں بھی بنیں لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

دلّی پر جب تباہی آئی تو شاعروں کی طرح مصوروں نے نسبتاً محفوظ ریاستوں کا رخ کیا۔ یوں لکھنؤ، مرشد آباد، پنجاب کی پہاڑی ریاستوں اور ادھر جنوب میں ارکاٹ میں علاحدہ علاحدہ مصوری کی روایتیں قائم ہو گئیں۔ اودھ اور مرشد آباد میں اُنیسویں صدی تک فن مصوری گھسٹتا رہا لیکن پنجاب کی پہاڑی ریاستوں کو اب بھی امن نصیب نہ ہوا اور جس وقت راجہ رنجیت سنگھ لاہور میں تخت پر بیٹھے ہیں اس وقت تک برصغیر کے اس شمال مغربی خطے میں مصوری دم توڑ چکی تھی۔

اٹھارھویں صدی کے آخر اور اُنیسویں صدی میں تین اسکول ہمارے سامنے آتے ہیں لکھنؤ اسکول جو اب تک دربار سے منسلک تھا اور کلکتہ کا کالی گھاٹ اسکول اور بنارس اور پٹنہ اسکول۔ کلکتہ، پٹنہ اور بنارس کے اسکولوں کا ذکر میں بعد میں کروں گی۔ کیونکہ ہمارے جدید آرٹ کی تاریخ میں ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

لکھنؤ اسکول کی تصویروں میں وہی فرق ہے جو دلّی اور آگرہ کی مغل عمارات اور لکھنؤ اور فیض آباد کے نوابی عہد کی عمارات میں موجود ہے۔ طرزِ تعمیر اور مصوری کے اس فرق کو ہم محض 'پروفشل' کہہ کر نہیں ٹال سکتے۔ ایک پورے نظریہ زندگی کا اختلاف اودھ کے اس فن سے نمایاں ہے۔ اب طرزِ تعمیر اور مصوری دونوں میں شدید صناعانہ باریکیوں پر دھیان نہیں دیا جا رہا تھا۔ غالباً زندگی کا یہ پورا بکھیڑا اس قابل نہ تھا کہ اس پر زیادہ سر کھپایا جاتا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ ایسٹ انڈیا

کمپنی کی حکومت تھی اور مغربی مصوروں کے شاہکار تو معمولی بات تھی، اب رائل اکیڈمی کے بہت سے انگریز مصور خود بہ نفس نفیس ہندستان میں آکر رہتے تھے۔ اودھ اسکول کی تصویروں میں رنگوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ نہیں۔ عموماً طوطے کے پروں والا سبز اور نارنجی رنگ نمایاں ہے۔ مغل تصویروں کی طرح آسمان کا رنگ گھلا ہوا اور ایک سطح کا ہونے کے بجائے سبز، سرخ اور نیلے رنگوں کے الگ الگ Strokes ہیں۔ اکثر تصویروں میں بارہ دری وغیرہ کی جالی بنانے میں لاپروائی سے کام لیا گیا ہے۔ ان خصوصیات سے اس اہم بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اب مصور تفصیل کے بجائے مجموعی تاثر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کمپنی کی حکومت کے زمانے کی بنائی ہوئی تصویروں میں حقیقت پرستی کا عنصر نمایاں ہوتا جارہا تھا۔ لکھنؤ اسکول کی تصویروں کے رنگ بھی Flat نہیں رہے۔

کلکتہ کا کالی گھاٹ اسکول ہمیں بالکل ایک دوسری دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں عوامی آرٹ تھا۔ اگر جیمنی رائے کے نقوش آپ کے ذہن میں ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ کالی گھاٹ اسکول کا ہر مصور جیمنی رائے تھا۔ ادھر پٹنہ اور بنارس میں جو تصویریں بن رہی تھیں وہ بھی آنے والے دور کی پیغامبر تھیں۔ یہاں دربار اور شہزادیوں اور بادشاہوں کا کوئی گزر نہ تھا۔ پٹنہ اسکول کی اُنیسویں صدی کی وسط کی تصویریں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ جدید بنگال اسکول کی داغ بیل یہیں سے پڑی۔ بنارس اسکول کی تصویروں میں بھی عوامی رہن سہن کو بڑے دھیان اور بڑے پیار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یورپ دیس کی عورتیں کھلونے بیچ رہی ہیں، کھانا بنا رہی ہیں، جھونپڑے کے باہر گائے بیل بندھے ہیں، کمہار اور قصاب اور کنجڑے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ جنسی لال اس اسکول کے قابل ذکر مصور تھے۔

میں نے اوپر کہیں لکھا تھا کہ کئی برحانوی آرٹسٹ جن میں رائل اکیڈمی کے طامس ڈینیل، آرتھر ولیم ڈیوس اور یاہمفری وغیرہ شامل تھے، اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہندستان آئے۔ اور یہاں رہ کر کام کیا۔ مگر ان کو ہندستان کی قدیم روایت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ہندستانی آرٹ کو بے انتہا پھٹیچر اور ناقابل اعتنا سمجھتے تھے۔ انگریز حاکموں نے ملک کے فن کو اپنے فن سے قریب لانے

کی ذرا کوشش نہ کی۔ شاید انھوں نے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی کہ ان سے پہلے مغلوں نے جو اُن کی ہی طرح فاتح کی حیثیت سے اس ملک میں آئے تھے انھوں نے پچھلے تین چار سو سال میں آرٹ کی ترویج و ترقی کے لیے کیا کچھ کیا تھا۔ برطانوی مصوّروں میں سے اکثر کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملازمت میں رکھا تھا اور کئی ایک کو ہندستانی شہزادوں نے اپنے یہاں تصویریں بنوانے کے لیے مامور کر رکھا تھا۔ انھوں نے ہندستانی درباروں میں رہ کر ہزاروں روپیہ سمیٹا۔ ان ہی مصوّروں میں سے ایک جان زوفینی آرا ہے تھا۔ جس نے کئی سال لکھنؤ میں رہ کر نواب آصف الدولہ کے خاندان اور دوسرے انگریز اور ہندستانی امرا کی تصویریں بنائی تھیں۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کے آرٹ کی کہانی شروع کرنے سے پہلے میں نے لکھا تھا کہ گیارہ صدیوں تک بازنطینی آرٹ کا مغرب میں چرچا رہا۔ پھر اس طرف بغداد اور اسپین میں مسلمانوں پر زوال آیا اور ادھر اٹلی میں تجدید علوم و فنون کی روشنی پھیلی۔ مسلمان قوم کا آرٹ ایران اور ہندستان میں زندہ رہا۔ لیکن اب مغرب اور مشرق کی روایتیں الگ الگ ہو چکی تھیں۔ اور بالکل مخالف سمتوں میں جا رہی تھیں۔ مشرق کا آرٹ پر اسرار، روحانیت پرست اور Decorative رہا۔ مغرب میں اطالوی استادوں کی قیادت میں چودھویں اور پندرھویں صدی میں مصوّری نے حقیقت پرستی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ مشرق اور مغرب کے طرز فکر اور انداز تخیل اور طریقہ اظہار میں زمین و آسمان کا فرق رہا۔ حتیٰ کہ جاپانی تصویروں کے شدید حسن نے اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف میں فرانسیسی مصوّری کے پس منظر میں بہت حد تک جاپان کار فرما ہے۔ لیکن ابھی تیرھویں صدی میں اٹلی کے مصوّر بازنطینی مشرق کی قیود سے خود کو آزاد کر رہے تھے۔ فلورنس کے چند نوجوان مصوّروں نے روشنی اور سائے کے وجود کا بھی انکشاف کیا۔ آرٹ اب تک کلیسا کی خدمت کے لیے وقف تھا ان نئے مصوّروں نے یونانی دیومالا کی طرف توجہ دی۔ (پندرھویں صدی میں مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کیا۔ لہٰذا بازنطینی روایت کا رہا سہا اثر بھی یورپ میں ختم ہو گیا اور اس روایت کو روسیوں نے اپنے یہاں ماسکو اور کیوا کے گنبد والے کلیساؤں میں محفوظ کر لیا) یہ فلورنس والے داؤنی رفائیل، مائیکل انجلو اور وینس کے تن تورتو، ویرونیز

وغیرہ اتنے عظیم استاد تھے کہ ان کے بارے میں یہاں صرف چند جملے یا پیراگراف لکھنا مسخرہ پن کی بات ہے اور یہ مضمون ان استادوں کے بارے میں نہیں ہے۔ خیر اب یوں سمجھیے کہ اٹلی سے ندی کی اس دھارا نے شمال مغرب کا رخ کیا اور فلینڈرز، جرمنی، اسپین اور ہالینڈ کا رخ کیا۔ نشاۃ ثانیہ کی روشنی نے ان ممالک میں الگ الگ مختلف چیزوں کو نمایاں کیا۔ اسپین بڑی شدت سے کیتھولک تھا اس کی اس کیفیت کی نمائندگی ایل گریکو نے کی۔ ہالینڈ پروٹسٹنٹ تھا اور مڈل کلاس۔ فرانز ہالز اور ریمبراں اس ملک کے عظیم مصوّر تھے۔ پیٹر پال ربینز فلینڈرز کے تھے۔ ان سب کی تصویروں میں شدید حقیقت پسندی، سادگی اور گھریلو پن تھا۔

برطانیہ میں مصوّری عرصے تک ایک ڈھرے پر چلا کی۔ پہلے جرمن استاد ہانس ہولبین کو ہنری ہشتم نے مدعو کیا۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں انگلستان بھی اطالیہ اور یورپ کو اپنا گرو مانتا رہا۔ ہوگارتھ (1697–1764 عیسوی) انگلستان کا پہلا بڑا مصوّر تھا۔ ولیم بلیک (1757–1827 عیسوی) ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس شاعر اور مصوّر کے تخیل کا یہاں تجزیہ کرنا غیر ضروری ہے۔ سر جوشوا رینالڈز (1723–1792 عیسوی) اور گینز برو (1727–1788 عیسوی) نے اکیڈیمک مصوّری کی روایت شروع کی۔ آج رائل اکیڈیمی برطانیہ کا ایک خاصا حل طلب مسئلہ ہے۔ جدید مصوّر اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور رائل اکیڈمی والے جدید مصوّروں کو چڈوخانہ سمجھتے ہیں۔

مغربی آرٹ کے پچھلے دو ہزار سال کی تاریخ کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ پہلے مصوّروں نے جذبات کے ذریعے اپنے گردوپیش کی ترجمانی کی۔ اس کے بعد مذہبی موضوعات کے متعلق کچھ قاعدے قانون سے بن گئے اور ان پر پابندی سے چلا جانے لگا۔ اس کے بعد دنیا کی عکاسی جذبات کے راستے نہیں ذہن کے راستے کی گئی۔ پھر چند قاعدے ایسے وضع کیے گئے جو اپنے بڑے استادوں کے اصولوں پر نہیں کیے گئے تھے۔ یہ رجحان ''اکیڈمزم'' کہلایا۔ اکیڈمی انگلستان میں کانسٹبل اور ٹرنر امپریشنزم کے پیش رو تھے۔ فرانس میں اُنیسویں صدی کے آخر میں مونے اور پزارو نے باقاعدہ طور پر امپریشنزم کو ایک تحریک کی شکل دی۔ جس کا مطلب تھا

کہ ماحول پہلی جھلک میں مصور کو نظر آئے، اس کو اسی طرح پیش کیا جائے بیسویں صدی کے شروع میں پوسٹ امپریشنزم پیدا ہوئی۔ اس میں چیزوں کی ترجمانی کرنے میں ذہن کے بجائے جذباتی کیفیت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ 1908 عیسوی میں کیوبزم کا پرچار ہوا۔ فیوچرزم کا رجحان اٹلی میں پیدا ہوا پھر ایکسپریشنزم اور سب سے آخر میں سریلزم کا بول بالا ہوا۔ فرانس کے ان عظیم استادوں پوزاں، انگرے، میزاں، رینوا، متیس، گوگاں، پابلو پکاسو میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہاں کچھ نہیں لکھا جاسکتا۔ اس کے لیے ایک علاحدہ کتاب چاہیے۔ بہرحال ان حضرات کے کم از کم ناموں کی تو ہمیں اطلاع ہو چکی ہے۔ اور ہم کو یہ بھی پتہ ہے کہ آرٹ کی ندی میں جو پچھلے کئی ہزار سال سے بڑے سکون اور نرم روی سے بہتی چلی آرہی تھی اس میں ان کی وجہ سے کتنا زبردست طوفان آیا۔ یہ طوفان یا بھونچال اسے جو بھی کہیے اس کی وجہ سے ایک پوری سوچنے والی دنیا کے ذہن اور جذبات بالکل ہل اور دہل کر رہ گئے اور اب کوئی چیز اپنی جگہ پر قائم نہیں اور اب کسی سلامتی کی امید نہیں۔ ہم سب چاہے ہمیں اس کا احساس نہ ہو کب کے اس آندھی کے بگولوں کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔

انگلستان کا مزاج ہمیشہ سے قدامت پسند رہا۔ لہٰذا فرانس کے آرٹ کا ہر فیشن تقریباً بارہ سال بعد انگلستان میں رائج ہوتا تھا اور اس کے اگلے بارہ سال بعد عام پبلک تک پہنچتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انگلستان اس نصف صدی میں برابر وفاداری کے ساتھ فرانس کے فیشنوں کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ جدیدیت کے اس انقلاب نے پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی پچیس سالوں میں انگلستان اور مغربی یورپ کے طریقے فکر اور طرز زندگی میں ایک زبردست ہلچل مچادی۔ جدیدیت کے فیشن خصوصاً Abstractionism انٹریرڈ یکوریشن، فرنیچر طرز تعمیر میں رائج کیے گئے۔ جدید ادب اور جدید موسیقی کا دور دورہ رہا۔

جس طرح میاں پابلو پکاسو ہر سال پیرس کا فیشن تبدیل کرتے رہے، اسی طرح انگلستان میں بن نکلسن کی قیادت میں ''گروپ''۔ ''یونٹ ون'' اور ''سات اور پانچ'' کے نام سے نئے نئے گروہ وجود میں آئے۔

انگلستان اور مغربی یورپ کے عوام غیر محسوس طریقے سے نئے رنگوں، نئی لکیروں اور نئی ہیئت کی اس انوکھی دنیا کے اب عادی ہو چکے تھے۔ جو کمرشل آرٹ اور انڈسٹریل ڈیزائن زنانہ رسالوں کی فیشن پلیٹس اور کاروں اور فرنیچر کے نئے نمونوں کے ذریعے ان کے چاروں اور پھیل چکی تھی۔ انگلستان میں اس زمانے میں موڈرن آرٹ کے متعلق لوگوں کا بڑا دلچسپ رویہ تھا۔ برطانوی سنگ تراشوں اور مصوّروں اپسٹین، باربرا ہیپ ورتھ، ہنری مور، وِنڈھم لوئی، پال نیش وغیرہ کے فن کے نمونوں کی تصاویر کے ساتھ اخباروں میں خوش مزاجی سے سوال کیا جاتا ذرا پوچھیے تو یہ کیا ہے؟

اب تو خیر موڈرن آرٹ کو جدید شاعری اور موسم کی طرح وہاں پر Accept کیا جا چکا ہے۔ کیونکہ اس سے فرار کا بہر صورت کوئی راستہ نہیں۔

ہمارے یہاں اس جدیدیت اور تحریکوں کی آواز بازگشت کوئی پچیس چالیس سال بعد سنائی دی ہے۔ گو بنگال کے استادوں نے اُنیسویں صدی کے آخر میں (وہ فرانس کے استادوں کے ہم عصر تھے) اور ان کے بعد امرتا شیر گل نے ہمیں ایک نئی دنیا دکھائی اور نئے راستے ہمارے لیے تیار کیے۔ بنگال کی طرح بمبئی اسکول والے بھی ہمیشہ اور بجنل رہے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے جو کچھ ہم لوگ بناتے ہیں وہ زیادہ تر نقالی اور خاصا مسخرہ پن ہے۔ ہندستان اور لنکا کی جدید مصوری کی روایت پر یہاں مضمون نہیں لکھا جا سکتا۔ اس وقت میرے ذہن میں پاکستان کے آرٹ کا مسئلہ ہے۔ یقیناً ہمارے یہاں چند بہت اچھے مصوّر موجود ہیں (گنتی کے دو یا تین) پھر اللہ کا نام ہے۔ میں ایک بات ناگوارِ خاطر نہ ہو تو آخر میں کہوں، اپنے پس منظر میں اتنی عظیم آرٹ کی روایت کے موجود ہوتے ہوئے بھی (جس کا ذکر میں تفصیل سے پچھلے صفحوں میں کر چکی ہوں) بحیثیت قوم ذہنی طور پر ہمارا دیوالہ پٹا ہوا ہے۔ ہم خاموشی اور انکسار کے ساتھ کچھ سیکھنا نہیں چاہتے۔ شیخی بہت ہانکتے ہیں، اور انٹرنیشنل پیمانے پر اپنے فنکارانہ کارناموں کے بارے میں مستقل بڑے بڑے جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ اور اسی غلط پروپیگنڈے اور شیخی کے زیر اثر ہمارے مصوّروں نے جنھوں نے ابھی گھٹنوں چلنا بھی نہیں سیکھا، جوش میں آکر سرپٹ دوڑنا

شروع کر دیا ہے۔

تو قصہ مختصر یہ اے معزز ناظرین! کہ اتنا طویل مضمون جو میں نے لکھا اس سے میرا مطلب محض یہی تھا کہ آپ حضرات ذرا امریکن فلموں اور دنگلوں اور قوالیوں کی طرف سے تھوڑی سی توجہ ہٹا کر اپنے ملک کے ثقافتی مسائل کے بارے میں بھی ذرا سنجیدگی سے سوچنے کی کوشش کیجیے۔ حکومت تو نہروں کے پانی کا مسئلہ طے کر رہی ہے، آپ بھی کچھ کر ڈالیے۔

(ماہنامہ ''سیارہ'' کراچی، شمارہ 1، جلد 4)

جمیل الدین عالی کے دوہے

اس وقت میں جمیل الدین عالی کے دوہوں میں روایتی امیجری کا مختصر تذکرہ کروں گی۔

خالص امیج اور آئیڈیا کے اظہار کے لیے سر، رنگ اور لفظ تینوں ایک ساتھ الگ الگ ضروری ہیں۔ سنسکرت جمالیات کا مشہور نظریہ ہے کہ سر دکھلائی دینے لگیں اور رنگ سنائی دیں جسے اردو محاورے میں کہا جائے گا کہ رنگ بولنے لگیں۔ امیج کا تعلق لفظ سے بھی ہے اور مخصوص تلازمہ خیال اور کیفیات الفاظ کے ساتھ بھی وابستہ ہیں۔ اس وجہ سے فارسی اور اردو شاعری کا انگریزی ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔ ہندی اور اردو چوں کہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں ان کے الفاظ سے وابستہ امیجری بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں۔ یہاں میں یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ ہمارے ذہنوں پر سیاست اس قدر حاوی ہو چکی ہے کہ ہم بیسویں صدی یا دور حاضر کی سیاست کی روشنی میں گفتگو ہی گزشتہ زمانوں کے معاملات پر کرتے ہیں۔ دوہوں کے سلسلے میں خاکسار کو شمالی ہند کہنے کی اجازت دیجیے۔ (اس علاقے کو شمالی ساؤتھ ایشیا تو پکارا نہیں جا سکتا)۔ اس علاقے کا منظر نامہ ہمیں عالی کے دوہوں میں ملتا ہے۔

فارسی شاعری میں باغ مہکتا ہے خشک علاقوں میں Formal gardens اور نہریں خاص

طور پر بنائی جاتی تھیں فردوس کا تخیل بھی قدیم زرتشتی ایرانی تہذیب کی دین ہے وہی گلستاں، قالین اور موزیک کی گل کاری اور گل بلبل، بہار وخزاں، صحرا اور غزال کے stylised شعر کی موزیک میں منتقل ہوا۔ ترکستان اور مغل قومیں باغ گویا اپنے ساتھ لے آئیں Formal Garden ہند قدیم میں نہیں تھے۔ ٹروپیکل نباتاتی افراط اور پانی، دریا، ندی، نالے، بارش کی فراوانی کی وجہ سے بن، اُپ بن اس ملک کی خصوصیت تھے اور ان کی Poetic imagery میں، اور فضا بھی زیادہ بے ساختہ، نیچرل اور Earthly تھی۔ کلاسیکل اور لوک دونوں طرح کی ادبیات میں کیلے کے پتے، آم، کرم، مور، پپیہے، چکور، کوئل، راج ہنس کے علاوہ ہاتھ، کوے، مینڈک اور جھینگر بھی موجود ہیں۔ بہار ایران میں اہم ہے۔ یہاں بسنت کے علاوہ برکھارت، چشمے کے بجائے کنواں، امیر خسرو سے لے کر آج تک پنگھٹ کی رونق برقرار ہے۔

سولھویں صدی میں کرشن بھگتی کے فروغ کی وجہ برج کی Pastoral Myth کا بول بالا ہوا۔ کرشن بھگتی نے بنگال، بہار، گجرات، راجستھان کی شاعری، رقص، موسیقی اور ناٹک یعنی ادب اور تمام Performing Arts کو بہت دور رس انداز میں متاثر کیا۔ Arts اور شاعر، گوری، گوپی، گگری، پنگھٹ، بنسی، ڈگر اور جمناتٹ، میور پنکھ وغیرہ راس لیلا کی تمثیل اور اس کا بھگتی رس، شرنگار رس میں بھی تبدیل ہوا۔ معرفتی نغموں کے علاوہ آگے چل کر اس نے ٹھمری، دادرے، کتھک ناچ اور رہس کے روپ دھارے، اودھ کے صوفی شعرا نے گوکل کی امیجری اسلامی تصوف کی اصطلاحات کے طور پر اپنے کلام میں پیش کی جو انھوں نے اودھی زبان میں لکھا۔ یہی کرشن لیلا مغل راج پوت پہاڑی مصوری کا ایک محبوب موضوع رہی۔ اکثر تصاویر میں سری کرشن اور رادھے سمیت گوکل کے تمام کردار مغلیہ لباس میں نظر آتے ہیں۔

بن یا خوب صورت ٹروپیکل جنگل اس شاعری اور اس فضا کا ایک اہم جزو ہے۔ کرشن جی کے القاب بن مالی اور بن راج بھی ہیں۔ بے حد گھنی لتائیں، رنگ برنگے پھول، پیچیدہ شاخوں والے قدیم درخت، کنول اور تالاب، راج ہنس اور طوطے ان کے مدھوبن کے ڈیکور ہیں۔

یہی بن راج شادی بیاہ کے گیتوں میں بن راجپر بنڑا اور بنا بن گئے۔ الفاظ، اصطلاحات اور

ان سے منسوب تصورات، امیج اور کیفیات اس طرح بدلتی جاتی تھیں۔ بن، گوری، سانوریا اور پنگھٹ کی یہ امیجری مذہبی کے علاوہ رومینٹک اور سیکولر بھی ہوگئی۔ کنہیا کے بجائے مغل راج پوت فیوڈل دور کی یادگار "عالی جاہ بیگی" ہمیں راجستھان کے لوک گیتوں میں مل جاتے ہیں۔ دیہات کی تصویر ہمیں صوفیائے کرام کے دوہوں میں ملتی ہے جو انھوں نے Proto Urdu میں لکھے۔ علاوہ ازیں ہند قدیم کے گاؤں کے بے حد Realistic مناظر سانچی اور کوہ آلوٗ کے دیوار، مندر کے سنگی اور مرمریں تصادم میں نظر آتے ہیں اور ان کا Idealistic versian انیسویں صدی کے نصف آخر کے بنگال اسکول کے Water colour اور عبدالرحمٰن چغتائی کی وہ پینٹنگز جو انھوں نے اسی جاپانی واش تکنیک سے بنائیں اور جو Chughtai Indian Painting کہلاتی ہیں۔ اور سب میں یہ گاؤں کی گوری گگری اٹھائے پنگھٹ سے جارہی ہے۔ مندر وغیرہ اور یہ Decorative کیلنڈر پر منتقل ہوکر نئے مڈل کلاس ہندستان کے ہر گھر میں پہنچ گیا۔ اسی تصور کو فلکشن میں بھی پیش کیا گیا۔

بن اُپ بن کے علاوہ اس شعری کائنات کا دوسرا مرکز پنگھٹ تھا۔ اور جمنا کا کنارا، رادھا، گوپیاں، بانسری، یہ ویشنو بھگتی میں معرفت الٰہی کی اصطلاحات ہیں۔ تصوف نے بھی ان کو اپنایا۔ لہٰذا درگاہوں پر آج تک "بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی" گایا جارہا ہے۔ قوال اگر پورب کا ہے وہ بہوت کٹھن ہے کہے گا۔ ڈگر اور پنگھٹ بہر حال اٹل ہیں۔ آج کے Media Explosion سے بہت قبل پارسی تھیٹر، گراموفون اور سینما نے اپنی انھی موسیقی کے ذریعے گیت عام کیے۔ بالخصوص نوشاد علی نے گزشتہ چند برسوں میں اتر پردیش کی مقبول لوک دھنوں اور گیتوں کو متعارف کیا ہے۔

یہ ایک علاحدہ اور الجھا ہوا اور اب اس سیاست پسند کرم فرمائی کا پولیٹیکل مسئلہ ہے کہ ایک زبان Dialect کب تک رہتی ہے اور ایک باقاعدہ زبان کب بن جاتی ہے۔ میتھلی اور اودھی باقاعدہ اعلیٰ ادب کی مالک زبانیں۔ اور وہ آسان بول چال کی زبان جسے انگریزوں نے، گاندھی جی نے اور آل انڈیا ریڈیو نے ہندستانی پکارا اور جس کی بنیاد کھڑی بولی ہے اس میں عظمت اللہ خان، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری اور آرزو نے گیت لکھے۔ ان کا ذخیرہ الفاظ خاصا محدود تھا۔ ساجن، پریم، آشا، من، جیون پیت، میت، آرتی، کومل، ہردے وغیرہ وغیرہ اور یہ بڑی آسانی سے گائے جاسکتے

تھے۔ چناں چہ حفیظ کے گیتوں کو ملکہ پکھراج کی آواز مل گئی اور آرزو کو نیو تھیٹرز والوں کی۔

مشرقی شاعری سننے سنانے کی چیز بھی ہے۔ مغرب کے برعکس ہمارے ہاں پرنٹنگ پریس بہت دیر میں پہنچا۔ ہمارا کلچر بنیادی طور پر اسٹیج کلچر ہے۔

کلچر بنیادی طور پر اب تک Speech culture بھی ہے۔ ادب سننے سنانے کی چیز بھی رہا ہے۔ رامائن کی چوپائیاں، اردو داستانیں، پرانوں کی کتھائیں، شاعری، قوالی، اب Electronic media کی فراوانی کی وجہ سے ایک بار پھر ہمارا معاشرہ Audio-visual کلچر کو اپنا رہا ہے اور Printed word کو بھولتا جا رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ سے قطع نظر اسی دور میں ایک نئی Overseas شاعری کلچر پیدا ہوئی ہے۔ جمیل الدین عالی کی مقبولیت نے اردو کی اس ترویج میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ہمارے ہاں عصری تقاضوں کے لحاظ سے آرٹ فارم کے Contact کو جدید اور جدید تر بنانے کا رویہ پیدا ہوا۔ ادب اور مصوری میں ایسے تجربے کامیاب تجربوں میں شامل ہیں۔ گوری، ناری، پنگھٹ وغیرہ کے باوجود آج کی دنیا کے جدید دو ہے ہیں ان میں آورد اور تصنع معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ وژن اس شعری روایت اور امیجری سے بھی مطابقت رکھتے ہیں۔ جس کا ذکر میں نے ذرا تفصیل سے اس مضمون میں کیا ہے۔ میرے نزدیک فراق کی زوپ والی رباعیاں موضوع اور الفاظ کے لحاظ سے رباعی کے Form سے لگا نہیں کھاتیں اور محض ایک ادبی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کا ذخیرہ الفاظ وسیع تر ہے۔ عالی کی اس کامیابی کے لیے ان کو بہت بہت دھنیہ واد۔

(جشن عالی [ابوظہبی] کا افتتاحی خطبہ، 1989)

نوٹ: بقول عالی صاحب اس خطبے کے تین صفحات کھو گئے ہیں۔ محترمہ صاف کرنے کے لیے لے گئی تھیں دوبارہ نہیں لکھے۔ بہر حال یہ تحریر بھی بہت اہم اور تبرک ہے۔ اس جشن کی صدارت جناب احمد ندیم قاسمی نے کی اور افتتاح محترمہ قرۃ العین حیدر نے کیا۔ محترمہ قرۃ العین حیدر ہی نے جشن عالی جدہ 1990 کا افتتاح بھی کیا۔ جدے میں بھی تقریباً وہی خطبہ پڑھا گیا تھا۔ ناشرین: ارمغان عالی

ن م راشد

ن م راشد اردو کے ایک روایت ساز شاعر تو خیر ہیں ہی۔ ایک بہت نفیس انسان بھی ہیں۔ وہ ایک پُر خلوص دوست ہونے کے علاوہ ان لوگوں میں سے ہیں، جنھیں صحیح معنوں میں دانشور کہا جاسکتا ہے۔ دراصل راشد اور فیض دو ایسے نام ہیں، جو اسکول کے زمانے سے سنتے آئے تھے جب ذرا بڑے ہو کر اُن کی نظمیں پڑھیں تو سخت رعب پڑا لیکن چند سال بعد ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ NORMAL SWEET قسم کے لوگ ہیں۔ فیض صاحب کے لیے فیملی فلینک کسی طرح استعمال کی جاسکتی ہے لیکن راشد صاحب چونکہ زیادہ تر امریکہ میں رہے ہیں ان سے ملنے کا موقع ہم NATIVE لوگوں کو بہت زیادہ نہیں ملا۔ پہلی مرتبہ یاد نہیں شاید 1958 میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، مگر ان میں وہ آڑا ترچھا پن نہ آیا جو اکثر نامور شخصیتوں میں اپنی معبودیت کے احساس کی وجہ سے آجاتا ہے اور دوسرے کے لیے خاصا EMBARRASSING ہوتا ہے۔ راشد صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا SENSE OF HUMOUR اور وہ بھی برطانوی قسم کا یعنی موصوف انڈر اسٹیٹمنٹ کے قائل ہیں۔ بہت عرصہ کی بات ہے راشد صاحب ان دنوں عراق میں مقیم تھے، انھوں نے اپنی تازہ نظم اعجاز بٹالوی کو لندن بھیجی تھی اور B.B.C. کے اردو سیکشن میں ہم

سب بیٹھ کے اس کے ایک مصرع پر غور کرتے رہے۔ ''سلیمان سر بہ زانو اور سبا در یاں'' ٹھیک سے یاد نہیں بہر حال کچھ اسی قسم کا مصرع تھا، لیکن اس وقت سے بہت پہلے راشد صاحب مشرقی عاشق کی اساطیری اور پرانی تلمیحات کا بڑا خوب صورت استعمال کر رہے تھے۔ علامت اور تلمیح کے ذریعہ اپنے دور کی معلومات پر تبصرہ، فارسی اور اردو شاعری کی قدیم روایت ہے، لیکن راشد نے جدید ایرانی شاعری سے گہری واقفیت کی بدولت تلمیحوں اور استعاروں کو ایک بڑی انوکھی اور دل آویز زینت بخشی۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں راشد صاحب ایران میں تعینات تھے۔ جب سے ان کی اس ملک سے جان پہچان ہے۔

کئی برس بعد میری ملاقات اتفاق سے ایران میں ہوئی اور بالکل اچانک۔ یہ اکتوبر 1967 کا ذکر ہے۔ شہنشاہ ایران کا جشن بہت شان و شوکت سے منایا گیا تھا۔ میں اسی سلسلے میں ایران گئی ہوئی تھی۔ ایران میں ایک صنعتی نمائش لگی تھی۔ شاہ بانو فرح نے نمائش کا افتتاح کیا تو ایک بہت بڑا ہجوم سفارت خانے کے لوگ وغیرہ وہیں جمع تھے اور سب کے سب ایک طویل جلوس کی صورت میں اعلیٰ حضرت کے پیچھے پیچھے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے، میں پھرتی پھراتی ایک سنسان جگہ پر پہنچ گئی جہاں کسی دفتر کے چند خیمے لگے تھے۔ ایک خاموش روش پر ایک صاحب الگ تھلگ چپ چاپ کھڑے نظر آئے غور سے دیکھا تو ایران میں اجنبی یعنی ن م راشد تھے۔

اخاہ! آپ یہاں کہاں؟ وغیرہ وغیرہ کے بعد بتلایا کہ یو این او کے دفتر اطلاعات کے ڈائرکٹر ہیں اور تہران میں زندگی کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ میاں شکر خوروں کو شکر خوب دیتے ہیں۔ اکتوبر 1970 میں جب میں ایران گئی تو لا=انسان شایع ہو چکی تھی ان نظموں میں ایک فلسفیانہ رنگ اور گمبھیر رچاؤ میں نے پایا اور مخصوص ڈکشن جس میں جدید ایرانی شاعری کی جھلک بھی تھی۔ راشد صاحب کو عموماً REACTIONARY سمجھا جاتا تھا لیکن اس مرتبہ بے حد غیر REACTIONARY معلوم ہوئے۔ موصوف میں مشرقی وضع داری کے جوہر موجود ہیں، مغرب میں قیام کی وجہ سے ایک مخصوص رکھ رکھاؤ اور پالش آ چکا ہے جو سستی مغربیت زدگی سے بالکل علاحدہ ہے۔ ن م راشد کی موجودہ بیگم صاحبہ انگریزی، غالباً نصف اٹالین ہیں اور کافی عرصہ

امریکہ میں رہ چکی ہیں۔ راشد صاحب کا طرز رہائش انگریزی ہے، دماغ مشرقی، قلب غالباً ملی، توازن اور سکیل مغربی۔ راشد صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بے وقوفوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور دوستوں کے لیے بے وقوفی سے پُر ہیں۔

راشد تخلیقی فن کار کے بنیادی VISION اور اس فطری توسیع کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے تازہ ترین مجموعہ کلام ''لا=انسان'' کی چند نظمیں ایران میں، میں نے ان کے ساتھ بیٹھ کر بہ آواز بلند پڑھیں اور یہ نتیجہ نکالا کہ (POETRY IS A CONDITION OF MUSIC) والی بات ان کی نظموں کے سلسلے میں صحیح ہے۔ اس ضمن میں موسیقی کے پس منظر میں آپ ایران و مشرقی عاشق کی رومانٹک نگری اور جدید فارسی ترکیبوں سے آراستہ اردو اشعار کا فطری پہلو ملاحظہ فرمائیے اور تو، کے لفظ کے ساتھ ایک ڈرامائی تکرار

جہاں زار،
نیچے گلی میں
ترے در، کے آگے، یہ میں سوختہ سر

تجھے صبح بازار میں
بوڑھے عطار یوسف
کی دکان پر میں نے دیکھا تو
تیری نگاہوں میں وہ تاب نا کی تھی
میں جس کی حسرت میں
نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں
جہاں زاد، نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں

اے عشق ازل گیر و ابد تاب

میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب

یا "تعارف" سے

اجل، ان سے مل
کہ یہ سادہ دل
نہ اہلِ صلوٰۃ اور نہ اہلِ شراب،
نہ اہلِ ادب اور نہ اہلِ حساب، نہ اہلِ کتاب
نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشیں
نہ اہلِ خلا اور نہ اہلِ زمیں
فقط بے یقین
اجل ان سے مت کر حجاب

اور سنیے! "سال گرہ کی رات"

ابھی سرحد سے میں لوٹا ہوں ابھی،
میں ابھی ہانپ رہا ہوں، مجھے دم لینے دو
راز وہ اُن کی نگاہوں میں نظر آ رہا ہے
جو ہمہ گیر تھا نادیدہ زمانے کی طرح!
یاد کی آگ بہت اُٹھی ہے
سب تمناؤں کے شہروں میں بھک اُٹھی ہے
آج دروازے کھلے رہنے دو
شاید اس رات، ہمارے شہید آ جائیں!

میں نے دریا کے کنارے انھیں دیکھا ہے
میں نے جس آن میں دیکھا ہے انھیں
شاید اس رات
شاید اس شام ہی دروازے پر دستک دیں گے؟

ن م راشد میں نے سنا ہے United Nation کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور اٹلی میں مستقل طور پر رہتے ہیں۔ معلوم نہیں آئندہ ان سے ملاقات برازیل یا میکسیکو میں ہو۔ آج کل کچھ پتہ نہیں کون کہاں پایا جائے گا؟

اس دَور سے، اس دَور کے سوکھے ہوئے دریاؤں سے،
پھیلے ہوئے صحراؤں سے اور شہروں کے ویرانوں سے
ویرانہ گردی سے میں حزیں اور اُداس
اے عشق ازل گیرہ ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب!

(ہفتہ وار "ہماری زبان" دہلی، یکم دسمبر 1977، ص 2-1)

ادب اور خواتین

قدیم یونان کی شاعرہ سافو سے لے کر آج کے فرانس کی اکیس سالہ ناول نگار فرانسو ساگاں تک ہر زمانے اور ہر ملک میں خواتین کے زورِ قلم نے پڑھنے والوں کو متاثر کیا ہے۔ ادب اپنے عہد کے معاشرتی سیاسی اور معاشی حالات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی ملک و قوم کے سارے تاریخی ارتقا، اس کے فلسفے اور نظریہ کائنات اور روحانی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کی بنیادوں پر وہاں کی ادبیات کی تخلیق کی جاتی ہے۔ کلاسیکل یونان کے رزمیے، مشرق قریب، شمالی افریقہ اور یورپ کی مسیحی خانقاہوں کے راہبوں کی لکھی ہوئی قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کی کتابیں، اسکینڈینویا، جرمنی اور آئرلینڈ کے اینگلو سیکسن ادب، کیلٹک طویل قصے، جنوبی فرانس کے کوچہ گرد شعرا کی نظمیں، اندلس کے عربی قصیدے یہ سب اپنے اپنے عہد کے عکاس رہ چکے ہیں۔ مغرب اور مشرق کے پچھلے چند ہزار سال کے ادبیات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کس طرح دنیا کے ان مختلف خطوں میں مختلف نسلوں اور قوموں اور مذہبوں میں بٹے ہوئے مردوں اور عورتوں نے اپنے اپنے ماحول کی نمائندگی لکھے ہوئے الفاظ کے ذریعے کی۔ جی ہاں، مردوں اور عورتوں نے۔ حضرت عیسےٰ کے ظہور سے پندرہ سال پہلے چین میں خواتین بید مجنوں کے ایسے نرم و نازک

اشعار لکھ رہی تھیں۔ رگ وید کی کتابیں آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال ادھر شمالی ہند میں تصنیف کی گئی تھی۔ رگ وید حمدیں خواتین کی کہی ہوئی ہیں۔ گوتم بدھ کی راہبات نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً چار سو سال قبل، مگدھ اور اتر پردیش کی خانقاہوں اور جنگلوں میں اپنے لافانی نغمے تصنیف کیے۔ اور ان شاعرات کے نام آج تک تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

چندر گپت موریہ کے زمانے سے لے کر گپتا شہنشاہوں کے عہد تک یعنی چوتھی صدی قبل مسیح سے آٹھویں صدی عیسوی تک ہند قدیم کا تہذیب وتمدن اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ سنسکرت ڈرامے کی ہیروئن کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کے کلاسیکل عہد کے معاشرے میں عورت کا کتنا اونچا مرتبہ تھا۔ اور اس کی روزمرہ کی زندگی میں لکھنے پڑھنے کا کتنا چرچا تھا۔ اس کے بعد راجپوت دور میں یعنی مسلمانوں کی آمد سے قبل تک جبکہ بہادری اور آن پر جان دینا اس عہد کا سب سے بڑا وصف بن چکا تھا کالی داس کی نرم و نازک لڑکی کی جگہ عورت نے بہادر راجپوت شہزادی کا روپ دھارا جو ہنستے کھیلتے آگ میں کود جاتی تھی۔ اس وقت ادب علما اور تمثیل نگاروں کے حجروں سے نکل کر بھاٹوں کے مقبول عام اشعار اور رزم ناموں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہندو تہذیب اپنے نقطہ کمال تک پہنچ کر اب تیزی سے انحطاط اور انتشار کی طرف جا رہی تھی۔ ایسے میں مسلمان ملک میں داخل ہوئے۔

وہ ایک ایسی سمت سے آئے تھے جہاں کا ماحول اور جہاں کی سماجی اقدار اس ملک سے یک سر مختلف تھیں۔ مغربی ایشیا کی ان اقوام نے صرف پانچ سو سال قبل محمد عربی کا سکھایا ہوا دین قبول کیا تھا۔ اس دین نے دنیا کو ایک نئے انوکھے نظریے سے روشناس کیا..... عورتیں بھی مردوں کی طرح ذی ہوش، آزاد، خوددار انسان ہیں۔ وہ مردوں سے کمتر نہیں۔ طلوع اسلام کی اولین صدیوں میں مسلمان عورتوں نے بھی مدینہ میں دمشق میں اور بغداد میں اور قاہرہ میں، اور غرناطہ میں علم وادب کے چراغ جلائے۔ اور ان سے قبل، اور ان کے بعد اسکندریہ اور ایشیائے کوچک اور بازنطیم اور لبنان اور جنیوا میں کیتھولک معرفت پسندی نے جس خوبصورت ادب کو جنم دیا اس میں راہبات کا بھی خاصہ حصہ تھا۔

لیکن قرون وسطیٰ کے مغرب میں ادب کلیسا اور خانقاہ ہی میں مقید رہا۔ ریفرمیشن سے پہلے یورپ کے مردوں ہی میں جہالت عام تھی اور جو عورت نسبتاً ذرا کم جاہل ہوتی تھی اسے جادوگرنی سمجھ کر فوراً جلتی آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔

اٹھارھویں صدی فرانس کے راستے ہم گویا عہد جدید میں داخل ہوتے ہیں۔ اس دوران میں کہ مغرب میں بہت کچھ ہو گیا۔ جن دھاروں پر زندگی اب تک بہتی آ رہی تھی ان دھاراؤں نے یک سر اپنا رخ بدل لیا۔ قرون وسطیٰ کی تاریکی کے بادل چھٹے۔ مذہبی اصلاحات، نئے فلسفے، عقلیت پرستی کی تحریک، نشاۃ ثانیہ کی چہل پہل، علوم کی تجدید، کلیسا کے اقتدار کا خاتمہ، قومی مملکتوں کا نیا تصور اور سب کے بعد انقلاب فرانس اور انگلستان کی صنعتی کایا پلٹ۔ بڑھتی ہوئی دولت اور علم کے ساتھ طرز معاشرت میں نئے نئے طور طریقوں کا اضافہ ہوا۔ پرانے توہمات کو برطرف کیا گیا۔ اٹھارھویں صدی فرانس میں ادبی محفلوں کو خاص اہمیت حاصل ہوئی تھیں۔ اب نظریات بدل رہے تھے۔ دنیا کی سرحدیں دور دور تک پھیلتی جا رہی تھیں۔ مغرب کی دور افتادہ نو آبادی بن چکی تھی۔ اس وقت سارا وقت سارا مشرق اہل مغرب کے لیے زبردست اسرار میں ملفوف تھا۔ مقدس سلطنت روس، دولت عثمانیہ، مغلوں کا ہندستان، شاہ ہنشاہوں کا چین اور جاپان اور شام اور ایران.....اس مشرق کو الف لیلےٰ کا دیس سمجھا جاتا تھا۔ جہاں کی عورتیں جھروکوں کے پیچھے رہتی تھیں اور سمرقند اور بخارا اور قاہرہ کی گلیوں میں کنیزوں کی حیثیت سے فروخت کی جاتی تھیں۔

مگر یورپ میں بھی عورتوں کی تعلیم ابھی بہت ہی غیر معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل میں انگلستان کی امیر زادیاں محض فیشن ایبل بال بنانے، اور ڈرائنگ روم کی سازشیں کرنے میں وقت گذارتیں۔ اس زمانے کے ڈرامہ نگاروں نے اپنی تمثیلوں کے ذریعے ہم عصر سوسائٹی پر بے حد دلچسپ طنزیں کی ہیں۔ اسی زمانے میں پہلی مرتبہ چند پڑھی لکھی بیبیوں نے ایک محفل بنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ گپ بازی اور تیری میری برائی کے بجائے خواتین علمی اور ادبی گفتگو کرنے کی عادت بھی ڈالیں۔ اس محفل کا نام ''بلو اسٹوکنگ حلقہ'' پڑ گیا۔

مسز ویزی نے جو اس حلقے کی بانی تھیں اپنے ایک دوست کو مدعو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

اس میں تکلف کے کپڑے پہن کر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے نیلے موزے پہنے ہی چلے آؤ۔ اس روز سے آج تک انگریزی زبان میں بلواسٹوکنگ کی اصطلاح موجود ہے اور Feminist خواتین کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس محفل میں شامل ہونے والی خواتین نے شکسپیئر اور والیٹر وغیرہ پر کتابیں لکھیں اور اس طرح انگریز عورتوں میں تصنیف و تالیف کا چرچا شروع ہوا۔ اس کے بعد سے تو انگریزی ناول میں خواتین کا زبردست عمل دخل رہا اور آج تک ہے۔ جین آسٹن سے لے کر ورجینیا وولف تک بے شمار خواتین نے بلند پایہ ناول انگریزی زبان میں لکھے۔ ناولوں کے علاوہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں یورپ کی فیشن ایبل بیگمات، مشہور نواب زادیاں جب بوڑھی ہو جاتیں تو اپنے Memoirs اور سفرنامے اور روزنامچے اور سوانح حیات قلم بند کرتیں۔ جن کی ادبی حیثیت کچھ نہ ہو مگر ان سے اس زمانے کے حالات پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

فینی برنی (1752ء۔ 1840ء) کو لارڈ میکالے نے انگریزی زبان کی پہلی ناولسٹ خاتون کہا تھا۔ ان کے بعد جین آسٹن (1775ء۔ 1817ء) کا لازوال نام ہمارے سامنے آتا ہے، جو اُردو کی بہت سی ناول نگار خواتین کی روحانی اماں حوا ہیں۔ جین آسٹن کے بعد تو انگلستان میں خواتین ناولسٹوں کی فوج کی فوج پیدا ہو گئی۔ جن میں ایمیلی اور شارلٹ برونٹے اور جارج ایلیٹ کے نام سب سے آگے ہیں۔

اُنیسویں صدی میں وکٹورین اقدار کا دور دورہ تھا۔ لیکن صنعتی اور معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے بہت سے نئے دھارے بہنے شروع ہو گئے تھے۔ ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر نفاست اور شائستگی سے سوسائٹی کی گفتگو کرنے والی معزز خاتون کے علاوہ لنکا شائر کے کارخانوں کی مزدور نی بھی تو عورت ہی تھی۔ اب لکھنے والے سوشل اور پولیٹکل ریفارمر عورتوں کے مسئلے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی اقتصادی آزادی طلاق اور جائیداد اور وراثت کے قوانین، کلیسا کا سخت گیر رویہ، عورتوں کی حمایت میں ناروے کے ڈراما نگار ابسن اور ان کے بعد ان کے چیلے جارج برنارڈ شا نے قلم اٹھایا۔ دنیا اب بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ انیسویں صدی کے آخری سال تھے۔ وکٹوریہ کا انگلستان بہت مستحکم تھا۔ لیکن اب اس کی مضبوط فصیلوں میں بھی رخنے پڑنا شروع ہو گئے

تھے۔ بیسویں صدی کے ساتھ ساتھ برطانوی عورتوں نے سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے باضابطہ اور منظم تحریک بڑے جنگ جویانہ انداز سے شروع کردی۔

سماجی طور پر مغربی عورتیں مشرق کی عورتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ آزاد تھیں۔ ایک تو ان کے یہاں پردے کے تصور شروع ہی سے ناپید تھے (سوا ہسپانیہ کے جہاں عربوں کی حکومت اور مذہب نیست و نابود ہونے کے باوجود ان کے بہت سے رسم و رواج باقی رہ گئے تھے۔ اور رہائشی مکانوں میں مشرقی صحن کی چہار دیواری اور مٹیلا یا سیاہ نقاب آج تک موجود ہے) انیسویں صدی میں اقوام مغرب کے سیاسی عروج اور اقتدار نے ان کی عورتوں کی حیثیت کو بھی متاثر کیا۔ وہ آزاد، ابھرتے ہوئے، ترقی پذیر امپریلسٹ ممالک کی عورتیں تھیں۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، اٹلی بلجیم ان سب ممالک کی ایشیائی اور افریقی نو آبادیاں اب ان کے قدموں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ دنیا ان کے لیے بے حد وسیع تھی۔ وہ سات سمندر پار کے سفر اکیلے کرتی تھیں۔ ان کے لیے یونیورسٹیاں اور کالج قائم ہو چکے تھے۔ مشنری کی حیثیت سے وہ چین اور جاپان کے دور افتادہ گاؤں اور افریقہ اور ہندستان اور جنوبی مشرقی ایشیا کے تاریک ترین جنگلوں میں محض اپنی ہمت اور ارادے اور تعلیم کے بل بوتے پر اسکول اور ہسپتال قائم کر رہی تھیں۔ انیسویں صدی کی امریکن عورت تو اپنی یورپین بہن کے مقابلے میں اور بھی زیادہ نڈر اور حریت پسند تھی۔ لیکن اس ساری آزادی اور روشن خیالی کے باوجود وکٹورین عہد کی مغربی عورت ہمیں آج اس فاصلے سے بے حد قدامت پرست اور تقریباً پردہ نشیں معلوم ہوتی ہے۔ (مغرب کا جب یہ حال تھا تو تصور کیجیے اس وقت ہندستان کا کیا عالم رہا ہوگا!!)

لیکن پہلی جنگ عظیم نے بالآخر مغربی خواتین کی دنیا یکسر بدل دی۔ اب ان کو وہ آزادی بھی میسر آگئی جس کے لیے وہ جد و جہد کر رہی تھی۔ انھوں نے اپنے لمبے چوڑے گھیر دار سائے اور لمبے بال ایام جہالت اور دور غلامی سمجھ کر ترک کر دیے۔ جنگ کے زمانے میں عورتیں فوجی یونیفارم پہن کر مردوں کے دوش بدوش ساری جنگی مصروفیات میں منہمک ہوگئیں۔ وکٹورین عہد کے شدید ردعمل کے طور پر اب انھوں نے مردوں کی طرح بال ترشوانے شروع کر دیے۔ سایوں

کی جگہ اونچے فراک نے لے لی۔ عورتوں کے لیے اب ہوائی جہاز اڑانا روزمرہ کا مشغلہ بن گیا۔ مغربی عورتوں کو مکمل آزادی حاصل کیے اب تقریباً چالیس سال ہو گئے ہیں انقلاب نے وہاں بھی عورتوں کا سیاسی اور سماجی درجہ بے حد بلند کر دیا اور اسے مکمل اقتصادی برابری عطا کی۔ مگر ہم یہاں اس وقت انقلاب روس اور روسی اور وسط ایشیا کی مسلمان سوویت عورت کا ذکر نہیں کریں گے ورنہ یہ بحث چھڑ جائے گی کہ تاریخی حقائق کی روشنی میں سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام دونوں میں سے کس نے عورت کو زیادہ عزت بخشی ہے اور کون ماؤں، متوسط طبقے کی بیویوں، اور فیکٹری میں کام کرنے والی مزدورنیوں کے لیے زیادہ بابرکت ثابت ہوا ہے۔ ہم شروع سے سرمایہ دار مغرب کے ساتھ ہیں اور وہاں کی ہر سیاسی سماجی تبدیلی ہم کو متاثر کرتی ہے۔ ہماری گاڑی بہت فاصلے پر ان کے ہی پیچھے پیچھے چلتی آ رہی ہے۔ لہٰذا میں اس مضمون میں محض مغربی اور مشرقی ممالک کا ذکر کر رہی ہوں۔ اس مضمون کے شروع میں ہم خواتین مشرق کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندستان میں راجپوت دور کے اختتام اور مسلمانوں کی آمد کے زمانے تک پہنچے تھے۔ مسلمانوں کی آمد سے اس برصغیر میں تہذیب و تمدن کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔ ان مسلمان اقوام کی (جو عربستان اور وسط اور مغربی ایشیا سے یہاں پہنچیں) اپنی مخصوص اور منفرد روایات تھیں اور عبرانی، عجمی، بازنطینی اور عرب تہذیبوں نے مل جل کر ان کے ذہنی پس منظر کی تشکیل کی تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر شعر و شاعری اور زبان دانی کے دیوانے تھے۔ سولھویں صدی کے شروع ہندستان کا مغل دور شروع ہوا اور اس کے ساتھ ہی ہم گویا ازمنہ وسطیٰ کے تقریباً افسانوی دھندلکوں سے نکل کر دفعتاً عہد جدید کی تیز روشنی میں آ جاتے ہیں۔ یہ زمانہ لگ بھگ یورپ کے ریفرمیشن اور انگلستان کے ایلزبتھن زمانے کا ہم عصر ہے۔ مغل شہزادیوں کی ادب نوازی سے ہم سب واقف ہیں۔ لہٰذا گل بدن بیگم یا شہزادی زیب النسا مخفی، یا شہزادی جہاں آرا، کا تذکرہ کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ مگر یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ جب ہم اپنے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں اس وقت ہمارے سامنے صرف ایک طبقہ ہوتا ہے۔ جس تک تاریخی کتابوں کے ذریعے ہماری پہنچ ہے۔ وہ ملک کا حکمراں طبقہ ہے۔ شاہی محلات جہاں مغل بیگمات عالموں سے بحثیں کرتی تھیں اور چنار کے درختوں کے نیچے

ٹہلتے ہوئے مشقِ سخن میں مصروف رہتی تھیں۔ ملک کی عام آبادی کے متعلق ہمیں واقفیت نہیں کہ پیش تر ہندو اور مسلمان عورتیں کس حالت میں تھیں۔ اسی طرح مغرب میں علم و تہذیب صرف اونچے طبقے کی میراث تھی اور محض اکا دکا شہزادیاں ہی پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ (مثال کے طور پر انگلستان کی لیڈی جین گرے۔)

لیکن جب چودھویں پندرھویں سولھویں صدی کا ہم بالتفصیل مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھگتی اور صوفی تحریک کے زیر اثر برصغیر کے گاؤں گاؤں اور بستی بستی علم اور ادب کے دیے جل اٹھے تھے۔ بنگال راجستھان، وادی گنگ و جمن، مہاراشٹر، جنوبی ہند، ہر خطے میں عام مرد اور عورتیں، کبیر داس اور دیا پتی ٹھاکر، چنڈی داس، بھگت چیتن، خواجہ معین الدین چشتیؒ، امیر خسروؒ، حضرت محبوب الٰہی، خواجہ گیسو دراز وغیرہم کی تعلیمات سے متاثر ہو کر معرفت کے نغمے الاپ رہے تھے۔ اس زمانے کی مشہور شاعرہ شہزادی سیرابائی کے بھجن آج تک برصغیر میں اسی طرح مقبول ہیں۔

معرفت کے نغموں کے علاوہ ہماری فوک کلچر یعنی عوامی تہذیب میں لوک گیتوں کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ اور یہ لوک گیت عورتوں ہی نے بنائے۔ شادی بیاہ کے گیت، لوریاں، ساون کے گانے، ان گیتوں اور روپ کتھاؤں یعنی پرانے قصے کہانیوں کو دیہات کی مسلمان عورتوں ہی نے صدیوں زندہ رکھا۔ یہ دیہاتی، سیدھی سیدھی، ان پڑھ عورتوں کا ادب تھا۔ جسے اب فوک لٹریچر کی حیثیت سے گویا تحقیق کیا گیا ہے۔ ہمارے شہروں میں بھی کہارنیوں، دھوبنوں، نائنوں، میراسنوں، سقنوں، مالنوں سبھی کے اپنے اپنے گیت تھے۔ جو دیہاتی عورتوں کے چکی کے گیتوں کے علاوہ برج کے علاقے کی زبان اور اودھی اور پوربی میں کہے گئے۔ اور آج تک گائے جاتے تھے۔ تقریبوں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر جہاں چند عورتیں مل بیٹھیں فوراً ڈھولک نکالی جاتی اور لہک لہک کر یہ گیت شروع کر دیے جاتے۔ ان گیتوں کا خاص ماحول تھا۔ ساس نندوں، جٹھانیوں دیورانیوں اور بھاوجوں کے طعنے اور نوک جھونک، بھیا کا لاڈ، میکے کی یاد، سسرال کے دکھ سکھ۔ ہر گھریلو تقریب کے لیے الگ الگ گانے موجود تھے۔ اور یہ سب کچھ ہماری تہذیب میں آج سے

صرف دس بارہ برس پہلے تک شامل تھا۔ لیکن اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ محض تذکرے کے طور پر ان کا بیان مضامین اور کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ آج کل ہماری محفلوں میں ساون کے گیتوں کے بجائے روک اینڈ رول کے ریکارڈ بجتے ہیں یا جہاں اتنی امریکنیت ابھی نہیں چھائی ہے وہاں تا منگیشکر کے نغمے دہرائے جاتے ہیں۔ آج کی فیشن ایبل پارٹیوں میں شامل ہونے والی کتنی بیگمات ایسی ہیں جو ریڈیو پروگرام پر انگریزی نغمے سننے کے بجائے میراسنوں سے ''بریلی کے بازار میں جھمکا گرارے'' سن کر واقعی محظوظ ہوتی ہیں۔

بہر حال یہ ایک تہذیب تھی جس کی اب صرف نوحہ گری کرنا باقی رہ گئی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، مغل ہندستان میں شہزادیوں نے تذکرے اور کتابیں لکھیں اور صاحب دیوان ہوئیں۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں انتشار پھیلا۔ پھر ہندستان میں مغربی اقوام کی آمد نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ نئی زبان، نئے الفاظ و اصطلاحات اور نئے طور طریقوں سے اس ملک کے باشندے روشناس ہوئے۔ اس زمانے میں ہندستان تیزی سے انحطاط کی طرف بڑھ رہا تھا اور اسی انحطاط اور لوٹ کھسوٹ کے بل بوتے پر انگلستان دولت اور صنعتی ترقی حاصل کرنے میں مصروف تھا۔

ہندستان کے زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کی تہذیب حد سے زیادہ مصنوعی ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کا چرچا گلی گلی تھا۔ اس دور نے ان گنت شاعرات پیدا کیں۔ بیگمات، شہزادیاں، گھروں میں بیٹھنے والی پردے دار بیبیاں، اور وہ بدقسمت طبقہ جو ''ارباب نشاط'' کہلاتا تھا۔ اردو کے پرانے تذکرے ان خواتین کے ناموں کی طویل فہرستوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال غلط ہے کہ نئی تعلیم اور برطانوی تسلط سے پہلے ہندستان کی مسلمان عورت جاہل مطلق تھی۔

لیکن اس زمانے کی معاشرت کے متعلق جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہمیں اس کو بے حد رومانی انداز میں پیش کرنا چاہیے۔ ہمارا ماضی سارا کا سارا بے حد خوش گوار نہ تھا۔ ورنہ 1857 عیسوی کے بعد ہمارے مصلحین کو مسلمان عورتوں کی حالت پر خون کے آنسو نہ رونا پڑتا۔ انیسویں صدی کے شروع میں ڈچ، فرانسیسی اور انگریز مشنریوں نے ملک میں اسکول کھولے اور

اعلیٰ پیمانے پر تبلیغ شروع کی۔ اور اس طرح ہندستانی لڑکیاں پہلی بار مغربی طرز کے اسکولوں میں داخل ہوئیں۔ لیکن یہ لڑکیاں زیادہ تر پست اقوام کی تھیں جن کو مبلغین نے عیسائی کیا تھا۔

اسی زمانے میں راجہ رام موہن رائے نے کلکتے میں برہمو سماج قائم کیا۔ اور اس طرح بنگالی ہندو خواتین میں انگریزی تعلیم کا چرچا 1857 عیسوی سے بہت قبل شروع ہو گیا۔ اور 1857 عیسوی کے بعد تو بنگالی خواتین انگریزی میں تصنیف و تالیف بھی شروع کر چکی تھیں۔

تو رو لتا دت ان ہی میں سے ایک لڑکی تھی جس نے مقتدر برطانوی نقادوں سے خراج تحسین حاصل کیا اور جس نے 1877 عیسوی میں صرف اکیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

1857 عیسوی کے بعد ہندستان ایک زبردست معاشرتی انقلاب سے دوچار ہوا۔ ساری مشرقی اقدار کی کایا پلٹ چکی تھی اور اب انگریزی تعلیم کا بول بالا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندستانی عیسائیوں کے علاوہ صرف دو فرقے اور تھے جن کی خواتین پردہ چھوڑ کر باہر آ چکی تھیں، بنگال کی برہمو اور بمبئی کی پارسی خواتین۔ اسی زمانے میں خواتین نے لکھنا بھی شروع کیا۔ ان دنوں کلکتے کے سہروردی خاندان اور بمبئی کے طیب جی گھرانے کی طرح مسلمانوں کے صرف چند گنے چنے خاندان تھے جن کی خواتین نے اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کی۔ سنتی دیوی مہارانی کوچ بہار اور کورنیلیا سہراب جی کی انگریزی تصانیف کے ذریعے وکٹورین ہندستان کا بڑا دلچسپ نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔

انیسویں صدی کا نصف آخر مسلمانوں کے لیے بڑا زبردست عبوری عہد تھا۔ ہر طرف اصلاحات کے جہاد کیے جا رہے تھے مسلمانوں کو سرسید احمد مل چکے تھے لیکن ابھی قوم یہی طے نہیں کر پائی تھی کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے انسان بے دین ہو جاتا ہے یا نہیں اس وقت بھلا بے چاری عورتوں کی طرف کون توجہ کرتا۔

علامہ راشد الخیری اس صدی کے عظیم ترین مصلحین قوم میں سے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی کو طبقہ اناث کے دکھوں کا اندازہ ہو چکا تھا۔ علامہ راشد الخیری نے اپنی ساری زندگی ان کی ترجمانی کے لیے وقف کر دی۔ 1898 عیسوی میں لاہور سے ''تہذیب نسواں'' کا اجرا ہو چکا

تھا۔اسی زمانے میں مولوی محبوب عالم کا ''شریف بی بی'' بھی نکلنا شروع ہوا۔اس طرح عورتوں کے جرنلزم کی بنیاد پڑی۔1908 عیسوی میں رسالہ ''عصمت'' جاری ہوا۔

''عصمت'' ہماری ملک کی سماجی تاریخ میں ایک بے حد اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ زنانہ صحافت کا مؤثر اور زبردست انسٹی ٹیوشن ''عصمت'' اور ''تہذیب نسواں'' جیسے رسالوں ہی کا مرہون منت ہے۔

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ شدید تعلیمی پس ماندگی کے باوجود ان رسالوں نے آج سے نصف صدی قبل لکھنے والیوں کی کتنی بڑی جماعت پیدا کر دی تھی۔ یہ بیبیاں علامہ راشد الخیری کے خیالات کے زیر اثر رواداری، شرافت نفس، مذہب اور اخلاق، اور احساس توازن کے ضابطوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ معاشرت کی اصلاح کی خواہاں تھیں۔

خاندان، اور خصوصاً مشترکہ خاندان ہمارے معاشرے کی بنیاد ہے۔اس سے متعلق تمام مسائل پر قلم اٹھایا گیا۔ ہر متوسط گھرانے میں ''عصمت'' ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔اب عورتوں کو Defensive ہونے یعنی معذرت خواہی کے انداز کی ضرورت نہ تھی۔ ترکی کی خالدہ ادیب خانم اور ہندستان کی سروجنی نائیڈو اعلیٰ درجہ کی اہل قلم کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ (سروجنی دیوی 1879 عیسوی میں پیدا ہوئیں۔1895 عیسوی میں انھوں نے انگلستان جا کر کیمبرج یونیورسیٹی کے گرٹن کالج میں تعلیم حاصل کی اور ان کی انگریزی نظموں نے مغرب کے ذہن ودل کی ایک نئی دنیا سے متعارف کرایا) مسلمان خواتین بھی اب پردے کی قیود کے باوجود آگے بڑھ رہی تھیں۔ز۔خ۔ش مرحومہ کی نظموں سے ان کے سلجھے ہوئے سیاسی شعور کا پتہ چلتا ہے۔پہلی جنگ عظیم کے بعد قوم پرستی اور آزادی کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بچے گلی گلی گاتے پھرتے تھے بولیں اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔!! اس زمانے میں زنانہ لٹریچر نے بھی خوب ترقی کی۔اب ان گنت رسالے ملک میں نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ ان دنوں ناول بھی معاشرتی انداز کے لکھے جا رہے تھے۔ جیسا میں نے کہیں اوپر لکھا ہے، ہماری ناولسٹ خواتین جین آسٹن کی روحانی بیٹیاں تھیں کیونکہ ہمارا معاشرہ اس وقت اس دور

سے گذر رہا تھا جس دور سے انگلستان کی سوسائٹی سو، سوا سو سال قبل گذر چکی تھی۔

Feminist تحریک مغرب میں اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ اب اس کا ذکر صرف سماجی تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اور ان ''مجاہد'' خواتین کا آج کل خوش دلی سے مذاق اڑایا جاتا ہے۔ وہ محاذ کب کے جیتے جا چکے۔ مگر اس کے برعکس ابھی ہمارے یہاں یہی نہیں ہو پایا کہ عورت کی زندگی کا صحیح مصرف کیا ہے۔ ''گھر'' اور ''باہر'' میں کتنا تناسب ہونا چاہیے۔ قدامت پسندی اور جدت پردہ اور بے پردگی کی رسہ کشی آج بھی اسی طرح اسی زور شور سے جاری ہے جیسے آج سے نصف صدی قبل تھی۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد اور بہت سے مصائب کا مقابلہ کرنا تھا۔ مگر جب قوم کی ''تعمیر نو'' کے بلیو پرنٹ بننے لگے تو پھر یہ مسائل سامنے آئے..... پردہ یا بے پردگی۔ اعلیٰ تعلیم مخلوط تعلیم، معاشی آزادی وغیرہ وغیرہ۔ علما کا طبقہ ناخوش تھا کہ پاکستانی عورت حد سے زیادہ مغرب زدہ ہوتی جا رہی ہے۔ نئی پاکستانی عورت کا کہنا تھا کہ واہ دنیا کہیں سے کہیں نکل گئی آپ وہی پرانی گھسی پٹی بحثیں لیے بیٹھے ہیں۔ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو میانہ روی اور توازن کا خواہاں تھا۔ پچھلے دس سال سے جو نظریاتی انتشار ملک میں موجود ہے عورتوں کا مسئلہ بھی اسی زد میں آتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق کی لڑائی تو نصف صدی سے لڑی جا رہی ہے اور بہت سے مواقع پر جیتی بھی گئی ہے۔ کیونکہ ایسا تو نہیں ہے کہ 47 عیسوی کے فوراً بعد پلک جھپکتے میں اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانی عورتوں کی یہ فوج پیدا ہو گئی۔ پچھلے پچاس سال میں مسلمان قوم کے بڑے آدمیوں علامہ راشد الخیری، جسٹس کرامت حسین، شیخ عبداللہ نے عورتوں کے لیے جدوجہد کی ہے ان کے ہاتھ میں قلم تھمایا ان کے لیے اسکول اور کالج اور مدرسے کھولے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ عورتوں کے مسائل حل کرنے کا صحیح طریقہ کار کیا ہے؟ کیا یہ مسائل نیویارک اور ڈبلن اور نیپلز کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں تقریریں کرنے سے یا پریس کو لمبے چوڑے بیان دے کر یا انگریزی میں فیشن میگزین نکال کر حل ہو جائیں گے؟ ہماری عورتوں کے بڑے طبقے کے لیے نیویارک اور جنیوا کی کانفرنسوں میں پاس کیے جانے والے ریزولیوشن بالکل بے معنی، قطعی بے کار ہیں۔ ہماری

عورتوں کا بڑا طبقہ جو متوسط الحال، اور مفلوک الحال ہے۔ نیم خواندہ یا جاہل ہے پردے والے گھروں اور نیم تاریک محلوں اور مہاجر بستیوں میں اور قصبوں اور گاؤں میں رہتا ہے یہ طبقہ کس طرح سوچتا ہے۔ کیا سوچتا ہے؟ ان عورتوں کا فلسفہ ان کا نظریہ کائنات ان کا زندگی کے متعلق رویہ کیا ہے؟ ان کے خیالات کی عکاسی کس نے کی ہے؟ ان کا نظریہ کائنات یہ ہے:

خاندان، کنبہ، ساس بہو، جھگڑے مزید بیماریاں مزید محنت، چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور بڑے بڑے الم۔ ان کی زندگی کے متعلق رویہ یہ ہے..... انھیں نہیں معلوم اردو میں 35 عیسوی میں ایک نئی ادبی تحریک شروع ہوئی جو نئے سماجی رشتوں کے احساس اور نئے تاریخی شعور پر مبنی تھی اس تحریک کے اراکین نے اس طبقے کی عکاسی کی۔ مگر اس وقت وہ مخصوص ادبی تحریک خارج از بحث ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ زنانہ صحافت کے میدان میں اس طبقے کی نمائندگی کس خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ پردے میں بیٹھنے والی جن بیبیوں نے ڈاکٹر رشید جہاں اور عصمت چغتائی سے تیس پینتیس سال قبل سماجی مسائل پر قلم اٹھایا وہ یقیناً قابل تکریم ہیں۔ ان کو جین آسٹن اور ایڈتھ سٹ ویل اور ورجینا وولف کی خبر نہ تھی مگر یہ بڑی لگن سے خالص اپنی طرز میں اپنا ادب تخلیق کرتی رہیں۔ جو یقیناً افادی ادب تھا۔ ''عصمت'' بھی کسی ایک طبقے کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے سارے معاشرے کا نقاد اور ترجمان رہا ہے۔ اس رسالہ کو شایع ہوتے ہوئے پچاس سال پورے ہو گئے۔ گو زمانہ بدل گیا۔ اقدار، حالات، ماحول، ذہنی پس منظر، ہر چیز تبدیل ہو گئی مگر یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ ''عصمت'' نے سماجی ارتقا میں اپنا رول پورا کیا اور یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ آج کے پرانے ادارے پرانے تمدن کے مظاہر، پرانی تہذیب کی نشانیاں، ایک ایک کر کے مٹتی جا رہی یا بھلائی جا رہی ہیں، اس پر آشوب اور عبوری دور میں ''عصمت'' نے اپنی روایات قائم رکھیں اور زندہ ہے۔

(ماہنامہ 'عصمت' کراچی، پچاس سالہ جوبلی نمبر، جولائی 1958،
پلاٹینم جوبلی نمبر 'عصمت'، جولائی 1983 میں دوبارہ شائع ہوا)

'بیا تا گل برافشانیم' (مرتبہ)

میں ادب میں 'لیڈیز کمپارٹمنٹ' اور 'صرف عورتوں اور بچوں کے لیے' کی قسم کی تخصیص کی ہمیشہ سے مخالف ہوں۔ لیکن اس غزل نمبر میں ایک 'زنانہ ڈبہ' شامل ہے کیونکہ بیش تر تذکروں میں پرانی شاعرات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یا ان کے اِکا دُکا شعر شامل کیے جاتے ہیں۔ یا ان کا کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔ اس بے اعتنائی کی بڑی وجہ ہماری سماجی اقدار تھیں۔ خواتین کی ادبی کاوشوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھیں۔ ان کے نام تک کا پردہ لازمی تھا اور شاعری بھی عموماً رقص و موسیقی کی طرح محض طوائفوں کا فن تھا۔ ہمارے ہاں ارباب نشاط کو وہی تمدنی حیثیت حاصل تھی جو فیوڈل جاپان میں ماہر فن گیشاؤں اور اٹھارھویں صدی فرانس میں Courtesans کی تھی۔ لیکن اٹھارھویں صدی سے آج تک پردہ نشین عورتیں، مغل شہزادیاں، نوابوں کی بیگمات اور متوسط طبقے کی گرہستنیں اردو اور فارسی میں مروجہ انداز کی روایتی غزلیں کہتی رہی ہیں جن میں سے بعض قابل توجہ ہیں۔

متعدد مشہور اشعار ان شاعرات کے ہیں جن کے ناموں سے لوگ واقف نہیں۔ مولانا عبدالباری آسی کا 'تذکرہ الخواتین' میرے ذخیرہ کتب میں موجود ہے، مطبع نولکشور لکھنؤ سے شایع

ہوا تھا۔ اس میں 1927 تک کی دو سو اُردو اور بانوے فارسی شاعرات کے کلام کے نمونے شامل ہیں۔ ان دو سو اُردو شاعرات میں چھیاسی طوائفیں تھیں۔ عہد رفتہ کی خواتین کے حالات مولانا آسی نے چند قدیم تذکروں سے اخذ کیے ہیں لیکن وہ زیادہ تر ناکافی ہیں۔ مثلاً جینا بیگم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ 'جہاندار شاہ بہادر ولی عہد بادشاہ دہلی کی خاص محل تھیں اور مصنف چمن انداز کا بیان ہے کہ مرزا رفیع سودا کی شاگرد تھیں۔'' جہاندار شاہ کون سے بادشاہ کے ولی عہد تھے؟ ایک جہاندار شاہ دلی کے تخت پر سال بھر کے لیے بیٹھے۔ اور 1713 میں مارے گئے۔ اگر جینا بیگم ان کی خاص محل تھیں تو مرزا رفیع سودا کی شاگرد نہیں ہو سکتیں کیونکہ 1705 میں سودا پیدا ہوئے۔

جناب کالی داس گپتا رضا فرماتے ہیں: جینا بیگم کے شوہر جہاندار شاہ اور مغل بادشاہ جہاندار شاہ (معزول 1713) دو الگ شخصیتیں تھیں۔ شہزادہ جہاندار شاہ محمد شاہ رنگیلے کے پوتے اور احمد شاہ (مغل بادشاہ 1748-1754) کے بیٹے تھے۔ مرزا جواں بخت بہادر کہلاتے تھے اور خود بھی شاعر تھے۔ سودا نے تقریباً 45 برس کی عمر میں دلی چھوڑی، اس طرح وہ جینا بیگم کے اُستاد ہو سکتے ہیں مگر پرانے تذکروں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف ماہ درخشاں اور چمن انداز میں اس کا ذکر ہے جو بعد کی کتابیں ہیں۔

مولانا آسی نے اپنی کتاب میں چندا اور مہ لقا دو الگ الگ شاعرات بتائی ہیں۔ حالانکہ مہ لقا بائی چندا اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ کا پورا نام تھا۔ وہ راجہ چندو لال شاداں کی سرکار میں ملازم اور بشیر محمد خاں ایماں کی شاگرد تھیں۔ 1806 میں راجہ چندو لال عہدۂ پیش کاری دولت آصفیہ پر ممتاز ہوئے۔ یہی چندا کے عروج کا زمانہ تھا۔

ایک اور قابل توجہ گروہ انگریز نژاد اور ارمنی خواتین کا ہے۔ مولانا آسی کے تذکرے میں ایک بسم اللہ بیگم کا ذکر ہے جن کی ماں 'ولایت زا' تھیں اور وہ خود شی انعام اللہ خاں یقین، شاگرد مرزا جانِ جاناں مظہر سے اصلاح لیتی تھیں لیکن بیش تر اینگلو انڈین خواتین کا تذکرہ رام بابو سکسینہ کی کتاب میں موجود ہے۔ ان خواتین کی مائیں یا باپ انگریز تھے اور ان کی انگریزوں سے شادیاں ہوئی تھیں۔ مثال کے طور پر آگرے کی اینگلو انڈین جمیت جو ایک انگریز فوجی میجر آرجسٹن کی بیوی

تھیں اور غزلوں کے علاوہ ٹھمری، دادرے، ہولیاں وغیرہ بھی تصنیف کرتی تھیں۔ مس فلورا میری سارکس کی طرح ان کا تذکرہ مولانا آسی نے بھی کیا ہے۔ یہ اردو داں انگریز، یوریشین اور اینگلو انڈین سماج ایسٹ انڈیا کمپنی کے 'نبابوں' کے دور میں پیدا ہوا تھا۔ انگریز پلانٹرز اور فوجی سرداروں کے زمانے میں پروان چڑھا اور اواخر انیسویں صدی تک پہنچ کر ختم ہو گیا۔

ارمنی سوداگر سترھویں صدی سے ڈھاکہ، کلکتہ، مدراس میں آباد تھے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ ذہین اور طباع قوم تھی اور اگر آپ ارمنی کے ساتھ ساتھ یہودی بھی ہوں تو سونے پر سہاگہ سمجھیے۔ اپنے زمانے کی نامور گانے والیاں ملکہ جان عفت زبان گوہر جان، سیرہ اور صالحہ وغیرہ کلکتہ کی ارمنی یہودی تھیں۔ اور اینگلو انڈین شاعرات کی طرح ایک رچی ہوئی اردو تہذیب کی پروردہ۔ میرے پاس گوہر کی ایک نایاب تصویر موجود ہے جو مجھے انگلستان سے ایک سردار صاحب نے بھیجی تھی جو ہندستانی کلاسیکل موسیقی پر کتاب لکھ رہے تھے۔ وہ تصویر 'غزل نمبر' میں شایع کی جا رہی ہے۔ بیسویں صدی میں ز.خ.ش. جیسی غیر معمولی شاعرہ کے علاوہ بلقیس جمال بریلوی، رابعہ پنہاں، آمنہ عفت، کنیز فاطمہ حیا، صفیہ شمیم ملیح آبادی اور درجنوں شاعرات پیدا ہوئیں۔

آج کی اردو شاعری ان خواتین کے دور سے بہت آگے نکل آئی ہے اور شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ وزاہدہ زیدی، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، زہرہ نگاہ، ادا جعفری، پروین شاکر اور عزیز بانو وفا ایک مختلف ذہنی کائنات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس وقت ہند و پاکستان میں جتنی خواتین شعر کہہ رہی ہیں ان سب کا کلام دستیاب ہونا ممکن نہیں اور یہ انتخاب کسی طرح مکمل نہیں کہا جا سکتا مگر کم از کم ہر دور کی نمائندہ شاعرات کے چند منتخب اشعار ان اوراق میں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر

پردہ نشین بیگمات (اٹھارھویں-انیسویں صدی)

جینا بیگم

بنت بابر مرزا۔ جہاں دار شاہ بہادر ولی عہد احمد شاہ بادشاہ دہلی (1748-1754) کی

خاص محل اور مرزا رفیع سودا کی شاگرد تھیں۔

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے

بسم اللہ بیگم دہلوی

ان کی والدہ ولایت زا تھیں۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئیں۔ منشی انعام اللہ خاں یقین شاگرد مرزا جان جاناں مظہر (1699-1781) سے اصلاح لیتی تھیں۔

تیری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے
گھے مضطر ہے دل گاہے طپاں ہے

o

نہ کیجیے ناز حسنِ عارضی پر
نہ سمجھو یہ بہار بے خزاں ہے

گنّا بیگم شوخ

اہلیہ نواب عماد الملک غازی الدین خان بہادر نظام وزیر عالمگیر ثانی (وسط اٹھارویں صدی) میر قمر الدین منت سے اصلاحِ سخن لیتی تھیں اور اکثر غزلیں فی البدیہہ کہتی تھیں۔

شب کو میاں طلب میں تری ہم بھٹک بھٹک
جوں حلقہ در پہ رہ گئے سر کو پٹک پٹک
میری بھی مشت خاک کا کچھ پایہ ہے ضرور
اے جامہ زیب جائیو دامن جھٹک جھٹک

o

ابر چھایا ہے مینھ برستا ہے
جلد آ جا کہ جی ترستا ہے

o

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کسی کی
اس طرح نہ لگیو میرے اللہ کسی کی

پارسا

اپنے وقت کے مشہور شاعر (اور غالباً نواب آصف الدولہ کے عزیز) نواب مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ کی بیٹی تھیں۔

تن صورتِ حباب بنا اور بگڑ گیا
یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا
چلتا نہیں ہے ابلق ایام ایک چال
اکثر یہ بد رکاب بنا اور بگڑ گیا

دُلہن بیگم

نواب انتظام الدولہ کی حبیبہ اور نواب آصف الدولہ بہادر حکمرانِ اودھ کی ایک بیگم کا تخلص تھا۔

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا
ندی کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

○

جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں
مثالِ لالہ کے دلِ داغ دار رکھتے ہیں

○

ایسے کم ظرف نہیں ہیں جو بہکتے جائیں
گل کے مانند جدھر جائیں مہکتے جائیں

○

مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیر فلک
خانۂ دل جو گرا ہو اسے آباد کرو

O

دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

نواب زیب حور بیگم

یکے از بیگمات جان عالم واجد علی شاہ۔

ممکن نہیں جو کوچۂ جاناں میں رہ سکے
میرے غبار سے ہے صبا کو غبار کیا
گیسو کی آرزو بھی عارض کا اشتیاق
دیکھیں دکھائے گردش لیل و نہار کیا

یاسمن

سید انشاءاللہ خاں انشا کی جواں مرگ کنیز چنبیلی کا تخلص تھا۔

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

O

سُرما کھلوایا خموشی نے مجھے
جب وہ منظورِ نظر یاد آیا

نواب عشرق محل عشرت

حرم عالیہ واجد علی شاہ مرحوم شاہِ اودھ۔ بادشاہ کے ساتھ کلکتہ جلاوطن ہوئی تھیں۔

گرمیِ عشق مانع نشو و نما ہوئی
وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

نواب صدر محل صدر

آخری فرماں روائے اودھ واجد علی شاہ اختر کی ایک بیگم اور صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔

میں نے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جب اُدھر
منھ کو پھرا کے یار نے مجھ سے کہا الگ الگ

o

شمع جلائے آئے ہیں آج وہ میری قبر پر
چلیو خدا کے واسطے باد صبا الگ الگ

o

ہجر میں خوب خاک اُڑی اُن کو ہوا نہ کچھ اثر
نالے گئے الگ الگ آہ رسا الگ الگ

o

حسرت و آرزوئے وصل درد و مصیبت فراق
سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ

o

صدرؔ وہ کم نصیب ہوں ہجر میں گر اٹھاؤں ہاتھ
باب قبول سے رہے میری دعا الگ الگ

شمس النسا بیگم شرم

بنت حکیم قمر الدین خاں۔ والد خواجہ وزیر کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں رہتی تھیں۔

پہلے ثابت کریں اس وحشی کی تقصیریں دو
کیوں مرے پاؤں میں پہناتے ہیں زنجیریں دو

o

کہا قاصد نے کہ لایاں ہوں میں پیغام وصال
آج خلعت مجھے پہناؤ کہ جاگیریں دو
یا بہانہ سے بلائیں اسے یا خط ہی لکھیں
شرم کیا خوب یہ سوجھیں ہمیں تدبیریں دو

نواب اختر محل اختر

خاندان تیموریہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اواخر انیسویں صدی تک زندہ تھیں۔

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا
اُن کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
اِک آہِ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا
لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

○

آستاں پر ترے پیشانی کو گھستے
سَر ہی غائب ہوا جس میں کہ ترا سودا تھا

○

خط لے کے نامہ بر سے جو ٹکڑے اڑا دیے
غیروں نے آج ان تئیں کچھ پڑھا دیا
تقصیر یار کی نہ قصور عدو ہے کچھ
اختر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

ہزھائی نص نواب شاھجھاں بیگم شیریں

فارسی میں شاہجہاں تخلص فرماتی تھیں۔ پہلا اردو دیوان آج سے ایک سو چھ سال قبل مکتبہ نظامی کانپور سے شایع ہوا تھا۔

کافر کیا مجھ کو تری اس زلف نے کافر
اس لام نے کھویا تیرے اسلام ہمارا

o

شیشہ خانہ میں آئینہ عذار آئے نظر
چشم مشتاق کو حیرت کی بہار آئے نظر

o

نیند میں زلف تیری دیکھی زہے میرے نصیب
گنج تعبیر ہے گر خواب میں مار آئے نظر

ضیائی بیگم ضیا

لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم انور علی صاحب کی اہلیہ تھیں۔

میں ہوں وہ ننگِ خلق کہتی ہے مجھ کو خاک
اس کو بنا کے کیوں میری مٹی خراب کی

گوہر بیگم

ایک کابلی رسالدار کی لڑکی، لدھیانہ میں رہتی تھی۔

امتحان وفا تو ہووے گا
تم بھی ہو اور یار ہم بھی ہیں
درد کہتا ہے مجھ سے غربت میں
تم نہ گھبراؤ یار ہم بھی ہیں

سید النسا حرماں

مولانا فضل حق خیر آبادی کی صاحبزادی۔ حرماں تخلص کرتی تھیں۔ بڑی عالمہ اور فقیہ تھیں۔ علم وفن میں دست گاہ رکھتی تھیں۔ فن شعر وعروض پر گہرا عبور تھا۔ اپنے بیٹے مضطر خیر آبادی کے کلام پر اصلاح دیا کرتی تھیں۔ چنانچہ ان کی رہنمائی میں گیارہ برس کی عمر میں ہی مضطر خیر آبادی

نے ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع درج ذیل ہے:

ڈھونڈھتے ہم کیوں دوائے دردِ دل
تم اگر ہوتے بجائے دردِ دل

نمونۂ کلام حرماں:

دردِ دل، دردِ جگر، کاوشِ دل، کاہشِ جاں
اتنے آزار ہیں اور ایک کلیجا میرا

o

خانۂ یار کا کیا تم کو پتہ بتلاؤں
جیسا مشتاق ہو، نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

ارباب نشاط (اٹھارھویں، انیسویں، اوائل بیسویں صدی)

زینت جان دھلوی

نازک تخلص کرتی تھیں۔ زمانہ غالباً اٹھارھویں صدی۔

موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے
وہ وہم و گماں سے بھی حقیقت میں پرے ہے

o

ہے نالہ و زاری کا مرے شور فلک تک
پردہ بت مغرور کوئی کان دھرے ہے

o

غش میں مجھے کل دیکھ کے وہ ڈر کے یہ بولا
بس ہوش میں آ، کیوں مجھے بدنام کرے ہے

مہ لقا بائی چندا

دکن کی مشہور طوائف اور ریختہ کی سب سے پہلی صاحب دیوان شاعرہ۔ دولت و

حشمت، عزت و رفعت میں اپنے ہم عصر رؤسا سے بڑھی ہوئی تھی۔ پانچ سو سپاہی اور برقنداز اس کی ڈیوڑھی پر مستعد رہتے تھے۔ فنونِ موسیقی، شہسواری اور تیر اندازی میں نظیر نہ رکھتی تھی۔ ورزش کرتی تھی اور پہلوانی کا دم بھرتی تھی۔ شعرائے وقت اس کی مدح و ثنا کرتے تھے۔ 1799 میں چندا نے اپنا دیوان جنرل میلکم کو پیش کیا تھا۔

اخلاق سے تو اپنے واقف جہان ہے گا
پر آپ کو غلط کچھ اب تک گمان ہے گا

مہر جان حشمت

پہاڑ گنج، دہلی کی طوائف۔ غدر سے پہلے زندہ تھیں۔

لامکاں تک جا چکی ہے بارہا آہِ رسا
پھاندنا مشکل نہیں کچھ آپ کی دیوار کا

نزاکت

نارنول کی طوائف جو دلی میں رہتی تھی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اس کے قدرداں تھے۔

بسکہ رہتا ہے یار آنکھوں میں
ہے نظر بے قرار آنکھوں میں

o

محفلِ گل رخاں میں وہ گل رو
لے گیا دل ہزار آنکھوں میں

o

سرمہ خاک پا عنایت ہو
آ گیا ہے غبار آنکھوں میں

حسین باندی شباب

بنارس کی مغنیہ تھیں۔

قسمت بد دیکھیے، پوچھا جو اس نے حال دل
باندھ کے ہاتھوں کو میں نے کہہ دیا کچھ بھی نہیں

ہینگن جان اچپل

اپنے زمانے کی مشہور گائیکہ۔

آپ سے بات بھی کرے کوئی
یہ بھلا کیا مجال ہے صاحب

o

جان کوئی خوشی سے دیتا ہے
کیا نرالا سوال ہے صاحب

o

خاک سے ٹک اٹھایئے اس کو
دل مرا پائمال ہے صاحب

کمن طوائف

بھرت پور کے بازار کی ایک بھنگیڑن۔ ریختی کے انداز میں شعر کہتی تھی۔

آہ میں ہوتی اگر حضرت شبیر کے ساتھ
مارتی شمر موئے کو کسی تدبیر کے ساتھ

حسینی جان مخمور

بنارس کی مشہور طوائف اور مقبول شاعرہ۔

کہا یہ دے کے جنازے کو یار نے کاندھا
سفر ہے دور کا یارو قدم بڑھائے ہوئے
قرار و صبر و حواس و دل و جگر چھوٹے
تمھارے عشق میں اپنے جو تھے پرائے ہوئے

شہید ہم ہیں ہمیں احتیاج غسل نہیں
کسی کی تیغ کے پانی سے ہیں نہائے ہوئے

مشتری

لکھنؤ کی مشہور و معروف صاحب دیوان شاعرہ اور مغنیہ۔ اصل وطن خیر آباد ضلع سیتاپور، چوک لکھنؤ میں رہتی تھی۔

غفلت میں ہم ان کو دیکھتے ہیں
ہے خواب بھی کچھ خیال بھی ہے
باتیں تو وہ کرتے ہیں خوشی کی
چہرے سے عیاں ملال بھی ہے

مراؤ جان زہرہ

چوک لکھنؤ کی مغنیہ۔ کلام اکثر اودھ اخبار میں چھپتا تھا۔

حیا سے نہیں وہ جو آنے کے قابل
تو ہم خوف سے کب ہیں جانے کے قابل
کرو خون سے میرے تم ہاتھ رنگین
یہ مہندی ہے صاحب لگانے کے قابل
مفصل کہوں ماجرا حاسدوں کا
جو ہوں جمع سارے زمانے کے قابل

o

تو نے ہر ایک کی سنیں باتیں
میرا مطلب بھی کچھ بھلا سمجھا
میں نے واللہ دی دعا تجھ کو
تو خدا جانے دل میں کیا سمجھا

بدگماں تجھ سے یار ہے زہرہ
شکر کو تیرے وہ گلا سمجھا

o

کیا روز قیامت میں زبان اپنی میں کھولوں
بگڑی ہوئی باتوں کو بنایا نہیں جاتا

منی زہرہ

کشمیری طوائف۔ کلکتہ میں رہتی تھی۔ مولوی عبدالغفور نساخ کی شاگرد۔

درد و غم فراق سے شب کو ہوئی جو بے کلی
دل کی کشش کشاں کشاں اس کی گلی میں چلی
ہجر میں تیرے گل بدن وقفِ الم ہے جان و تن
بستر خار سے فزوں مجھ کو ہے فرشِ مخملی

مُنّا جان ہنر

دربھنگے کی طوائف۔

کیوں نہ چرخ پیر کو کہیے ہے دیوانہ مزاج
ہائے یہ پیرانہ سالی اور طفلانہ مزاج
اک شمار رحمت اپنے واسطے کافی ہے شیخ
کیجیے اتنا نہ لے کر سبحہ صد دانہ مزاج

پکھراج بیگم

ایک باکمال مغنیہ۔ آکرہ مولد اور اٹاوہ مسکن تھا۔

دنیا میں مثل خواب ہماری حیات ہے
کیوں کر خیالِ یار نہ پیش نظر رہے

تاریکیٔ عمل سے کیا گور میں مقام
منزل میں شب ہوئی تو سرا میں اُتر رہے
پکھراج بعد مرگ بھی غم ساتھ لے چلو
بہتر ہے پاس اپنے جو زادِ سفر رہے

ارمنی اور اینگلو انڈین خواتین (انیسویں اوائل بیسویں صدی)

بی سیرا پری (صمن مچن)

پچھلی صدی میں کلکتہ کی ایک یہودی طوائف تھی۔ انگریزی، اردو اور فارسی جانتی تھی۔

آنکھیں ملا کے تیغ زنی کی نہ اس نے ہائے!
محضر پہ قتل کے تھی ہمیں صاد سے غرض
بلبل ہے جانور تو اسے ہو گلوں کی قدر
ہم ہیں پری رکھیں گے پری زاد سے غرض

بی صالحہ معشوق

ساکنہ کلکتہ۔ بی میرا پری کی چھوٹی بہن۔

جو کھینچے تم سے کرو تم اس سے جانا نہ مزاج
ہم فقیروں سے کہیں زیبا ہے شاہانہ مزاج
حضرتِ ناصح سے سیدھی بات بھی کرتا نہیں
اے پری کرتا ہے کتنا تیرا دیوانہ مزاج

o

ہجر میں پہلو کو خالی دیکھ کر حیران ہے
پوچھتا ہے جان سے میرا جگر دل کیا ہوا

ملکہ جان ملکہ

کلکتہ کی مشہور و معروف ارمنی رقاصہ مغنیہ اور شاعرہ۔ دیوان 'مخزنِ الفت ملکہ' 1880 کے

لگ بھگ کلکتہ سے شایع ہوا۔ اس میں 160 غزلوں کے علاوہ اس شاعرہ کی کمپوز کی ہوئی ٹھمریاں، ہولیاں اور دادرے شامل تھے۔ ان کے علاوہ ملکہ کی شان میں بہت لوگوں نے قصیدے لکھے۔ ٹیپو سلطان کے گھرانے کے ایک صاحبزادے پرنس محمد ابراہیم شاہ (مقیم کلکتہ) نے بھی ملکہ جان کی مدح سرائی کی۔ وہ قصیدہ بھی اس دیوان میں موجود تھا۔ ملکہ کے استاد حکیم نبو صاحب ہلال (شاگرد داغ) نے تاریخ کہی۔

ہوا جو طبع یہ دیوان میم صاحب
کہا ہلالؔ کے دل نے شگفتہ ہو کے کمال
دلوں پہ وجد کی حالت نہ ہووے کیوں طاری
کمالِ نغمہ ملکہ ہے اس کے طبع کا حال

ملکہ جان کی کہی ہوئی تاریخ کے دو اشعار:

میں نے استاد سے اجازت لی
حکم نافذ ہوا کہ ہاں کہیے
اس کی تاریخ ہے قیامت کی
سخن فتنہ جہاں کہیے

نمونۂ کلام:

آپ ہی آپ یوں جو روتی ہو
ملکہ سچ کہو کیا یاد آیا

o

دیکھا جو شوخ نے ملکہ کا بندھا ہے رنگ
محفل میں چھین لی غزل اس نے بڑھا کے ہاتھ

o

جب ان سے یہ کہتا ہوں مری جاں نہیں ملتے
کس ناز سے یہ کہتے ہیں ہاں ہاں نہیں ملتے

گوہر جان گوہر

ملکہ جان کی بیٹی اور کلکتہ کی مشہور و معروف ہفت زبان مغنیہ اور شاعرہ تھیں۔ ماں کے دیوان (جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے) کی تاریخ کے چند اشعار:

کہہ کے ملکہ نے جو چھپوایا یہ دلچسپ کلام
لب حاسد پہ بھی ہے سوز ترنم لاریب
فکر تاریخ کی جب ہو نہ سکے گی گوہر
رنگ لائے گی بہت موج تبسم لاریب

بادشاہ بیگم خضی (مس بلیک)

ان کے والد مسٹر بلیک انگریز تھے۔ والدہ ہندستانی جن کا نام چھوٹی بیگم تھا۔ مس بلیک فارسی اور انگریزی بھی روانی سے لکھتی تھیں۔ پختہ گو شاعرہ تھیں اور دوسروں کے کلام پر اصلاح بھی دیا کرتی تھیں۔

خود شوق اسیری سے پھنسے دام میں صیاد
شرمندہ ترے ایک بھی دانے کے نہیں ہیں

مس ڈنیر

کانپور کی ایک اینگلو انڈین شاعرہ تھیں۔

میری آنکھوں کے راستے دل میں وہ لائے ہیں تشریف
یہ ہے نقش قدم ان کے نہیں ہیں پتلیاں میری!

ایلن کرسٹینا گارڈنر (عرف رقیہ سلطانہ بیگم)

آگرے کی مشہور اردو داں اینگلو انڈین گارڈنر فیملی سے تعلق رکھتی تھیں اور ڈینیل ساکر پٹیز گارڈنر شکر کی بہن تھیں۔ ان کے پردادا جیمز گارڈنر اور پردادی شہزادی قمر چہرہ شہنشاہ شاہ

عالم کے فرزند شہزادہ سلیمان شکوہ کی متہنہ بنی تھیں۔ گارڈنر خاندان نے متعدد شاعر پیدا کیے۔ جن میں شکر، پادری بارتھل میو گارڈنر صبر، رابرٹ گارڈنر از بک پیٹرک گارڈنر شوق، ولیم گارڈنر ادریس این این فینیکس گارڈنر فلک وغیرہ قابل ذکر تھے۔

غزل ایلن گارڈنر بر طرح سلیمان گارڈنر

خودی نے مجھ پہ کیا ہے ستم خدا کی قسم
جو بے خودی ہو تو پھر کس کا غم خدا کی قسم
یہ غیب غیب ہے کہتے ہیں لوگ جس کو شہود
شہود ہی ہے عدم کا عدم خدا کی قسم
جو ہونے کا ہے نہ ہونا وہی تو ہے عقبیٰ
نہ ہونے کا ہے نہ ہونا عدم خدا کی قسم

اینی بلا کیر ملکہ

مسٹر بلا کیر سپرنٹنڈنٹ پولس کلکتہ کی لڑکی۔ نسلاً خالص انگریز۔ انگلستان میں پیدا ہوئی بہت حسین تھیں۔ ستار بھی بجاتی تھیں۔ مسلمان ہو گئیں۔

ہو گئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام
میں نے نالہ جو کسی رات سر شام کیا

عصر جدید

ذ. خ. ش.

زاہدہ خاتون شیروانیہ بنت سر محمد مزمل اللہ خاں شیروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ۔ 1894 میں پیدائش ہوئیں۔ شدید پردے کی پابندی کی وجہ سے اپنا اصل نام ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ ایک حیرت انگیز سیاسی شعور کی مالک تھیں اور اپنے عہد کی عالمی سیاست کے متعلق نہایت بلند پایہ نظمیں کہتی تھیں۔ 1922 میں انتقال ہوا۔ ان کا مجموعہ کلام 'فردوس تخیل' 1941 میں دارالاشاعت پنجاب نے شایع کیا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے پچیس سال قبل انھوں نے مندرجہ ذیل غزل کہی تھی۔

کارخانے میں جو بارود کے بم آ کے پھٹا
جل گیا پیکر بے جرم و خطائے مزدور
غلہ ڈھونے سے پسینے میں نہائے سو بار
جب ہو اک پارہ نان روزہ کشائے مزدور
کلۂ برف دسمبر میں ہے سر کے اوپر
فرشِ آتش ہے مئی میں تہ پائے مزدور
خواب گہ بھی ہے وہی، مطبخ و مزبل بھی وہی
دیکھنا کلیہ محروم ضیائے مزدور
طفل کی فکر شکم، زن کا غم عریانی
شب تاریک میں ہیں خواب ربائے مزدور
قرض خواہو! درِ مرحوم کا پیچھا چھوڑو
وارثِ بے دری ہیں ورثائے مزدور
شاید اے مالک سرمایہ نہیں تجھ کو خبر
ناظر و قادر و عادل ہے خدائے مزدور
سخت حیرت ہے مہ و خور ہیں صحیح و سالم
روز گو دیکھتے ہیں صبح و مسائے مزدور
قربِ شہ کا سر ہم چشم کو ہے گر سودا
دلِ نزہت کو بھی ہے فخر دلائے مزدور

بانو طاہرہ سعید

ایرانی نژاد خاتون ہیں جو اپنے شوہر بریگیڈیر سعید کے ساتھ حیدرآباد میں رہتی ہیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں شعر کہتی ہیں۔ طہران ریڈیو کے شعبہ اردو میں کام کر چکی ہیں۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکادی کی ممبر ہیں۔

نہ جانے آج کیوں ان کے لبوں پر میرا نام آیا
یہ کیسا انقلاب آیا سلام آیا، پیام آیا

o

پھول، شبنم، کہکشاں، مہتاب کیا عنواں ہیں کم
بدمذاقی ہے اگر تلوار کی باتیں کریں

صاحبزادی عشرت جہاں عشرت

نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رام پور کی پڑپوتی ہیں۔ نواب سعادت علی خاں (بلسی، ضلع بدایوں) کی بیٹی اور ایاز پیر بھائی کی اہلیہ۔ بمبئی میں رہتی ہیں۔ ان کی چند غزلیں ایچ ایم وی نے گلوکار طلعت محمود اور مکیش کی آواز میں ریکارڈ کی ہیں۔

بڑی امید سے ہم نے سجائی بزم طرب
شعورِ غم تو ملا پر سکونِ جاں نہ ملا

o

خیال کوئی نہ آیا تیرے خیال کے بعد
جمال کوئی نہ دیکھا ترے جمال کے بعد

o

زندگی بھر نہ محبت میں کبھی جیت سکے
دل کی دنیا کے یہ ارمان کسے پیش کروں

صاحبزادی نور جہاں بیگم نصرت

عشرت جہاں بیگم کی ہمشیر، پٹنہ میں سکونت پذیر ہیں۔ پختہ گو روایتی شاعرہ ہیں لیکن اپنا کلام کہیں نہیں چھپوایا۔

روئے ان سے جو ہم گلے مل کے
دل زمانے کے رہ گئے ہل کے

آئینہ سامنے ہے عکس سے ہیں وہ بیزار
دو حسین مائل تکرار نظر آتے ہیں

ھزھائی نس صدرالجہاں بیگم صاحبہ آف مالیر کوٹلہ

(وفات 1957ء)

جو باطن کو عیاں کر دوں تو ظاہر کو نہاں کر دوں
اگر منصور بن جاؤں تو سب حالت بیاں کر دوں

ممتاز مرزا

دہلی کی ایک مقبول شاعرہ ہیں۔ خانہ فرہنگ ایران میں کام کرتی ہیں۔ مجموعہ کلام بعنوان 'یادوں کے سائے' شایع ہو چکا ہے۔

بھولی بسری باتیں چھوڑو، بھولی بسری باتیں کیوں
سارے رشتے ٹوٹ چکے جب درد کی پھر سوغاتیں کیوں

o

حسرتیں دل کی مجسم نہیں ہونے پاتیں
خواب بننے نہیں پاتا کہ بکھر جاتا ہے

ادا جعفری

عزیز جہاں ادا جعفری بدایونی پاکستان کے ایک سویلین افسر کی اہلیہ ہیں عرصے سے لکھ رہی ہیں۔ 'میں ساز ڈھونڈتی رہی'، 'شہر درد'، 'غزالاں تم تو واقف ہو' تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔

دیکھو تو ہر جبیں پہ ہے اک آشنا سی لو
سوچو تو آس پاس کوئی رازداں نہیں

o

کتنی ویران گزرگاہوں سے
سلسلے خواب کے ملتے ہوں گے

صبح زنداں میں بھی ہوتی ہوگی!
پھول مقتل میں بھی کھلتے ہوں گے

o

ویرانیاں دلوں کی بھی کچھ کم نہ تھیں ادا
کیا ڈھونڈنے گئے ہیں مسافر خلاؤں میں

o

چاروں طرف تھی ریت، بہت تیز تھی ہوا
دل میں چھپا لیے ہیں تمھارے نقوش پا

o

یہ کیسا جبر ہے، حد نگاہ بھی تم ہو
نظر اٹھا کے جو دیکھوں نظر نہ آؤ مجھے
گئے دنوں کے حوالے سے تم کو پہچانا
ہم خود سے ملے اور والہانہ ملے

زہرا نگاہ

بدایوں کی رہنے والی ہیں۔ ماجد علی سی ایس پی (حال فنانشل ایڈوائزر سلطان ابوظہبی) سے شادی ہوئی۔ کراچی اور لندن میں قیام رہتا ہے۔

تم نے بات کہہ ڈالی کوئی بھی نہ پہچانا
ہم نے بات سوچی تھی بن گئے ہیں افسانے

o

کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ امنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان آ گئے

فہمیدہ ریاض

کئی سال لندن میں رہ چکی ہیں۔اب کراچی میں قیام پذیر ہیں۔

کیا میرا زیاں ہے، جو مقابل ترے آ جاؤں
یہ امر تو معلوم کہ تو مجھ سے بڑا ہے

o

میں بندہ و ناچار کہ میرا اب نہ ہو پاؤں
اے ظاہر و موجود مرا جسم دعا ہے

o

اے چوبِ خشک صحرا، وہ بادشوق کیا تھی
میری طرح برہنہ جس نے تجھے بنایا

پروین شاکر

آبائی وطن بہار۔1952 میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ سرسید گرلز کالج کراچی میں پڑھاتی ہیں۔شوہر پاکستانی فوج میں کیپٹن ہیں۔مجموعہ کلام 'خوشبو' پچھلے سال شایع ہوا ہے۔

پورا دکھ اور آدھا چاند
ہجر کی شب اور ایسا چاند
دن میں وحشت بہل گئی تھی
رات ہوئی اور نکلا چاند
کس مقتل سے گزرا ہوگا
اتنا سہما سہما چاند
یادوں کی آباد گلی میں
گھوم رہا ہے تنہا چاند

میری کروٹ پر جاگ اٹھے
نیند کا کتنا کچا چاند
میرے منہ کو کس حیرت سے
دیکھ رہا ہے بھولا چاند
اتنے گھنے بادل کے پیچھے
کتنا تنہا ہوگا چاند
آنسو رو کے نور نہائے
دل دریا تن صحرا چاند
برگد کی ایک شاخ ہٹا کر
جانے کس کو جھانکا چاند
ہاتھ ملا کر رخصت ہوگا
اس کی صورت ہجر کا چاند
صحرا صحرا بھٹک رہا ہے
اپنے عشق میں سچا چاند
رات کے شاید ایک بجے ہیں
سوتا ہوگا میرا چاند

o

سناٹا فضا میں بہہ رہا ہے
دکھ اپنے ہوا سے کہہ رہا ہے
برفیلی ہوا میں تن شجر کا
ہونے کا عذاب سہہ رہا ہے

باہر سے نئی سفیدیاں ہیں
اندر سے مکان ڈھہ رہا ہے

o

جنوں پسند ہے دل اور تجھ تک آنے میں
بدن کو ناؤ، لہو کو چناب کر دے گا
میں سچ کہوں گی، مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا، اور لاجواب کر دے گا

واجدہ تبسم

(اہلیہ اشفاق احمد خان) پیدائش 1935 (امراوتی)
اردو کی نہایت مقبول افسانہ نگار۔ 1960 میں ایم اے کیا۔ شاعری حال میں شروع کی ہے۔ مجموعہ کلام 'صبح رخسار' زیر طبع ہے۔

خوشبوؤں کا مری دنیا میں گزر کم کم ہے
زخم دل اور مہک اور مہک اور مہک

حسنیٰ سرود

وطن بنگلور۔ جنوبی ہند کی مشہور شاعرہ ہیں۔ مجموعہ کلام شایع ہو چکا ہے۔

حیراں ہوں تجھے دیکھ کے تو ہے کہ یہ میں ہوں
یہ کس نے مرے ہاتھوں میں آئینہ دیا ہے

ساجدہ زیدی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر ہیں۔ زیادہ تر نظمیں کہتی ہیں۔ مجموعہ کلام شایع ہو چکا ہے۔

یہ دل صحرائے اعظم اور تقدیر
اسے اک بوند سے بہلا رہی ہے

کسی بے نام افسانے کی تمہید
غبار وقت میں بکھری ہوئی ہے

کنیز سکینہ

پشاور کے ایک تاجر غلام سرور خاں صاحب کی سب سے بڑی بیٹی۔ دلیپ کمار (یوسف خان) کی بہن۔ پشاور میں پیدا ہوئیں۔ والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد اپنے چھ بھائیوں اور چھ بہنوں کی سرپرست بنی رہیں۔ فقیرانہ طبیعت پائی تھی۔ ان کا اردو اور فارسی کلام روحانیت اور تصوف کے مضامین پر مشتمل ہے۔ 28 اپریل 1976 کو وفات پائی۔

انداز خرام یار تھا یا نکہت گل کا کارواں
کہ گلستان میں عجب رنگ دل آرائی ہے

o

پوچھتے کیا ہو داغ دل، کیا کوئی چارہ ساز ہو
تم تو ہمارے حال سے آج بھی بے نیاز ہو

o

تو اپنے حسن کے صدقے وہ جام دید تو بخش
متاع زیست فراواں ترے نثار کروں

o

دور آلام کی شوریدہ سری مت پوچھ
میں نے خود کردہ گناہوں کی سزا پائی ہے

o

یہ اضطراب جنوں ہے کہ پھر وہ مل جائے
جو راز دید تھا پنہاں ترے نثار کروں

عزیز بانو وفا

مشہور فارسی شاعر خواجہ عزیز الدین عزیز 1830 میں کشمیر سے لکھنو آئے تھے۔ وفا عزیز لکھنوی کی پڑپوتی ہیں۔ 1949 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ لکھنؤ کے ایک گرلز کالج میں پڑھاتی رہی ہیں۔ مجموعہ کلام آج تک شایع نہیں کروایا۔

تھکن سے چور ہوں لیکن رواں دواں ہوں میں
نئی سحر کے چراغوں کا کارواں ہوں میں
ہوائیں میرے ورق لوٹ لوٹ دیتی ہیں
نہ جانے کتنے زمانوں کی داستاں ہوں میں
کسی سے بھیڑ میں چہرہ بدل گیا ہے مرا
تو سارے آئینہ خانوں سے بدگماں ہوں میں
میں اپنی گونج میں کھویا ہوا ہوں مدت سے
مجھے خبر نہیں کچھ کون ہوں کہاں ہوں میں
خود اپنی دید سے محروم ہے نظر میری
ازل سے صورتِ نظارہ درمیاں ہوں میں
میرا وجود و عدم راز ہے ہمیشہ سے
وہاں وہاں بھی نہیں ہوں جہاں جہاں ہوں میں

o

مجھے تلاش نہ کر نیلگوں خلاؤں میں
میں جو بھی ہوں تیرے احساس بال و پر میں ہوں
مجھے بقدر تجسس سبھی نے ڈھونڈا ہے
یہ حد فکر و نظر میں ہر اک نظر میں ہوں

کہیں بکھیر نہ دے مجھ کو زندگی میری
میں مشت خاک ہوں اور دست بے ہنر میں ہوں
میں اپنے جسم میں رہتا ہوں اس تکلیف سے
کہ جیسے اور کسی دوسرے کے گھر میں ہوں
وہ کون تھا جو صدا دے کے مجھ کو لوٹ گیا
میں جس کا نقش قدم اب بھی اپنے در میں ہوں

o

ہماری بے بسی شہروں کی دیواروں پہ چپکی ہے
ہمیں ڈھونڈے گی کل دنیا پرانے اشتہاروں میں
بہا کے لے گیا سڑکوں سے ایک سیلاب سارے بت
ہمیں باقی بچے ہیں صرف اپنی یادگاروں میں

o

کیا کریں بھاگ کے ہم خود سے جدھر جاتے ہیں
ہر قدم پر کوئی آئینہ پڑا پاتے ہیں
بیٹھ رہتا ہے الگ ہٹ کے ہمارا سایہ
جب بھی لگ کے کسی دیوار سے ستاتے ہیں

o

سنبھالا ہوش جب ہم نے تو کچھ عزیزوں نے
کئی چہرے دیے اور ایک پتھر کی زباں ہم کو
ہم ایسے سورما ہیں لڑ کے جب حالات سے پلٹے
تو بڑھ کے زندگی نے پیش کیں بیساکھیاں ہم کو

ہم اپنے جسم میں بکھرے ہوئے ہیں ریت کی صورت
سمیٹیں گی کہاں تک زندگی کی مٹھیاں ہم کو
بچھڑ کے بھیڑ میں خود سے حواسوں کا یہ عالم تھا
کہ منہ کھولے ہوئے تکتی رہیں پرچھائیاں ہم کو

o

کنارہ ڈوبنے کا دیکھنے کے بعد منظر ہم
مٹا کے شاد ہو لیتے ہیں نقشے سے سمندر ہم
بظاہر شور جب اٹھتا ہے سڑکوں ہی سے اٹھتا ہے
مگر چلا رہے ہوتے ہیں خود اپنے ہی اندر ہم
اندھیروں نے ہمارے سائے لمبے کر دیے اتنے
کہ پہنچیں گے سویرے تک کہیں اپنے برابر ہم
ہمارے اپنے ہی چہرے لگا آتے ہیں مجرم بھی
سزا مارتے رہتے ہیں خود اپنے کو پتھر ہم
بٹھا کے اپنے سائے کرسیوں پر گول کمروں کی
کھسک جاتے ہیں چھپ کر دروازوں سے ہم

o

کسی کو کیا خبر ہم اپنی پیدائش سے گونگے ہیں
ہماری زندگی کٹتی ہے اوروں کی زباں بن کر
کوئی یہ سب کی سب بے حادثہ سڑکوں کو بتلا دے
کہ اب کھلتے ہیں ہم اندر کی جانب کھڑکیاں بن کر
ہم اپنے آپ سے بھاگے ہوئے مفرور قیدی ہیں
کھڑے ہیں راستوں میں ہم جو میلوں کے نشاں بن کر

یہ آپ اپنے تعاقب میں بھاگتا مجمع
اسی ہجوم میں دب کر کچل گئے ہیں ہم

o

زرد چہروں کی کتابیں ہیں کتنی مقبول
ترجمے ان کے جہاں بھر کی زبانوں میں ملے
آج سازوں سے نکلتے ہوئے ڈرتی ہے جو لے
کیا خبر کل وہی قوموں کے ترانوں میں ملے
مڑ کے دیکھا بھی تو ہم میل کے پتھر ٹھہرے
راہ بھولے بھی تو منزل کے نشانوں میں ملے
جتنا ذہنوں میں اندھیرا ہے اب اتنا شاید
صرف تاریخ کے تاریک زمانوں میں ملے

o

سب نے دیکھا اس کو اوروں کی نگاہوں سے سدا
وہ زمانے سے ملا آنکھوں کی چادر اوڑھ کر

o

راستوں کا خوف تھا اس پر ہمیشہ سے سوار
وہ ہمیشہ گھر سے نکلا سایۂ در اوڑھ کر

o

ہم ایسے پیڑ ہیں جو چھاؤں بانٹ کر اپنی
شدید دھوپ میں خود سائے کو ترستے ہیں

o

بھرا تھا اپنا ہی بہروپ خود سے ملنے کو
لگا گیا میری خلوت میں آئینے کوئی

o

رات آتی ہے تو رینگ آتے ہیں اندیشوں کے سانپ
میرے احساس کے ٹوٹے ہوئے دروازوں سے

(یہ انتخاب 'فن اور شخصیت' ممبئی کے غزل نمبر، مدیر: صابر دت میں مارچ 1978 میں شائع ہوا)

ہندستان کی مسلمان عورتیں

ہندستان کی مسلمان عورتوں کے متعلق گفتگو اس وقت تک نہیں کی جاسکتی جب تک کہ ان کی شریعت اور مشرق وسطی کی معاشرتی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ہندستان کے حالات کا جائزہ نہ لیا جائے جس نے ان کی قدروں اور روایات کو سانچے میں ڈھالا ہے۔ ایک طرف مسلم عائلی قانون نے ان کے قانونی حقوق کا تحفظ کر کے ان کو خاندان کے اندر ایک خودمختار حیثیت عطا کی ہے تو دوسری طرف پردے کا رواج ان کی سماجی ترقی میں حائل رہا ہے۔ لہذا تاریخ میں مسلم عورتوں نے کیا کردار ادا کیا ہے اس کا جائزہ لینے سے پہلے کچھ ایسے حقائق کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے جو عموماً اب تک منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ مسلم عائلی قانون نے عورتوں کو بعض ایسے اہم حقوق عطا کیے ہیں جو انھیں دوسرے مذاہب کی عورتوں سے ممیز کرتے ہیں۔ ان حقوق کا حصول یا ان سے محرومی کا انحصار مختلف ملکوں کے مختلف ادوار میں سماجی اور معاشی حالات پر رہا ہے۔ جس وقت پیغمبر اسلام نے اپنا تبلیغی مشن شروع کیا عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج تھا۔ آپ نے عورتوں کو جو عزت اور حیثیت عطا کی اس نے قرون وسطی کے سماج کو بنیادی طور سے بدل دیا۔ عرب مرد ابوسلمہ اور

ابو حفظہ کے باپ کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ کثرت ازدواج اور داشتائیں رکھنے کا رواج اس وقت چین سے افریقہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اسلامی قوانین نے کثرت ازدواج کو محدود کیا اور مشروط بنایا۔ کنیزوں کو آزاد کرنا کارِ ثواب قرار دیا اور ان کی اولاد کو قانونی حقوق دیے گئے۔ غلام والدین کے بچوں نے اکثر سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ حتیٰ کہ چند فرماں روا خاندانوں کی بنیاد ڈالی۔ تاہم غلامی کا خاتمہ نہیں کیا گیا کیونکہ یہ طریقہ اس وقت کے معاشی نظام کا ایک حصہ تھا۔ (غلامی کا رواج امریکہ میں گزشتہ صدی تک رہا اور روس میں بالشویک انقلاب تک موجود تھا۔)

اسلام نے عورتوں کو بعض ایسے اعزازات دیے جو اس وقت (چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی) دنیا میں عورتوں کو کہیں بھی حاصل نہیں تھے اور نہ ہی یہ اعزاز و استحقاق انھیں مغربی ممالک میں 1918 سے پہلے مل سکے۔ مغرب کی عورتوں کو ان میں سے بعض حقوق کافی جدوجہد کے بعد جدید زمانہ ہی میں ملے ہیں۔ مثال کے طور پر دوسرے مذاہب میں شادی ایک مقدس فریضہ اور زندگی بھر کا اٹوٹ رشتہ تصور کیا جاتا تھا۔ قرآن نے شادی کے تصور میں انقلابی تبدیلی لاکر اسے ایک ایسا معاہدہ قرار دیا جس کو فریقین میں سے کوئی بھی توڑ سکتا ہے۔ مغرب میں سول میرج اور طلاق دلانے والی عدالتوں کا قیام تیرہ سو برس کے بعد وجود میں آیا۔ قرآن کے مطابق شادی کے بعد بھی عورت جائداد کی وارث اور مالکہ رہ سکتی ہے اور اپنی قانونی حیثیت اور انفرادیت کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ برطانیہ کے مشہور ماہر قانون لارڈ کوک کے الفاظ میں ''قانون میں مرد اور اس کی بیوی ایک فردِ واحد کی حیثیت رکھتے ہیں اور مرد ہی وہ فردِ واحد ہے۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہے۔''

دوسری بات جو یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ نیا مذہب اسلام، ایشیا، افریقہ، یورپ اور روس کے بہت سے ملکوں میں پھیلا اس وجہ سے مختلف النوع سماجی اور نسلی رسوم و رواج نئے اسلامی معاشرے میں جذب ہو گئے لیکن اسلام کی بنیادی تعلیم اور پیغمبر اسلام کی روایات پر تمام دنیا کے مسلمان سختی سے کاربند رہے وہ سائبیریا کے رہنے والے ہوں یا چین یا اسپین یا یوگوسلاویہ کے۔

تیسری بات یہ کہ حالانکہ اسلامی قانون بنیادی طور سے یکساں تھا لیکن اس کی تاویل و

تشریح پانچ بڑے مکاتب فکر نے کی۔ عورتوں سے متعلق بعض قرآنی احکام کی تاویل اس طرح کی گئی جس سے عورتوں کے مفاد کو ضرب لگی۔ مردوں کی بالادستی Male Chuavinism کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

مختلف ادوار میں عورتوں کی حیثیت سماجی اور سیاسی حالات کو منعکس کرتی رہی ہے۔ قرون وسطی میں جب تک مسلم تہذیب نصف النہار کو پہنچی تھی مسلمان عورتیں میدان جنگ میں بہ طور نرس سپاہی اور کمانڈر کی حیثیت سے جاتی تھیں۔ انھوں نے یونیورسٹیوں میں پڑھایا اور مشہور موسیقار اور شاعرہ بنیں اور ایسی عورتوں کی ایک طویل فہرست پیش کی جاسکتی ہے جنھوں نے معاشرے میں ممتاز مقام حاصل کیا۔

اس دور میں تعلیمی اور سائنسی ترقیوں کے ساتھ ساتھ بعض سماجی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں جنھوں نے عربی، ایرانی اور ہسپانوی مسلم سماج پر دور رس اثرات ڈالے عباسی خلفا نے قدیم ایرانی شہنشاہیت کی شان وشوکت کو اپنایا صحرائی عربوں کی سادگی اور دور اوّلین کے کلاسیکل اسلام کی جگہ شان وشوکت اور عیش وعشرت نے لے لی۔

بین الاقوامی تجارت کی ترقی اور بیرونی منڈیوں کی دستیابی کی وجہ سے نیا متمول طبقہ وجود میں آیا۔ سماج حکمراں طبقے، جنگجو امراء، بڑے کاروباری اور پیشہ ور طبقات (فن کار، قانون داں، ڈاکٹر، استاد) میں بٹ گیا تھا۔ غلامی کو ایک بار پھر فروغ حاصل ہوا اور بازار میں کھلے بندوں عورتوں کی خرید وفروخت ہونے لگی۔

خلیفہ ولید ثانی (آٹھویں صدی عیسوی) کے زمانے میں عرب حکمراں طبقے نے رومی شہنشاہوں جیسی شان وشوکت اور عیش وعشرت کو اپنایا۔ رقاصاؤں اور مقامی اور بیرونی پیشہ ور عورتوں کے طائفے دارالخلافت کا رخ کرنے لگے۔ اس کی وجہ سے عام شہریوں نے اپنی عورتوں کو الگ تھلگ کرنا شروع کیا۔ دل بہلانے والی پیشہ ور عورتوں اور گھریلو عورتوں کے درمیان فرق ظاہر کرنے کے لیے پردہ کے رواج نے جنم لیا۔ خلیفہ ولید ثانی نے حرم رکھنے کا طریقہ شروع کیا اور شاہی محل کے اندر خواجہ سراؤں کو مقرر کرنے کا بازنطینی دستور بھی اپنایا۔ ایران قدیم کے شاہی محلوں

میں بھی عورتوں کو الگ رکھنے کا دستور موجود تھا۔ عہدہ خلافت موروثی بن گیا اور ایران کے شاہی طور طریقے زور شور سے اختیار کیے جانے لگے۔

تاہم روشن خیال حکمرانوں کے دور میں عورتوں کو زیادہ آزادی حاصل رہی۔ اموری اسپین نے بہت سی ایسی ممتاز خواتین پیدا کیں جو غرناطہ، اشبیلہ اور قرطبہ کی درسگاہوں میں اس وقت تعلیم دیتی تھیں جب مسیحی یورپ کا بقیہ حصہ ذہنی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

دور عباسیہ کے بغداد کی عورتیں ادبی مذاکروں اور موسیقی کی مجلسوں کی نہ صرف صدر نشیں ہوتی تھیں بلکہ ان میں سرگرم حصہ لیتی تھیں۔ ماہر قانون خواتین بھی موجود تھیں۔ عباسی شہزادیاں غیر ملکی سفیروں کو باریاب کرتی تھیں، امور مملکت میں بھی حصہ لیتی تھیں اور بغداد کی یونیورسٹی میں عورتیں ادب و تاریخ پر درس دیتی تھیں۔

1258 عیسوی میں تاتاری حملے نے بغداد کو تباہ اور مسلم دنیا کو تاراج کر دیا۔ انسانی تاریخ کے ایک نہایت روشن اور زرین دور کا خاتمہ ہو گیا۔ اسپین میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کا خاتمہ 1492 میں ہوا۔

تاتاریوں نے مفتوحین کا مذہب قبول کیا۔ ان کی عورتوں کو وسطِ ایشیا کے میدانوں میں صحرانوردی کی وجہ سے خاصی آزادی حاصل تھی۔ قبول اسلام کے بعد وسطِ ایشیا کی اس قوم نے متعدد لائق اور قابل عورتوں کو پروان چڑھایا جنھوں نے خواہ مختصر مدت ہی کے لیے سہی ترکستان، ایران اور ہندستان میں حکومت کی۔ 1236 میں رضیہ اپنے باپ سلطان شمس الدین التمش کی وصیت کے مطابق دہلی کے تخت پر بیٹھی۔ اس نے اپنے آپ کو سلطان کہا اور ہندستان پر، سندھ سے بنگال تک حکومت کی رضیہ غیر معمولی طور پر ذہین اور باصلاحیت فرماں روا تھی۔ ایک عورت کے زیر نگیں ہونا اس کے امرا کو نہ بھایا۔ رضیہ دہلی کے نزدیک ایک بغاوت کو فرو کرتے ہوئے ماری گئی۔ سلطان رضیہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئی تھی۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مذہبی اصول، ماحول، نسلی خصوصیات، عمرانی اور سماجی رسوم نے مخلوط النسل مسلم سماج کے معیاروں کا تعین کیا ہے۔ ہندستان کے مسلمان نے جو شمال میں زیادہ تر ترک

،ایرانی اور افغان اور جنوب میں عرب تھے بہت سی مقامی رسومات کو اپنایا تھا۔ حکمران طبقے کا راج پوت اشرافیہ سے میل جول ہونے کی وجہ سے بہت سی راج پوتی رسوم حکمرانوں نے اختیار کیں۔

طلاق اور بیوہ کی شادی قرون وسطی کے ہندو سماج میں ممنوع تھی۔ لہذا خاور میانہ کی عورتیں تو آسانی سے طلاق حاصل کر سکتی تھیں یا بیوہ کا عقد ثانی ایک عام بات تھی لیکن ہندستانی والدین اپنی لڑکی کو نصیحت کرتے تھے کہ اپنے مجازی خدا (شوہر) کے گھر میں پالکی میں بیٹھ کر جاؤ اور وہاں سے صرف جنازہ ہی باہر آئے یہ خوش حال مسلم خاندانوں کے لیے بھی ایک غیر تحریری قانون بن گیا۔ اس زمانے میں خوش حال ہندو گھرانوں نے پردے کو اپنالیا۔

امیر اور متوسط طبقے کے لیے پردہ عزت و شرافت کا نشان بن گیا۔ مسلم کسانوں، دست کاروں اور مزدوروں کی عورتوں نے نہ ہندستان میں پردہ کیا اور نہ مسلم ملکوں میں۔ غریبوں کو عزت و حیثیت کے تمغے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ایسے دور میں جبکہ جہالت عام تھی اعلیٰ تعلیم صرف اونچے طبقے تک محدود تھی۔ مسلم لڑکیوں کی اکثریت کو معمولی مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھیں قرآن پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ آٹھ یا نو سال کی عمر تک مکتبوں میں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھیں۔ اس کے بعد انھیں گھر کی چار دیواری کے اندر بند کر دیا جاتا تھا اور بالغ ہونے کے بعد جلد سے جلد ان کی شادی کر دی جاتی تھی۔ اکثر گھروں میں استانیاں مقرر تھیں۔

خصوصی مراعات اور سہولتیں حاصل ہونے کی وجہ سے شہزادیوں اور امیر زادیوں کو سیاست اور ادب دونوں میں نمایاں حصہ لینے کا موقع ملتا رہا۔ ہمایوں کی بہن گل بدن بیگم نے ہمایوں نامہ، ہمایوں کی سوانح عمری لکھی۔ اکبر اعظم نے اپنی ترک انا ماہم آنگہ کو ہندستان کا شریک وزیر اعظم مقرر کیا مرد مورخ اکبر کے اس دور حکومت کو "پیٹی کوٹ گورنمنٹ" کہتے ہیں نور جہاں نے اپنے شوہر جہانگیر کے شریک حکمراں کی حیثیت سے ہندستان پر راج کیا۔

جن عورتوں نے ملکہ کی حیثیت سے حکمرانی کی یا امور مملکت میں حصہ لیا ان کے کارناموں کو عموماً مرد مورخ "حرام کی عیارانہ سازش" سے تعبیر کرتے ہیں۔ حبہ خاتون جیسی پر

جوش قوم پرست کشمیری شاعرہ جس نے اکبر کی امپریل پالیسیوں سے سرتابی کی اور دکن کی چاند سلطانہ جس نے اکبر کی حملہ آور فوج کے خلاف اپنے ملک کو بچانے کے لیے اپنے لشکر کی کمان سنبھالی انھیں بھی تاریخ کی کتابوں میں ان کے شایان شان جگہ نہیں دی گئی۔

بہت سی مغل شہزادیاں بہترین شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ صوفی تحریک کے فروغ کے زمانے میں مسلم ممالک اور خود ہندستان میں ایسی عارفہ عورتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنے تقدس اور علمیت کی وجہ سے نام حاصل کیا۔ انھوں نے صوفی مردوں سے مذاکرے کیے اور عوام میں تبلیغ کی آج بھی ہندستان کی مسلم صوفی عورتوں کے مزارات پر ہندو اور مسلمان عقیدت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

ممتاز شخصیتیں اپنے دور کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اٹھارویں صدی کے پرآشوب دور میں چند خواتین نے فوجی معرکہ آرائیوں یا محل کی سیاست میں عمل دخل کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔

زوال پذیر جاگیردارانہ دور میں عورتیں سامان انبساط اور ذریعہ تفریح ہوتی تھیں اور جب اپنی اداؤں سے عیش پرست بادشاہوں کو اپنے بس میں کر لیتی تھی تبھی انھیں کوئی بااثر مقام حاصل ہوتا تھا۔ فرانس کی شائستہ طوائفیں اور داشتائیں، جاپان کی گیشائیں، ہندستان کی نرتکی یا طوائفیں سبھوں نے شاہی درباروں میں اپنے دام پھیلائے۔ اٹھارویں صدی میں جبکہ مغل سلطنت ٹکڑوں میں بٹ رہی تھی بہت سی ناچنے والیوں نے سیاسی طاقت ورسوخ حاصل کیا۔

زوال مشرق کے ساتھ ساتھ عورتوں کی حیثیت میں بھی انحطاط آتا گیا۔ جب مغرب قوموں نے ہندستانیوں کو مہذب بنانے کا عمل شروع کیا انھیں ہندو عورتیں ستی جیسی ظالمانہ رسم کا شکار اور مسلمان عورتیں اپنے گھروں میں محبوس ملیں۔ اودھ کی بیگم حضرت محل باصلاحیت رانیوں اور فوجی سربراہوں کی آخری نسل سے تعلق رکھتی تھیں۔ انھوں نے 1857 کی بغاوت میں اپنی فوجوں کی کمان کی اور بہادری سے لڑیں۔ شکست کے بعد حضرت محل نے ملکہ وکٹوریہ کے مشہور اعلان کے سامنے سر جھکانے کے بجائے ایک جوابی اعلان کیا جس میں یہ نہایت معقول سوال پوچھا۔ انصاف کا عوام کے مذہب سے کیا تعلق؟

1857 کی شکست نے ہندستان کے مسلمانوں پر عموماً اور شمالی ہند کے مسلمانوں کو خصوصاً زبردست چوٹ پہنچائی۔ طاقت و اقتدار سے مکمل محرومی نے انھیں مبہوت کر دیا تھا ان کے دلوں میں تلخی پیدا کر دی کہ وہ نئے نظام سے نفرت کرنے لگے۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنا کفر قرار پایا۔ اس وقت عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اس وقت مسلمان لڑکیوں کو حکومت اور مشنریوں کے قائم کردہ اسکولوں میں بھیجنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کٹر مولویوں کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا۔ سرسید احمد خاں تک جنھوں نے 1857 میں علی گڑھ میں ایم اے، او کالج قائم کیا لڑکیوں کے اسکول کھولنے کے حامی نہیں تھے۔

تاہم رہنماؤں اور مصلحوں کو تعلیم نسواں کی اہمیت کا احساس تھا خصوصاً چند متمول سمجھ دار لوگوں نے ان لڑکیوں کو پڑھانے کے لیے یورپین یا انگریز گورنسوں کو مامور کیا۔ تقریباً یہی عمل مصر، ایران اور ترکی اور دوسرے ملکوں میں شروع ہوا جہاں کے رہنماؤں نے اپنی عورتوں کو جدید تعلیم دینی شروع کر دی تھی۔ ہندستان اور مشرق وسطیٰ کے اوپری طبقے کی ان نیم مغربی مگر پردہ دار عورتوں نے تعلیم نسواں کے لیے اسکول کھولے جہاں معمر مرد استاد مقرر کیے یا خود پڑھایا چونکہ ان عورتوں کے والد یا شوہر سماج میں باعزت مقام رکھتے تھے۔ لہٰذا تعلیم نسواں کی یہ پیش رو اس قابل تھیں کہ وہ سماجی دباؤ یا ملاؤں یا رجعت پسندوں کی مخالفت برداشت کر سکیں۔

انیسویں صدی کے خاتمے کے بعد ہندستان کی مسلمان عورتیں قومی اور تعلیمی میدان میں زور شور سے داخل ہوئیں۔ پردے نے انھیں ملک کی دوسری عورتوں سے الگ کر رکھا تھا لہٰذا پہلے انھوں نے اپنی آزادی کی لڑائی اپنے گھر کی چہار دیواری کے اندر سے لڑی۔ مردوں کے ساتھ برابری کے مطالبے میں انھیں شرع محمدی کی تائید بھی حاصل تھی۔ انھیں صرف یہ کہنا پڑتا تھا ''ہمیں صرف وہی حقوق دیجیے جو خدا اور رسول نے دیے ہیں'' مگر اس کے لیے بھی انھیں کٹر مردوں کی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

ساحلی ہندستان کا کاروباری فرقہ خوجہ اور بوہرہ وغیرہ ان مسلمانوں میں سے تھے جنھوں نے پہلے پہل اپنی لڑکیوں کو تعلیم کے لیے اسکولوں میں بھیجا۔ جاگیردارانہ شمالی ہندستان

نے سب سے آخیر میں اپنی عورتوں کے لیے جدید تعلیم کی حامی بھری۔

1896 میں شمس العلما مولوی ممتاز علی نے لاہور سے عورتوں کے لیے ہفتہ وار رسالہ ''تہذیب نسواں'' جاری کیا۔ اس انقلاب آفریں رسالہ کی ایڈیٹران کی بیوی محمدی بیگم تھیں۔ پہلے ہی شمارے سے اس رسالے کو بہت سی خواتین کا تعاون حاصل ہو گیا۔ 1908 میں مولانا اور ان کی بیگم نے بچوں کے لیے رسالہ پھول جاری کیا۔ اس رسالہ کی ایڈیٹر راقم الحروف کی والدہ نذر سجاد حیدر تھیں۔ جو ابھی کم سن تھیں اور پردہ کرتی تھیں اور جنھیں گھر پر یورپین گورنسوں نے تعلیم دی تھی۔ مس نذر الباقر کے نام سے وہ اردو کے مشہور روزناموں اور رسالوں میں بڑے شعلہ فشاں مضامین لکھنے لگیں۔ انھوں نے اصلاحی ناول بھی لکھے جنھیں خواتین کی بڑھتی ہوئی تعداد بڑے ذوق وشوق بلکہ احترام کے ساتھ پڑھتی تھی۔ انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کی پھوپھی اکبری بیگم کا اصلاحی ناول 'گودڑ کا لال' اتنا مقبول ہوا کہ شادی کے وقت لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا۔ ''پھول'' کے ناشرین نے بچوں کے لیے بڑا اچھا ادبی ذخیرہ مہیا کر دیا تھا جس میں سے زیادہ تر انگریزی پریوں کی کہانیوں کا ترجمہ یا جزبہ نہیں تھا یہ سب کچھ آج سے 65 سال پہلے ہوا تھا۔

تہذیب نسواں میں لکھنے والیاں ملک کے دور دراز حصوں میں رہنے کے باوجود توہمات، فضول رسموں اور فضول خرچی والی تقریبات کے خلاف مسلسل لکھتی رہیں کیونکہ ان مسائل سے سارے ہندستان کی عورتیں دوچار تھیں۔ اس رسالے کی پڑھنے اور لکھنے والیوں میں چند اردو داں ہندو عورتیں بھی تھیں جن میں نہرو خاندان کی چند خواتین بھی شامل تھیں۔

مسلمان عورتوں کی بے داری قابل ذکر ہے۔ 1907 میں علی گڑھ کے ایک جاگیردار خاندان کی پردہ دار لڑکی زبیدہ خاتون شیروانیہ بڑے پختہ اور پر جوش اشعار لکھ رہی تھی جن سے قومی اور بین الاقوامی مسائل کی حیرت انگیز بصیرت کا مظاہرہ ہوتا تھا بعض خواتین ناول نگاروں کے ناول ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔

ہندستانی مسلمان عورتوں نے ادب اور صحافت میں جلد ہی جگہ بنالی۔ چونکہ اردو ایک

تہذیبی زبان تھی۔ بنگال کے بعض مسلم خاندانوں کے لیے بھی۔ اس لیے عورتوں کے مسائل کے متعلق بحث مباحثے کا ایک وسیلہ بن گئی۔

مسلم عورتوں میں لکھنے کا جو شوق پیدا ہوا اس کا کچھ حد تک تعلق اس بات سے بھی ہے کہ اسلامی تہذیب میں سب سے زیادہ اہمیت مستند تاریخ، مذہبی اور متصوفانہ شاعری اور خالص ادب کو دی جاتی ہے۔ بہت سی عورتیں قرآن پڑھ سکتی تھیں۔ وہ کچھ اور پڑھی ہوں یا نہ پڑھی ہوں اردو شاعری سے آشنا ہوتی تھیں۔

اس زمانے میں سرسید احمد خاں کے دوست اور رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی عورتوں کے ہمدرد اور حامی کی حیثیت سے آگے بڑھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ 1905 میں انھوں نے اپنی پرجوش اور پراثر نظم ''چپ کی داد'' پڑھی جو اب ادب عالیہ میں شامل ہو چکی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ہندستان کی عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی خوبیوں، دردمندی اور صبر و تحمل کی بے حد تعریف کی تھی اور یہ بتایا ہے کہ مردوں کے مظالم اور ناانصافیوں کا جواب ان کی پروقار خاموشی ہے۔ اس نظم نے خاصا جوش و ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ یہ نظم عورتوں کے حقوق کا منشور بن گئی۔

ایک نوجوان وکیل اور سرسید کے سابق طالب علم شیخ عبداللہ نے 1906 میں ہندستان میں مسلمان لڑکیوں کے لیے پہلا انگریزی اسکول کھولا۔ شیخ عبداللہ اور ان کی قابل ذکر بیگم کو زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مخالفت میں علی گڑھ کے بعض قدامت پسند ہندو شرفا بھی شامل تھے۔ شیخ عبداللہ کو جلد ہی سروجنی نائیڈو، بیگم عباس طیب جی، لیڈی عبداللہ سہروردی لیڈی شفیع، نذر سجاد حیدر، زہرہ اور عطیہ فیضی وغیرہ کا تعاون اور بھوپال کی فرماں روا نواب سلطان جہاں بیگم کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ بیگم بھوپال جدید ہندستان کی چند ممتاز ترین خواتین میں سے تھیں۔ بھوپال پر خواتین کی تین نسلوں ماں، دادی اور پردادی نے نہایت خوبی سے حکومت کی ہے۔ سلطان جہاں بیگم ایک باخبر اور ہوش مند حکمراں تھیں اور انھیں ایک ہندستانی یونیورسٹی کی چانسلر مقرر ہونے کا غیر معمولی اعزاز بھی حاصل ہوا۔ وہ 1920 سے 1930 تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی

چانسلر رہیں اور مردوں اور عورتوں کی یکساں طور سے رہنمائی کرتی رہیں۔

1908 میں شیخ عبداللہ نے بھی ایک ماہوار رسالہ 'خاتون' جاری کیا جس میں پردے کے خاتمے کا پرچار کیا جانے لگا۔ اسی سال دہلی سے علامہ راشد الخیری نے اپنے مشہور رسالے ''عصمت'' کا اجرا کیا۔ علامہ نے اپنے ناولوں میں مسلمان عورتوں کے مسائل اور مصائب کی تصویر کشی کی۔ مختلف شہروں سے زنانہ رسالے نکلنے لگے۔ عورتوں کے پاس اب اپنا ایک طاقت ور پریس تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی گریجویٹ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا۔ بہت سی عورتیں لکچرر، اسکول انسپکٹرس اور ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگیں۔ اس میدان میں رہنمائی اوپری طبقے کی عورتوں کے ہاتھوں میں تھی۔

سیاست میں علی برادران کی والدہ اماں بی اور گاندھی جی کے ساتھ کام کرنے والی بی بی امتہ السلام کی بڑی شہرت ہوئی اور ان کا نام گھر گھر لیا جانے لگا۔

سارے ملک میں بہت سے زنانہ اسلامیہ اسکول اور کالج کھلے تعلیمی میدان میں آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس ایک سرگرم اور فعال انجمن بن گئی۔ 1920 سے 1929 کے درمیان بہت سی مسلمان عورتیں پردے سے باہر آ گئیں۔ عورتوں کے عظیم محسن جسٹس کرامت حسین نے لکھنؤ میں مسلم گرلز اسکول (جو اب کالج ہے) اور الہ آباد میں کراس ویٹ کالج قائم کیا۔

1930 تک نوجوان نسل کی چند عورتیں بائیں بازو کی جماعتوں میں شریک ہو گئیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں ''انگارے'' جیسی تہلکہ خیز اردو کتاب کی تصنیف میں شریک ہوئیں۔

1935 کے بعد عصمت چغتائی نے اردو افسانوں اور ناولوں میں جرأت اور بے باکی کی ایک نئی مثال قائم کی۔ ان کی شعلہ بار تحریروں نے ان لکھنے والیوں کو پس پشت ڈال دیا جن کا انداز رومانی تھا اور جو دبے دبے الفاظ میں اپنی بات کہتی تھیں۔ ادب میں ان کی جگہ باغیانہ سماجی حقیقت پسندی نے لے لی۔

1936 میں اردو کی مشہور ادیبہ حجاب امتیاز علی نے ہندستان کی پہلی خاتون ہوا باز

(پائلٹ) بننے کا افتخار حاصل کیا۔

اردو ادب میں عورتوں کو جو ممتاز مقام حاصل تھا وہ اب بھی انھیں حاصل ہے۔ 1880 اور 1889 کے درمیان اردو کی پہلی ناول نگار خاتون کا ناول چھپا تھا اس وقت سے لے کر اب تک مسلم خواتین نے لاتعداد ناول لکھے ہیں۔ خواتین افسانہ نگار بھی بے شمار ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندستان کی مختلف زبانوں میں آج جو مقبول عام ناول چھپ رہے وہ طرز بیان یا مواد کے لحاظ سے ان ناولوں اور افسانوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں جو اب سے ساٹھ ستر سال پہلے اردو کی خواتین ناول نگاروں نے لکھے تھے۔

ان گھریلو پردہ نشین لکھنے والیوں کو ایک بڑی ہی بلیغ، ترقی یافتہ اور غنائی زبان پر بھرپور عبور حاصل تھا۔ یہ نسوانی طرز تحریر جسے عرف عام میں بیگماتی اردو کہا جاتا ہے۔ ادبی تحریروں کے لیے بڑی موزوں ثابت ہوئی۔

ان تمام باتوں کے باوصف سماجی اصلاح اور تعلیمی سرگرمیاں متوسط طبقے تک محدود رہیں۔ عورتیں اپنی اس جدوجہد میں کامیاب رہیں جو انھوں نے پنجاب میں اپنے خلاف ہونے والی ناانصافی کو دور کرنے کے لیے کی تھی۔ پنجاب کے مسلمان، ہندو قانون وراثت پر عامل تھے اور اپنی جائداد میں لڑکیوں کو ایک تہائی ترکہ نہیں دیتے تھے جیسا کہ اسلامی شریعت کا حکم ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کے حق خلع (شوہر سے علاحدگی) کا تحفظ کیا۔

مشرقی سماج میں خاندان کی بڑی اہمیت ہے۔ مشترکہ خاندانوں میں ماں یا سب سے بزرگ خاتون رشتہ دار کو کم از کم گھریلو معاملوں میں اختیار و اقتدار حاصل رہتا ہے۔ چونکہ اسلام میں بھائیوں اور بہنوں کی اولاد کے درمیان شادی کی اجازت ہے۔ اس طرح مسلمان عام طور سے خاندان کے اندر ہی شادی کرتے ہیں اس طرح لڑکی بہو کے علاوہ قریبی عزیز بھی ہوتی ہے۔ اگر میاں بیوی میں نہیں بنتی تو اکثر پورا خاندان لڑکی کی طرف سے دباؤ ڈالتا ہے۔ عموماً ساس سسر کو اس کی ہر حال میں دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے کیونکہ اس سے خون کا بھی رشتہ ہے۔ شوہر کے لیے بیوی کی زندگی میں اس کا دین مہر ادا کرنا ضروری ہے۔ بیوی شوہر کی موت کے بعد اس کے ورثے

میں سے اپنا مہر لے سکتی ہے۔ شادی کے بعد بھی وہ اپنے باپ کی جائداد میں حصہ دار رہتی ہے اور بھائی کا نصف ترکہ پاتی ہے۔

لیکن حقیقی صورت حال اتنی خوش آئند نہیں ہے جتنی نظر آتی ہے۔ مسلم میرج ایکٹ 1939 کے باوجود سماجی رسوم و روایات، انسانی فطرت کا ناگزیر تلون اور خاندانی جھگڑے طلاق کی خواہاں عورت کے لیے سدِ راہ رہے ہیں۔ عام طور پر مسلمان نکاح نامے میں طلاق، خلع کی شرائط شامل نہیں کرتے چنانچہ جب عورتیں اپنے شوہر سے علاحدہ ہونا چاہتی ہیں تو انھیں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مسلم عائلی قانون میں اصلاح کا مسئلہ ایک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس ضمن میں بعض ذیلی قوانین پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ فقہ کے پانچوں مکاتیب فکر کے دائرہ کار میں ان قوانین پر نظر ثانی اور اجتہاد ضروری ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں کھاتے پیتے گھرانوں میں بڑی تیزی سے سماجی تبدیلی اور مغربیت آئی۔ 1940 سے 1947 کے درمیان برقع پوش عورتیں گھروں سے نکل آئیں اور پاکستان کی حمایت یا مخالفت میں نعرے لگانے لگیں۔

تقسیم ملک کی وجہ سے ہندستان کی مسلم عورتوں کو زبردست دھکا لگا۔ روشن خیال متوسط طبقے کی اکثریت پاکستان چلی گئی۔ بہت سے خاندان ہندستان میں خاتمہ زمین داری کی وجہ سے افلاس و نکبت کا شکار ہو گئے۔ ہندستان کی مسلم آبادی کی اکثریت کسانوں، دست کاروں اور نچلے متوسط طبقے پر مشتمل ہے۔ یہ طبقہ مختلف النوع سیاسی معاشی اور سماجی وجوہ سے پست ہمتی اور معاشی بدحالی کا بھی شکار ہوا۔

گزشتہ چند برسوں میں مسلم سماج میں بہت سی نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔

ایک نیا متوسط طبقہ جو زیادہ تر کاروباری لوگوں پر مشتمل ہے۔ آہستہ آہستہ ابھر رہا ہے۔ اب نچلے متوسط طبقے کی لڑکیوں کا اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانا ایک عام بات ہو گئی۔ مہاراشٹر گجرات اور جنوبی ہندستان کے مسلمان جو خوش حال کاروباری طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

جاگیردارانہ ماحول کے شمالی ہندستان کے مقابلے میں زیادہ روشن خیال ہیں۔ اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوا رہے ہیں بمبئی میں مسلمان لڑکیوں کے بہت سے اسکول ہیں اور طالب علموں کی کثرت کی وجہ سے یہ اسکول صبح اور شام دو شفٹ میں چلتے ہیں۔ مدراس میں بشیر احمد سعید صاحب اور ان کی بیگم نے لڑکیوں کا ایک کالج کھولا ہے جو ہندستان کے چند بہترین کالجوں میں سے ایک ہے۔ علی گڑھ کا مسلم گرلز کالج آج ایک بہت بڑا ادارہ بن چکا ہے۔

تقسیم کے بعد مسلمانوں کو ایک عجیب مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ آزادی کے بعد کی دو دہائیوں میں کنوارے نوجوان کی اکثریت تلاش معاش میں پاکستان چلی گئی۔ جن والدین نے اپنی لڑکیوں کو کالج میں تعلیم دلائی تھی انھیں نہ رشتے ملتے تھے اور نہ روزگار۔

حالیہ برسوں میں صورت حال میں بہتری آئی ہے۔ لڑکیوں کی خاصی تعداد مختلف ملازمتیں کرنے لگی ہے۔ آزاد ہندستان کی چند مسلم خواتین نے بحیثیت ماہر تعلیم، قانون داں، اداکار، آرٹسٹ اور موسیقار ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ مسلم خواتین میں اس وقت مشہور آئی سرجن، انڈو انگلین ناول نگار، اسٹیج ڈائرکٹر، ڈاکومنٹری فلم پروڈیوسرز کے علاوہ بہت سی سماجی کارکن اور اسپورٹس کی قومی چمپئن شامل ہیں۔

لیکن ہندستان کے تمام فرقوں میں عورتوں کی بہتری و ترقی اوپری طبقوں تک محدود ہے۔ مسلمانوں میں مغرب پرست متمول گھرانوں کی لڑکیاں ایر ہوسٹس، فیشن ماڈل، بیوٹیشن اور فیشن ایبل دکانوں کی مالک بن چکی ہیں۔ تنخواہ کم ہے اور امیدواروں کا ہجوم زیادہ، غریب طبقے سے ابھی تک قیادت نہیں ابھری ہے۔ وزرا یا اقوام متحدہ کے اجلاس میں شریک ہونے والی یا غیر ممالک کو جانے والے ثقافتی وفود کی سربراہی کرنے والی یا اعلیٰ عہدوں پر فائز خواتین ابھی تک ان خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں جو سماجی و مالی لحاظ سے ممتاز نہیں۔

شہروں اور دیہاتوں میں رہنے والی غریب عورتیں اسی بدحالی کا شکار ہیں جو برسوں سے ان کا مقدر بن چکی ہے۔ مثلاً لکھنؤ میں چکن کا کام کرنے والی عورتیں، دلالوں کے استحصال کا بری طرح سے شکار ہیں۔ کسان عورتوں گھریلو صنعتوں، بلوں اور گندی بستی میں رہنے والی عورتوں کی

زندگیاں پہلے ہی کی طرح تیرہ وتاریک ہیں (اس کے باوصف غریب ترین مسلمان عورت میں بھی قدرے غرور اور خودمختاری کا جذبہ نمایاں ہے جو یقیناً قابل ذکر ہے۔)

دوسرے فرقوں کی مختلف آمدنی والے طبقوں کی عورتیں جتنی جدید یا پس ماندہ ہیں مسلمان عورتیں بھی بجنسہ ویسی ہی ہیں۔ ''مسلم سوال'' پر بات چیت کرتے وقت ہمارے اخبارات و رسائل اس بات کو نظرانداز کر جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے بہت سے معاشی اور سماجی مسائل کو ملک کی عام پس ماندگی اور غربت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے پچھلے کچھ دنوں سے کچھ ایسا تصور پیش کیا جا رہا ہے کہ مسلمان ایک پس ماندہ فرقہ ہیں۔

ہندستانی عورتوں کی اکثریت ہندو اور مسلمان دونوں کی ترقی اور بھلائی اسی وقت ممکن ہوگی جب ملک مجموعی طور سے آگے بڑھے گا اور خوش حال ہوگا۔

(ماہنامہ 'آج کل'، دہلی، خواتین نمبر، اگست 1975)

اسلام دوسروں کی نظروں میں

ایچ. جی. ویلز انگلستان کا ایک بہت مشہور مصنف ہے۔ اس نے اپنی ایک کتاب ''دُنیا کی مختصر تاریخ'' میں جس جگہ اسلام کا ذکر کیا ہے وہاں وہ سخت متعصب ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں پیغمبر اسلامؐ نے عرب کے ریگستان میں پیدا ہو کر دنیا کی تاریخ کو کچھ کا کچھ بنا ڈالا۔

اس وقت یورپ میں اتحاد اور نظم و نسق کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بازنطائن اور ایران کی سلطنتیں کمزور ہو چکی تھیں اور ہندستان کے سبھی حصے بخرے ہو گئے تھے۔ دوسری طرف چین کی سلطنت روز بہ روز پھیلتی جا رہی تھی۔ وسط ایشیا میں ترک سر اٹھا رہے تھے۔ ان ہی ترکوں کی قسمت میں بازنطائن، ایران، مصر اور ہندستان پر حکومت کرنی لکھی تھی۔

عرب ہمیشہ سے چھوٹے چھوٹے خانہ بدوش وحشی قبائل کا گھر رہا ہے۔ ایک ہزار سال سے زیادہ سے وہاں کسی باقاعدہ سلطنت کی بنیاد نہ پڑی تھی۔ اچانک اسی صحرا سے چند بدو اٹھے جنھوں نے نہایت قلیل عرصے میں ساری دنیا پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ انھوں نے اپنی حکومت اور اپنی

زبان اسپین سے لے کر چین تک پھیلا دی۔ دنیا کو ایک نئی تہذیب اور نیا تمدن سکھایا۔ اور ایک ایسے مذہب کی بنیاد ڈالی جو اب تک دنیا کے تمام مذہبوں سے بہتر اور سب سے بڑی طاقتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

عربوں کی فتوحات کی کہانی نسل انسانی کی تاریخ میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ 634 عیسوی میں عرب کے مسلمانوں نے لشکر باز بطان کو جنگ یرموک میں شکست فاش دی اور شہنشاہ ہرقل جیسا طاقت ور بادشاہ چپ چاپ بیٹھا ان نئے فاتحین کو شام، دمشق، پلمیرا، انطیوخ اور یروشلم پر نہایت آسانی سے قبضہ کرتے دیکھتا رہا۔ فتوحات کے ساتھ ہی ساتھ وہاں کی آبادی کے بیش تر حصے نے اسلام بھی قبول کر لیا۔

اس کے بعد مسلمان مشرق کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایرانیوں کے پاس رستم جیسے قابل سپہ سالار اور ہاتھیوں سے آراستہ افواج تھیں۔ لیکن 637 عیسوی میں عربوں سے صرف تین دن تک لڑنے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔

ایران فتح ہو گیا۔ اور اس کی وجہ سے اسلام کی سلطنت مغربی ترکستان اور اس کے آگے چین کی سرحد تک پھیل گئی۔ عرب فاتحین نے مصر بہت آسانی سے حاصل کر لیا۔ پھر ان کی فتوحات کا سیلاب شمالی افریقہ کے کنارے کنارے بڑھتا ہوا آبنائے جبل الطارق میں سے گزر کر اسپین میں داخل ہو گیا۔ اسپین 710 عیسوی میں فتح ہو گیا اور 732 عیسوی میں مسلمان فاتح وسط فرانس تک پہنچ گئے۔

عربوں نے 672 عیسوی سے لے کر 718 عیسوی تک کئی مرتبہ قسطنطنیہ پر بحری حملے بھی کیے لیکن ناکامیاب رہے مگر سلطان محمد ثانی نے اسے بھی فتح کر لیا۔ چونکہ اس وقت عربوں میں سیاسی قابلیت بہت زیادہ تھی اس وجہ سے یہ عظیم الشان سلطنت جو اسپین سے لے کر چین تک پھیلی ہوئی تھی، بہت جلد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زوال پذیر ہو گئی۔

عربوں کی لیاقت و حکمت ایک ہزار سال پہلے کے یونانیوں کی حکمت سے کہیں زیادہ جلد دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک پھیل گئی۔

آٹھویں صدی عیسوی تک ساری سلطنت اسلامی میں ایک تعلیمی نظام قائم ہو چکا تھا۔ اس وقت جبکہ یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی عرب ارسطو اور سقراط کے فلسفوں پر بحثیں کیا کرتے تھے۔ اسپین میں قرطبہ کے علما قاہرہ، بغداد، بخارا اور سمرقند کے عالموں سے خط وکتابت کرتے تھے۔ عربوں نے ریاضی، طب اور سائنس میں جتنی ترقیاں کیں وہ سب جانتے ہیں۔ عربوں نے ہی بدشکل اور مشکل رومن ہندسوں کو تبدیل کر کے وہ ہندسے ایجاد کیے جنھیں ہم آج تک استعمال کرتے ہیں۔ کیمسٹری اور الجبرا کی ایجاد کا سہرا بھی عربوں کے سر ہے اور فلسفہ، ہیئت و نجوم اور لٹریچر میں نہایت عظیم الشان کام انجام دئے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں بغداد علوم وفنون کا زبردست مرکز تھا۔ جہاں یورپ سے طالب علم تحصیل علم کے لیے آتے تھے۔ ڈگری حاصل کرنے کے موقع پر سیاہ گون پہننے کا طریقہ ہم نے عربوں ہی سے سیکھا جو قرطبہ اور بغداد وغیرہ کی عظیم الشان یونیورسٹیوں میں رائج تھا۔ آج ان یونیورسٹیوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔

('بنات' دہلی، مارچ 1945)

آئینہ جہاں برصغیر کی ممتاز اور منفرد فکشن نگار قرۃ العین حیدر کی کلیات ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنا افسانوی سفر 1943 سے شروع کیا۔ جو ان کے انتقال تک جاری رہا۔ اس دوران انھوں نے تقریباً 75 افسانے لکھے جو ان کے پانچ افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں۔ پانچ ناولٹ، نو ناول اور گیارہ رپورتاژ تحریر کیے۔ ان کے علاوہ درجنوں مضامین، خاکے، بچوں کی کہانیاں اور دوسری زبانوں سے تراجم کیے۔ پوری زندگی صحافت میں گزاری (پرنٹ میڈیا اور الکٹرونک میڈیا) درجنوں دستاویزی فلمیں بنائیں۔ مصوری اور موسیقی کا بھی بے حد شوق تھا۔ درجنوں پینگ بنائی لندن اور ہندوستان میں نمائش بھی ہوئی۔ انگریزی میں سیکڑوں صحافتی مضامین لکھے انٹرویوز اور فلم ریویو کیے، اردو ادیبوں کو انگریزی میں ترجمہ کیا۔ خود درجنوں انٹرویو دیے۔ محقق کا فریضہ بھی انجام دیا اور کئی کتابیں مدون کیں۔ یہ کلیات ایک عہد ساز ادیبہ کے کارناموں کو مجتمع کرنے کی ایک محققانہ کوشش ہے۔ حکومت ہند نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''پدم شری'' اور ''پدم بھوشن'' جیسے انعامات سے سرفراز کیا تھا۔ اس جلد میں ان کے رپورتاژ ہیں۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر جمیل اختر اردو کے معروف ادیب، محقق، مصنف اور نقاد ہیں۔ فکشن کی تحقیق ان کا خصوصی میدان ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کلیات اسی تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس سے قبل بلونت سنگھ کی کلیات آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں عصمت چغتائی، بلونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر کا نیا افسانوی مجموعہ بھی ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اشاریہ آج کل کی تدوین کے ذریعے اردو میں اشاریہ سازی کو ایک تحریک کی شکل دی۔ زندگی نامہ قرۃ العین حیدر اور گوپی چند نارنگ ان کے علمی کمالات کے نئے زاویے کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں کی داستان بہت طویل ہے۔ اب تک مختلف موضوعات پر ان کی چالیس سے زائد کتابیں قومی اور بین الاقوامی اداروں سے شائع ہو چکی ہیں جن میں چار کتابیں آکسفورڈ پریس سے بھی شائع ہوئی ہیں اور انھیں کئی ادبی ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔

ISBN: 978-93-5160-123-4
9 789351 601234
HCPUL
New Delhi
₹ 182/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025